WWW.PAKISTANIPOINT.COM
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرہ منتظمہ — آذر ریاض

مدیرہ اعزازی — امت الصبور

فلم، ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

قانونی مشیر — نور الدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

پہلی شعاع — رضیہ جمیل — 8
حمد — برگ یوسفی — 9
نعت — زہیر کنجاہی — 9
نبیؐ کی باتیں — ادارہ — 10

انٹرویو

منی طارق سے ملاقات — شاہین رشید — 26
دستک — شاہین رشید — 22
جب تجھ سے ناتا — ر-م — 18
جب تجھ سے ناتا — س-ع — 15

ناول

شہر تمنا — نعیمہ ناز — 36

مکمل ناول

شاماں پے گئیاں — منشا محسن — 172
کاسۂ دل — مدیحہ سعید — 128

اپریل/مئی 2020
جلد 34 شمارہ 7/8
قیمت 70 روپے

ناولٹ

وہ نازنین — فرح بخاری — 86
سانولا سویرا — ثمرہ بخاری — 204
بہار آنے کو ہے — حمیرا شفیع — 169

افسانے

یار دل دار — افشین نعیم — 58
راضی بہ رضا — ریحانہ چوہدری — 113
مونگ پھلی — سنیعہ عبیر — 99
مرحوم — مدیحہ عارف — 226
مقید وقت — گل ناز — 232
کالا پتھر — شازیہ الطاف ہاشمی — 234

نظمیں غزلیں

غزل — اعتبار ساجد — 235
غزل — جاوید شاہین — 235
نظم — سیاس گل — 234
غزل — اقبال اشعر — 234

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

03172266944

MEMBER APNS CPNE
ممبر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
ممبر کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

زر سالانہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک
پاکستان (سالانہ) .... 700/- روپے
ایشیا افریقہ، یورپ .... 7000/- روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا .... 8000/- روپے
subscriptions@khawateendigest.com

مستقل سلسلے

خط آپ کے — رضیہ جمیل — 32
مسکراہٹیں — ادارہ — 236
بالوں سے خوشبو آئے — شگفتہ جاہ — 238
کھلتا کسی پہ — خالدہ جیلانی — 241
تاریخ کے جھروکے — امت الصبور — 254
آئینہ خانے میں — واصفہ سہیل — 249
موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 252
خوبصورت نسخے — ادارہ — 257

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ نگار

پہلی شعاع

دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد اپریل، مئی اور جون کا مشترکہ شمارہ پیش خدمت ہے۔

سڑکیں ویران۔ گلیاں سنسان۔ بازار اور دکانیں بند۔ گھروں میں خوف و ہراس کا ڈیرہ۔ یہ ایک ملک یا ایک شہر کا احوال نہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں یہی عالم ہے۔ وہ پُررونق شہر جو ساری ساری رات جاگتے تھے۔ اب دن میں بھی خاموش اور سُونے پڑے ہیں۔

ایک ننھا سا وائرس جسے انسانی آنکھ دیکھنے سے بھی قاصر ہے۔ اس کے خوف سے پوری دُنیا پہ لرزہ طاری ہے۔ سائنس دان اس وبا کا توڑ تلاش کرنے کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں لیکن ترقی یافتہ ممالک کی اربوں کھربوں سے چلتی، جدید ساز و سامان سے لیس تجربہ گاہیں، جدید ترین ٹیکنالوجی، دُنیا کے بہترین دماغ تاحال اس نادیدہ وائرس کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔

قدرت نے اپنی عظمت اور کبریائی کو منوالیا ہے۔ وہ زمینی خدا جو اپنی ترقی پر نازاں خود کو سُپرپاور سمجھتے تھے۔ دُنیا کو اپنے نظام کے تحت چلانے کے دعوے دار تھے۔ جان چکے ہیں کہ آسمان کے ساتھ ساتھ زمین پر بھی اسی کی بادشاہی ہے۔

وہ جنھوں نے اربوں، کھربوں ڈالر خرچ کرکے مہلک اور تباہ کُن ہتھیار ایجاد کیے اور انہیں کمزور اقوام پر آزمایا۔ آج ایک نادیدہ وائرس سے ہراساں اور پریشان ہیں۔

کورونا کی آفت جو پوری دُنیا پر مسلط ہے، اس نے ایک عالمی وبا کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ایک بہت بڑا انسانی المیہ جنم لے چکا ہے۔ جس کے اثرات اور نقصانات کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ آنے والے وقت کا سوچ کر ہی ہول آتے ہیں۔

یہ اللہ کے حضور جھک جانے کا وقت ہے۔ اس کے بندوں سے رحم، ہمدردی اور ان سے بھائی چارہ کا سلوک کرنے کا وقت ہے۔ توبہ استغفار کرنے کا وقت ہے۔ حکومت کی طرف مت دیکھیں۔ ان کی اپنی دُنیا ہے۔ اپنی ترجیحات ہیں۔ آپ اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھیں۔ ہم میں سے جو لوگ استطاعت رکھتے ہیں، اگر وہ ایک گھر کے ماہانہ راشن کی ذمہ داری لے لیں تو یہ کٹھن وقت سہولت اور آسانی کے ساتھ گزر جائے گا۔

جب سے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس ادارے سے شائع ہونے والے پرچوں کا کوئی بھی شمارہ التوا میں نہیں پڑا۔

اپریل کا شمارہ تکمیل کے مراحل میں تھا کہ پورے ملک میں لاک ڈاؤن کا اعلان کردیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم شمارہ آپ تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ اب اپریل، مئی اور جون کا مشترکہ شمارہ پیش کررہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اہلِ زمین پر رحم فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- منشاء محسن کا مکمل ناول۔ شاماں پے گئیاں،
- مدیحہ سعید کا مکمل ناول۔ کاسۂ دل،
- فرح بخاری اور ثمرہ بخاری کے ناولٹ،
- سیمعہ عمیر، حمیرا شفیع، افشین نعیم، ریحانہ چوہدری، مدیحہ عارف، شازیہ الطاف ہاشمی اور گل ناز کے افسانے،
- باصلاحیت اداکارہ منیٰ طارق سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کے تجربات،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- خط آپ کے، باتوں سے خوشبو آئے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد

باری تعالیٰ

اک لفظ کُن ہی باعثِ نقش و نگار ہے
یارب تُو کائنات کا پروردگار ہے

یہ عرش و فرش، لوح و قلم، مہر و ماہ و انجم
ہر شے پہ یا کریم تجھے اختیار ہے

معبود ہے تُو ہی یہاں، مسجود ہے تُو ہی
ہر چیز تیرے سامنے سجدہ گزار ہے

میرے مقدّر کی تحریر کو بدل
بندہ نوازیوں کا تیری انتظار ہے

تُو ہے غفور، تُو ہی رحیم و کریم ہے
بندوں کے حال پر کرم بے شمار ہے

اے برگ اس کی کون ثنا کرسکے یہاں
یہ حمد شاعری کا میری شاہکار ہے

برگ یوسفی

نعت

رسولِ مقبولﷺ

ارفع ہیں، بے مثال ہیں، یکتا حضورؐ ہیں
پُرنور و مستنیر و اجالا حضورؐ ہیں

دونوں جہاں کی رونقیں بس آپؐ ہی سے ہیں
کچھ شک نہیں ہے عزت والے حضورؐ ہیں

جو تھے فقیر ان کو تونگر بنا دیا
ہر ایک بے نوا کا وسیلہ حضورؐ ہیں

میرا تو وردِ صبح و مسا ان کا نام ہے
گویا صداقتوں کا خزینہ حضورؐ ہیں

صحرا نے ہیں آپؐ کی آمد پر مرغزار
ہر گُل میں، ہر شجر میں ہویدا حضورؐ ہیں

میں ہوں زہیرؔ ان کے غلاموں کا بھی غلام
سب ہیں غلام اور شہنشاہ حضورؐ ہیں

زہیر کنجاہی

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

یتیموں، لڑکیوں اور خستہ حال لوگوں کے ساتھ تواضع

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور اپنے بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔"

(سورہ حجر 88)

اور فرمایا۔ "اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں، وہ اس کی رضا چاہتے ہیں اور دنیوی زندگی کی رونق کی تلاش میں تیری آنکھیں ان سے تجاوز نہ کریں۔"

(سورہ کہف 28)

اور فرمایا۔

"چنانچہ جو یتیم ہو، اسے مت دبا اور جو مانگتا ہو، اسے مت جھڑک۔"

(سورہ الضحیٰ 10.9)

اور فرمایا۔

"کیا دیکھا تو نے اس شخص کو جو جزا (کے دن) کو جھٹلاتا ہے، تو یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔"

(الماعون 1-3)

نیک لوگوں کی صحبت

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھ افراد تھے۔ مشرکین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

"انہیں اپنے سے دور کر دیں، یہ ہم پر جری نہ ہو جائیں۔"

(حضرت سعد فرماتے ہیں) میں، ابن مسعود، قبیلہ ہذیل کا ایک آدمی، بلال اور دو آدمی تھے جن کے نام مجھے معلوم نہیں۔

(مشرکین کے مطالبے پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جی میں جو اللہ نے چاہا، آیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جی میں کچھ سوچا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت (سورہ انعام ۔52) نازل فرما دی۔

ترجمہ: "(اے پیغمبر) تو ان لوگوں کو اپنے سے دور مت کر جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے صبح و شام اسے پکارتے ہیں۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:۔

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں صرف ان لوگوں کی قدر و قیمت ہے جو ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہوں۔ چاہے اہل دنیا کی نظروں میں وہ اپنی غربت و ناداری کی وجہ سے حقیر اور کمتر ہوں اور جو ایمان و عمل سے محروم ہوں، چاہے دنیوی اعتبار سے وہ کتنے ہی بلند مرتبہ ہوں، اللہ کے ہاں پرکاہ کے برابر بھی ان کی وقعت نہیں۔

2۔ اس میں اہل ایمان کو بھی تنبیہ ہے کہ ان کے ہاں بھی عزت و شرف کا معیار دین ہی ہونا چاہیے نہ کہ حسب و نسب اور مال و جاہ۔

نیک لوگوں کی ناراضی

حضرت ابو ہبیرہ عائذ بن عمرو مزنی (یہ اہل بیعت رضوان میں سے ہیں) فرماتے ہیں۔

"حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ، حضرت سلیمان، صہیب اور بلال رضی اللہ عنہ کے پاس چند افراد کی موجودگی میں آئے تو انہوں نے (ابو سفیان کو دیکھ کر) کہا۔

"اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمن (یعنی ابو سفیان) سے اپنا حق وصول نہیں کیا۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "تم یہ بات قریش کے بزرگ اور ان کے سردار کے متعلق کہہ رہے ہو؟"

پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بتلائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابو بکر! شاید تو نے انہیں ناراض کر دیا (یاد رکھ) تو نے اپنے رب کو ناراض کر دیا۔"

(یہ سن کر فوراً) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور ان سے کہا۔

"بھائیو! کیا میں نے تمہیں ناراض کر دیا ہے۔" (یعنی میری بات تمہیں ناگوار گزری ہے؟)

انہوں نے کہا۔ "نہیں...... اے ہمارے بھائی! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:۔

1۔ اس میں مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ آپس میں پیار و محبت کے ساتھ رہو اور ایک دوسرے کے بارے میں اپنے دلوں کو صاف رکھو اور اگر کوئی بات، غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ایسی نکل جائے۔ جس سے دوسرے مسلمانوں کے دلوں کو ٹھیس پہنچے یا ان کے جذبات مجروح ہوں تو فوراً اس کا ازالہ کرنے کی سعی کرو۔

2۔ دنیاوی حیثیت سے کمزور لوگ اگر متقی اور پرہیز گار ہوں تو اہل ایمان کو ان کی کسی صورت بھی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

یتیم کی کفالت

حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا، جنت میں اس طرح ہوں گے۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت اور درمیان والی انگلی کے درمیان کشادگی فرمائی۔ (یعنی قریب ہوں گے، لیکن درجات میں فرق و تفاوت ہوگا)۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:۔

1۔ جنت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب بہت بڑا اعزاز ہے جو یتیم کے ساتھ حسن و سلوک کرنے والے کو ملے گا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گھر کو سب سے بہترین گھر قرار دیا۔ جس میں یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہو اور اسے بدترین گھر کہا جاتا ہے۔ جس میں اس کے برعکس یتیم کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ روا رکھا جاتا ہے۔

مسکین کون ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسکین وہ نہیں ہے جسے کھجور اور دو کھجوریں، لقمہ اور دو لقمے لوٹا دیں بلکہ مسکین تو وہ ہے جو (غربت کے باوجود) سوال سے بچتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

اور صحیحین (بخاری و مسلم) کی ایک اور روایت میں الفاظ اس طرح ہیں۔

"مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں (کے گھروں) کے چکر لگائے اور لقمہ، دو لقمے اور کھجور، دو کھجوریں اسے واپس لوٹا دیں۔ لیکن مسکین تو وہ ہے جو اتنی دولت بھی نہ پائے جو اسے (لوگوں سے) بے نیاز کر دے۔ اس کی (غربت کی) بابت احساس بھی نہ کیا جائے کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ (وہ خود دست سوال دراز کیے) کھڑا ہو کہ لوگوں سے مانگے۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ اس میں ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے اور وہ یہ کہ گھر گھر جا کر مانگنے والے زیادہ ضرورت مند (مسکین) نہیں ہوتے، کیونکہ

وہ تو قطرہ قطرہ حاصل کر کے دریا جمع کر لیتے ہیں۔ اصل ضرورت مند تو وہ ہوتے ہیں جو تونگر بھی نہیں ہوتے، ان کا لباس اور ہیئت ہی ایسی ہوتی ہے جو ان کی غربت کی چغلی کھاتی ہو اور نہ ان کی خودداری اور غیرت ہی انہیں سوال کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیشہ ور گداگروں کے مقابلے میں ایسے سفید پوش لوگوں کی امداد کی جائے کہ یہ اصل مسکین ہیں نہ کہ وہ جنہوں نے مسکینی کا روپ دھار رکھا ہو۔

خیر گیری کرنے والا

"بیواؤں اور مسکین کی خبر گیری کرنے والا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔"

(راوی حدیث کہتے ہیں) میرا گمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا۔

"وہ اس عبادت کرنے والے کی طرح ہے جو سست نہیں ہوتا اور اس روزے دار کی طرح ہے جو ناغہ نہیں کرتا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:۔

1۔ بیوہ اور مسکین کا نام بطور تمثیل کے ہے۔ مراد معاشرے کے ضرورت مند، نادار اور معذور افراد ہیں۔ ان کی کفالت، خبر گیری اور ان کے لیے دوڑ دھوپ کو اجر میں جہاد فی سبیل اللہ کے برابر قرار دے کر اسلام نے اس کام کی اہمیت کو کتنا واضح کر دیا ہے۔ مسلمان اس کو نہ سمجھیں تو اور بات ہے، ورنہ اسلام نے معاشرے کے بے سہارا افراد کی مدد اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے۔

2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت صرف نماز پڑھ لینا یا روزہ رکھ لینا ہی نہیں ہے، بلکہ ہر عمل صالح عبادت ہے اور ضعفاء و مساکین کی خبر گیری بھی عبادت ہے۔

بدترین کھانا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بدترین کھانا ولیمہ کا وہ کھانا ہے جس میں جو (ضرورت مند) آنا چاہے اسے تو روک دیا جائے اور جو انکار کرے اسے بلایا جائے اور جس نے دعوت قبول نہیں کی، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔" (مسلم)

اور صحیحین کی ایک اور روایت جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اس طرح روایت کیا گیا ہے۔

"بدترین کھانا ولیمہ کا وہ کھانا ہے جس میں مال داروں کو بلایا جائے اور فقرا کو چھوڑ دیا جائے۔"

فوائد و مسائل

1۔ طبقہ امراء نے ولیمہ کی دعوت کو جس طرح پُرتکلف اور اپنی دولت و امارات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا ہے، اس کے متعدد دینی، اخلاقی اور معاشرتی نقصانات ہیں۔ دینی نقطہ نظر سے یہ اسراف و تبذیر ہے جو شیطانی عمل ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والے شیطان کے بھائی۔ یہ اتنا بڑا نقصان اور سخت وعید ہے کہ ہمارے طبقہ امراء میں اگر ایمان ہو تو وہ اس اسراف سے باز آ جائے۔ جس کا دائرہ روز بروز بڑھتا اور پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ اس کا اخلاقی نقصان یہ ہے کہ انسان اس میں اپنے ہی ہم مرتبہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے اور انہیں با اصرار اس میں شریک کرتا ہے جبکہ معاشرے کے غریب اور مسکین قسم کے لوگوں کی اس میں شرکت کو وہ سخت ناگواری اور آداب کے خلاف تصور کرتا ہے۔ حالانکہ دعوت کے مستحق، اپنی ضرورت مندی کی وجہ سے مساکین ہی ہوتے ہیں نہ کہ اہل ثروت اور مکارم اخلاق کا تقاضا بھی ہے کہ ضرورت مندوں کو اولیت و فوقیت دی جائے نہ کہ ان کو جو سرے سے ضرورت مند ہی نہیں ہیں۔

2۔ اس کا معاشرتی نقصان یہ ہے کہ اس قسم کے مظاہروں سے معاشرے کے کمزور طبقات میں احساس محرومی پیدا ہوتا ہے حالانکہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ محروم طبقات کی دلجوئی، دلداری کا اہتمام اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے نہ کہ ان کے اندر احساس محرومی پیدا کر کے انہیں اذیت اور اضطراب سے دوچار کیا جائے۔

3۔ اگر مسلمان ولیموں اور دیگر تقریبات میں

انواع و اقسام کے پرتکلف کھانوں کے بجائے ایک دو قسم کے سادہ کھانوں کا اہتمام اور اس میں قرابت داروں اور دوست احباب کے ساتھ غرباء و مساکین کو بھی شریک کریں تو مذکورہ تینوں خرابیوں سے بچ سکتے ہیں، جس کے معاشرے پر بہترین اثرات پڑ سکتے ہیں اور آخرت کی باز پُرس سے بھی وہ بچ سکتے ہیں ورنہ "خسر الدنیا والاخرۃ" ہی کے وہ مصداق ہوں گے۔

4۔ حدیث میں دعوت ولیمہ کے قبول کرنے کی جو تاکید کی گئی ہیں اس سے مراد وہی دعوتیں اور ولیمہ ہیں جن میں اسلامی تعلیمات کا احترام اور سادگی وغیرہ کا اہتمام کیا جائے۔ مذکورہ قسم کے ولیمہ جو مذکورہ خرابیوں کے مظہر ہوں، ان میں شرکت نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ ان کا بائیکاٹ ضروری ہے تاکہ ان برائیوں میں شرکت کے جرم سے وہ بچ جائے۔

بیٹیوں کی پرورش

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے دو بچیوں کی پرورش و تربیت کی حتیٰ کہ وہ بالغ ہو گئیں۔ قیامت والے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ میں اور وہ ان دو انگلیوں کی طرح (قریب قریب) ہوں گے۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیاں ملا کر دکھایا کہ اس طرح ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوں گے۔ (مسلم)

فوائد و مسائل:۔

1۔ زمانہ جاہلیت میں لڑکیوں کی پیدائش پر جس ناگواری کا اظہار اور عورت کی قدر و منزلت کا انکار کیا جاتا تھا۔ شریعت اسلامیہ نے ان کی عزت و توقیر کی بحالی کے لیے جو ہدایات دیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچیوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کو حصول جنت کا ذریعہ قرار دیا تاکہ لوگ بیٹوں کی ولادت اور ان کی پرورش پر ہی خوشی محسوس نہ کریں بلکہ لڑکیوں کی ولادت اور ان کی تربیت پر بھی مسرت بہ کنار ہوں۔ اس لحاظ سے اسلام ہی وہ پہلا دین ہے جس نے عورت کے حقوق کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ اس کی عزت و تکریم کا بھی خوب خوب اہتمام کیا۔ مثلاً اسے مردوں کے اختلاط

حافظ قرآن کی فضیلت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احد کے شہداء میں سے دو (دو) آدمیوں کو ایک (ایک) قبر میں اکٹھا دفن فرماتے، اس وقت پوچھتے:

"ان میں سے کسے قرآن زیادہ یاد تھا؟" جب آپ کو ان میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کر کے بتلایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں پہلے اسے اتارتے (یا اسے جانب قبلہ آگے رکھتے۔)

(بخاری)

قارئین اور ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں

موجودہ حالات کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر پرچے کا حصول دشوار ہو گیا ہے اگر آپ کو پرچے کے حصول میں کوئی دشواری ہو یا پرچا نہ مل رہا ہو تو درج ذیل نمبر پر رابطہ کریں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل جائے گا۔

ایجنٹ حضرات بھی پرچے کے سلسلے میں کوئی بھی معلومات یا آرڈر دینے کے لیے اس واٹس ایپ نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

0317-2266944

سے منع اور پردے کا پابند کیا، اسے بیرونی سرگرمیوں اور معاشی جھمیلوں سے فارغ رکھا تاکہ کوئی بد باطن اسے بری نظر سے دیکھے نہ اسے اپنی ہوس ناکی کا نشانہ بنا کر اس کی ردائے تقدس و عصمت کو تار تار کر سکے، جیسے مغرب کی بے پردہ اور مردوں کے دوش بدوش کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

2۔ برا ہو اس کج فکری اور ذہنی عدم بلوغت کا کہ مغرب کی یہ آزادیٔ نسواں جس نے عورت کو ذلیل اور بے آبرو کر دیا ہے۔ بہت سے لوگوں کو بہت اچھی لگتی ہے اور وہ مسلمان عورت کو بھی اسی حیا باختگی کی راہ پر ڈال رہے ہیں اور اسلامی تعلیمات جس میں عورت کے تقدس واحترام کا تحفظ ہے۔ وہ انہیں غلامی کا طوق نظر آتی ہیں جنہیں وہ اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔

تین کھجوریں

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

”میرے پاس ایک مسکین عورت اپنی دو بیٹیاں اٹھائے ہوئے آئی۔ میں نے اسے کھانے کے لیے تین کھجوریں دیں۔ پس اس نے دو کھجوریں تو اپنی دو بیٹیوں کو دے دیں اور ایک کھجور اس نے کھانے کے لیے اپنے منہ کی طرف بڑھائی تو وہ بھی اس سے اس کی بیٹی نے کھانے کے لیے مانگ لی۔ چنانچہ اس نے وہ کھجور بھی جسے وہ خود کھانا چاہتی تھی، دو حصے کر کے اپنی دونوں بیٹیوں میں تقسیم کر دی۔ مجھے اس کی یہ بات بڑی اچھی لگی۔

میں نے اس واقعے کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی وجہ سے اس کے لیے جنت واجب فرما دی ہے۔ (یا یہ فرمایا) کہ اس کی وجہ سے اسے جہنم کی آگ سے آزاد کر دیا ہے۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل:۔

اس میں لڑکیوں کی پرورش کی فضیلت کے علاوہ اس بات کا بھی بیان ہے کہ اگر عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے صدقہ و خیرات کی عمومی اجازت حاصل ہو تو وہ صدقہ کر سکتی ہے۔ اس کے ثواب میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔ عورت کو صدقہ کرنے کی وجہ سے اور مرد کو اس پر رضامند ہونے کی وجہ سے اجر ملے گا۔

کمزور

حضرت ابو شریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے اللہ! میں لوگوں کو دو ضعیفوں کے حق سے بہت ڈراتا ہوں (کہ ان میں کوتاہی مت کرنا) ایک یتیم اور دوسری عورت۔“ (یہ حدیث حسن ہے، اسے امام نسائی نے عمدہ سند کی ساتھ روایت کیا ہے)۔

فوائد و مسائل:۔

1۔ انسانی معاشروں میں کمزور طبقات کے ساتھ عام طور پر ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ بالخصوص عورتیں اور یتیم اس کا خاص نشانہ بنتے ہیں۔ ان کو جائیدادوں میں ان کے شرعی حق سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ ان کی جائیدادوں کو ہتھیا لیا جاتا ہے اور ان سے ہر طرح کی بدسلوکی روا رکھی جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے سے روکا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمان اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے اور مسلمان معاشروں میں بھی یہ مذکورہ طبقات ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسلام بدنام ہو رہا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس بارے میں اسلام کی تعلیمات تو واضح ہیں۔ مسلمانوں کا طرز عمل، اسلام سے مختلف چیز ہے۔ اس کا الزام ان کے مذہب پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔

2۔ کاش! مسلمان اس بات کو سمجھیں کہ ان کے غلط طرز عمل کی وجہ سے اسلام کی بدنامی ہو رہی ہے اور یوں وہ دو گونہ جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ایک حق تلفی اور ظلم اور دوسرا دنیا کی نظروں میں اسلام کی تذلیل اور اس کا استخفاف۔ گویا وہ اسلام کی تبلیغ کے بجائے اسلام کی طرف لوگوں کے آنے میں رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔

☆☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

س۔ ع

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے، میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ اس بار میں نے سوچا ہے کہ میں بھی اس میں شرکت کروں اور اپنا ناتا آپ سب سے شیئر کروں۔

ضروری تو نہیں کہہ دیں زباں سے داستاں اپنی
زباں اک اور بھی ہوتی ہے اظہار تمنا کی

لیکن میرا خیال ہے کہ کبھی کبھی کہہ دینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے تجربات سے کوئی دوسرا کچھ سیکھ لے۔

☆ ”شادی کب ہوئی؟“

”جناب میری شادی 21 مارچ 2009ء کو ہوئی۔ موسم بہار کا تھا۔ پھولوں سے مہکتا ہوا۔“

☆ ”شادی سے پہلے مشاغل اور دلچسپیاں؟“

”کتابیں پڑھنا، ڈائجسٹ پڑھنا، کپڑوں کی ڈیزائننگ کرنا۔ دوستوں سے گپ شپ، کوکنگ کرنے کا شوق نہیں تھا لیکن مجبوری کے تحت کرنی پڑتی تھی۔“

☆ ”رشتے میں مرضی شامل تھی یا نہیں؟“

”میری مرضی بھی شامل تھی اور گھر والوں کی بھی۔ ہماری منگنی بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔“

☆ ”ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا؟“

”تصور یہ تھا کہ پڑھا لکھا ہو۔ خوش اخلاق۔ محبت کرنے والا ہو اور زندگی میں ہر موقع پر ساتھ نباہنے والا ہو اور الحمدللہ ان میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔“

☆ ”منگنی کتنا عرصہ رہی؟ شادی سے پہلے ملے یا فون پر بات ہوئی؟“

”رشتہ بچپن میں ہی طے ہو گیا تھا لیکن باقاعدہ منگنی 2007ء میں ہوئی۔“

☆ ”شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟“

”شادی پھوپھو کے گھر ہونی ہے، لہٰذا خیالات تو بہت اچھے تھے لیکن سسرال تو سسرال ہوتا ہے۔ خالہ جی کا گھر نہیں۔

صاف شفاف تھی پانی کی طرح نیتِ دل
دیکھنے والوں نے دیکھا اسے گدلا کر کے

جو سوچا ہوتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو سوچا نہیں ہوتا، وہ بار بار ہوتا ہے۔ میں نے تو یہی سیکھا ہے کہ سسرال والوں کی ہاں میں ہاں ملا کر ہی رہنا چاہیے۔ اختلاف رائے کی صورت میں اختلافات پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔

طبیعت آدمی کی اس کی اصل ذات ہوتی ہے
اسی سے جیت ہوتی ہے، اسی سے مات ہوتی ہے

☆ ”شادی کے لیے تعلیم کی قربانی دینی پڑی؟“

”نہیں جی۔ تعلیم کی قربانی نہیں دینی پڑی۔“

☆ ”شادی کی رسموں میں لین دین پر جھگڑا ہوا؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ خیر و عافیت سے ہو گیا تھا۔ ان کے گھر کی پہلی شادی تھی۔ انہوں نے کہا کہ بارات زیادہ آئے گی، ہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شادی کو سب نے بہت انجوائے کیا۔ میری نند کی بھی میرے ساتھ ہی شادی ہوئی تھی۔ میرے ولیمے والے دن اس کی بارات آئی تھی، البتہ اس کی شادی غیروں میں ہوئی تھی۔“

☆ ”شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟“

”میرے دیوروں اور ان کے دوستوں نے ہمارے کمرے کو ڈیکوریٹ کیا تھا۔ کمرے کو دیکھ کر ان کا موڈ آف ہو گیا۔ پھر شوہر صاحب غائب۔ ساس، نندیں غائب۔ میں اکیلی کمرے میں بیٹھی رہی پھر مجھے باہر بٹھایا اور کمرہ دوبارہ سیٹ کیا، تب جا کر شوہر صاحب کا موڈ صحیح ہوا۔“

☆ ”شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟“

”امی کے گھر بڑی بہنوں کی شادی ہو گئی تھی۔ پورے گھر کو میں نے سنبھالا ہوا تھا۔ کھانے پینے سے لے کر شاپنگ، مہمان نوازی غرض ہر چیز میرے کنٹرول میں تھی جبکہ شادی کے بعد ہر کام سسرال والوں کی مرضی کے مطابق کرنا پڑتا تھا۔“

☆ ”ماحول میں فرق تھا؟“

”صاف ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

سسرال اور میکے کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ امی کے گھر میں ہم سب بڑوں سے ادب اور تمیز سے بات کرتے تھے۔ بڑے بہن بھائیوں کو باجی اور بھائی کہہ کر بلاتے تھے لیکن ان کے گھر میں ایسا کوئی رواج نہیں تھا۔ ہر کسی کو نام لے کر پکارا جاتا تھا۔ میری نند جس کی ہمارے ساتھ ہی شادی ہوئی تھی، وہ جب بھی اپنے سسرال جانے لگتی، سارے گھر والے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیتے، پھر بڑے چھوٹے وہ سر بکھیرتے کہ پورا محلّہ اکٹھا ہو جاتا تھا۔

پھوپھو کی سہیلیاں اپنے آنسو صاف کرتی جاتیں اور پھوپھو سے کہتی تھیں کہ صبر کرو...... صبر کرو اور میں ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھتی رہتی۔ اس دن ہمارے گھر کچھ بھی نہیں پکتا تھا۔ کوئی صوفے سے لیٹ کر رو رہا ہوتا تو کوئی بیڈ پر لیٹ کر تو کوئی زمین پر بیٹھ کر اور کوئی دیوار سے ٹیک لگا کر۔ جب سسر صاحب رات کو آتے تو کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود بخود سمجھ جاتے کہ آج ان کی بیٹی واپس چلی گئی ہے لہٰذا وہ بھی افسردہ سے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ہماری شادی کے تقریباً دو سال بعد یہ سین ختم ہوا تھا۔“

☆ ”سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی اور کن پر تعریف؟“

”کھانا بنانے پر بہت تنقید ہوتی تھی لیکن اب سب میرے کھانے کی تعریف کرتے ہیں۔ میں صبح آٹھ بجے اٹھتی تھی، اس بات پر تنقید ہوتی تھی لیکن اب میری دو دیورانیاں بارہ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتیں۔ پھوپھو صبح کا ناشتا اب خود بناتی ہیں۔ آٹا گوندھتی ہیں۔ صفائیاں کرتی ہیں۔ کپڑے دھوتی ہیں۔ لیکن دونوں بہوؤں کو کچھ نہیں کہتیں۔ دیور کہتے تھے کہ بھابھی کھانا صحیح نہیں بناتیں جبکہ اب بڑی کہتی ہے کہ چھوٹی کھانا بنائے اور چھوٹی کہتی ہے کہ بڑی بنائے۔“

☆ ”شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟“

”شادی کے تقریباً ایک ماہ بعد کام کرنا شروع کیا تھا۔ میری نندیں صفائی اور برتن وغیرہ خود دھو لیتی تھیں۔ کھانا میں ہی بناتی تھی۔“

☆ ”کھانے پکانے میں فرق؟“

”امی کے گھر میں سبزیاں، گوشت بناتے تھے جبکہ سسرال میں صرف دالیں چنے اور گوشت ہی بنتا تھا۔ سبزی مہینے میں ایک آدھ بار ہی بنتی تھی، دالیں کھا کھا کے میرے پیٹ میں اکثر ہی درد رہنے لگا۔“

☆ ”سسرال میں وہ مقام ملا جو آپ کا حق تھا؟“

”شروع شروع میں تو نہیں ملا۔ لیکن اب میری کوشش اور ہمت رنگ لے آئی ہے۔ دوسرے دیوروں کی شادی کے بعد انہیں خود بخود ہی فرق معلوم ہو گیا ہے۔ اب میں دوسری منزل پر شفٹ ہو گئی ہوں اور میری ساس میرے بغیر کچھ بھی نہیں کرتیں۔ گھر میں جتنے بھی مہمان آ جائیں، کھانا بنانے کے لیے مجھے ہی بلاتی ہیں اور میں نے کبھی ان کی کسی بات سے انکار نہیں کیا۔“

اے شام کے مسافر منزل قریب تر ہے
تھوڑی سی ہمت اور، ٹل جائیں گی بلائیں

☆ ”بچوں کی پیدائش؟“

”میری بیٹی عائشہ شادی کے چار سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ سب نے بہت خوشیاں منائیں۔ اب میری ماشاء اللہ سے چار بیٹیاں ہیں۔ عائشہ، فجر، مومنہ اور سیرت فاطمہ۔ اللہ انہیں نیک بنائے اور تمام بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔ میرے شوہر اور سسرال والے میری بیٹیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میری بیٹیوں کو بھائی کا بہت شوق ہے، اللہ سے دعا ہے کہ میری بیٹیوں کو بھائی عطا کرے۔“

☆ ”جوائنٹ فیملی کو ترجیح دیتی ہیں یا علیحدہ؟“

”اگر جھگڑے جنم لینے لگیں تو الگ رہنا ہی بہتر ہے۔ نندیں بھی آئیں تو زیادہ اوپر ہی رہتی ہیں۔ چھوٹی نند اور چھوٹا دیور بھی زیادہ تر اوپر ہی رہتے ہیں۔ پھوپھو بھی دن کا زیادہ حصہ میرے ساتھ ہی گزارتی ہیں۔ اللہ میرے گھر کو بری نظر سے بچائے، آمین۔

شادی شدہ عورتوں سے کہوں گی اگر آپ کا شوہر اچھا ہے تو سسرال والے کچھ بھی کہیں۔ آپ اپنے گھر کو خراب مت کریں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ماں باپ کو نہ بتائیں۔ پیپر دینے کے بعد رزلٹ کا انتظار کیا جاتا ہے۔ سسرال بھی امتحان گاہ ہے، پیپر دیں اور رزلٹ کا انتظار کریں۔ رزلٹ میں اتنے نمبر آئیں گے جتنی آپ نے محنت کی ہوگی۔“

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ر۔م

س: ''شادی کب ہوئی؟''

ج) ''شادی مارچ 1995ء میں ہوئی۔''

س: ''شادی سے پہلے مصروفیات اور دلچسپیاں؟''

ج) ''میں نے ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ شادی سے چھ ماہ پہلے ایک ہائر سیکنڈری اسکول میں جاب شروع کی تھی اور اسکول اور کالج دونوں میں کلاسز لیتی تھی۔ گھر آ کر ایک دو بچے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے۔ گھر کے کچھ کام اور رسالے...... بس یہی مصروفیات اور دلچسپیاں تھیں۔''

س: ''اس رشتے میں آپ کی مرضی کس حد تک شامل تھی؟''

ج) ''اس رشتہ میں میری مرضی اس حد تک شامل تھی کہ جب یہ پروپوزل آیا تو میری مطلوبہ پانچ صفات میں سے تین ان میں موجود تھیں۔ میں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اس رشتے کے لیے ہاں کردی تھی جبکہ اس سے پہلے میں کئی رشتوں کے لیے ناں کر چکی تھی۔ یہاں رشتہ طے ہونا تھا، ہوگیا۔''

س: ''شادی سے پہلے جیون ساتھی کے بارے میں کیا تصور تھا؟''

ج) ''ذہن میں تصور تو کوئی نہیں تھا لیکن میں اپنے جیون ساتھی سے احساس تحفظ اور محبت چاہتی تھی۔''

س: ''منگنی کتنا عرصہ رہی؟''

ج) ''منگنی دو ماہ بائیس دن رہی۔ شادی سے پہلے بات یا ملاقات نہیں ہوئی۔''

س: ''شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟''

ج) ''سسرال والوں کے بارے میں یہی سنا تھا کہ بہت اچھا ماحول ہے۔ اڑتی اڑتی خبریں لڑائی جھگڑے والے ماحول کی بھی تھیں۔ چونکہ ان کے بہت سارے بہن بھائی ہیں۔ اس لیے میرا یہی خیال تھا کہ میں ان میں گھل مل جاؤں گی اور بہت اچھا وقت گزرے گا کیونکہ میں رونق پسند ہوں۔ کم افراد کا گھرانہ بھی میری خواہش نہ تھا۔

س: شادی کے لیے تعلیم کی قربانی دینا پڑی؟''

ج) ''شادی سے دو سال پہلے میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ شادی کے بعد بھی جاب کرنے کی خواہش تھی، جسے انتہائی بے مروتی سے رد کردیا گیا۔''

س: ''شادی میں رسموں کے دوران کوئی جھگڑا وغیرہ؟''

ج) ''شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ شادی کی تقریبات کے دوران تو ''بے چارے'' سسرال والوں نے بہت برداشت سے کام لیا، البتہ بعد میں ہر ہر بات مجھے بتائی اور جتائی گئی۔''

س: شادی کے بعد شوہر نے پہلی بار دیکھا تو کیا کہا؟

ج) ''شوہر صاحب نے پہلی بار دیکھ کر سلام کیا تھا اور میرے جواب نہ دینے پر کہا تھا کہ آپ نے مجھے جواب نہیں دیا۔''

س: شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج) ''شادی سے پہلے چونکہ جاب کرتی تھی۔

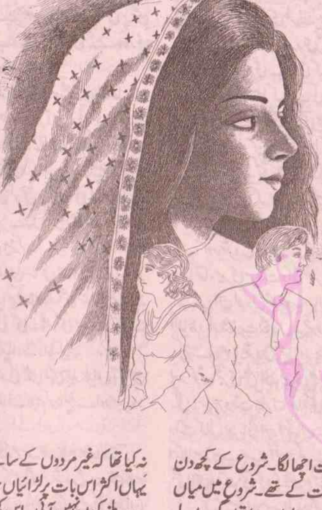

اس لیے گھر پر رہنا بہت اچھا لگا۔ شروع کے کچھ دن بہت بے فکری اور فراغت کے تھے۔ شروع میں میاں صاحب کا انداز بھی بہت والہانہ ہوتا تھا۔ گھر والے بھی بہت محبت سے پیش آتے تھے لیکن وہ میکے والی بے فکری یک لخت ختم ہوگئی تھی۔ میں بہت سادہ مزاج کی ہوں لیکن شادی کے بعد یہ سادگی وجہ تنقید بننے لگی۔ اس لیے مزاج کے خلاف بہت سے کام کرنے پڑے۔ شرمیلے مزاج کی وجہ سے ہر آئے گئے سے ملنا بہت مشکل لگتا تھا۔

مہمان خواتین تو ایک طرف، مجھ سے مطالبہ ہوتا تھا کہ مرد حضرات سے بھی میں بے تکلفی سے حال احوال پوچھوں۔ شادی سے پہلے گھر میں پردہ دار ماحول تھا۔ رشتہ داروں سے تو پردہ نہیں کرتے تھے لیکن کبھی تصور تک نہ کیا تھا کہ غیر مردوں کے سامنے بے پردہ آنا ہے اور یہاں اکثر اس بات پر لڑائیاں ہوئیں کہ فلاں فیملی فرینڈ سے ملنے کیوں نہیں آئی۔ اس کی بیوی خود اندر اس سے ملنے آئی۔ یہ کیوں نہیں بیٹھک میں آ گئی؟ پردے کی وجہ سے بہت سے اختلاف ہوئے۔

میں کم بولتی تھی۔ اس پر بھی ایک مرتبہ ساس صاحبہ نے خوب باتیں سنائیں۔ میاں کو شکایت لگائی کہ اس نے کہا ہے کہ میں کم بولتی ہوں (کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا) دوپٹہ سر پر رکھتی تھی اور طعنے سنتی تھی۔ فلاں فنکشن میں ماسی بن کر بیٹھی رہی۔ لوگ کہتے ہیں یہ تمہاری بہو ہے؟ (گویا سر ڈھانپنا صرف بزرگ خواتین کا حق ہے۔ نئی نویلی ننگے سر ہی رہے)۔ شروع دنوں میں صبح نندیں میک اپ کر کے سجا بنا کر بٹھا دیتی

تھیں (نمائش کے لیے)۔ ظہر کے وقت وضو کرنے سے میک اپ اتر جاتا تھا پھر میں عشاء کے بعد تیار ہوتی تھی (کہ ظہر سے عشاء تک اللہ تعالیٰ جلدی جلدی اپنے بندے کو اپنے حضور بلاتا ہے) اس پر بھی تنقید، فلاں کی بہو جب دیکھو تیار ہوتی ہے۔ ہماری بہو تو تیار ہی نہیں ہوتی۔

صبح نماز فجر کے بعد تلاوت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس لیے میں مغرب کے بعد تلاوت قرآن کرتی تھی۔ کمرے کے دونوں دروازے کھلے ہوتے تھے۔ ہر فرد دیکھ سکتا تھا کہ میں اندر کیا کر رہی ہوں۔ شادی کے تقریباً ایک مہینے کے بعد میں اپنے میاں سے یہ سن کر حق دِق رہ گئی کہ گھر والے بتا رہے ہیں کہ تم شام کو کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ کیا کرتی رہتی ہو تم اکیلے کمرے میں بیٹھ کر۔

حالانکہ میں سارا دن ساس نندوں کے ساتھ رہتی تھی۔ دوپہر کو اگر آرام کرنا ہو تو بھی نندوں کو اپنے کمرے میں ساتھ سلاتی تھی۔ پھر بھی میرے خلاف میاں صاحب کو بھڑکایا گیا اور لڑوایا گیا۔

شادی کے بعد زندگی میں یہی تبدیلیاں آئیں کہ مزاج، تربیت کے خلاف کام کرنا پڑے اور صبر اور برداشت کو ساتھی بنالیا۔

س: شادی کے کتنے عرصہ بعد کام سنبھالا؟''

ج) ''میں کام چور نہیں تھی۔ شروع سے ہی کام کرنے کی عادت تھی۔ کہیں دو دن کے لیے بھی مہمان گئی تو فارغ نہیں بیٹھی۔ اس لیے شادی کے اگلے دن ہی میں نے کام کرنے کی خواہش ظاہر کی اور تھوڑا بہت ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ میری ساس نندیں مجھے کام نہیں کرنے دیتی تھیں جسے میں اس وقت ان کی محبت سمجھتی تھی لیکن وہ دہری چال چلتی رہیں۔

ادھر مجھے کام نہیں کرنے دیا اور ادھر ہر طرف پھیلا دیا کہ بہو تو کوئی کام نہیں کرتی۔ سارا دن رسالے پڑھتی ہے۔ میاں صاحب کے بھی اسی طرح کان بھرے گئے، سارا دن فارغ رہتی ہے۔ میری بیٹیاں ہی کریں جو کریں۔ مت پوچھیں کہ دل کا کیا عالم تھا جب میں نے وہ سب کچھ سنا۔ دہرے بلکہ تہرے عذاب میں جان تھی۔ ایک تو زبردستی فارغ بٹھایا ہوا تھا۔ فارغ بیٹھ بیٹھ کر میں پاگل ہو جاتی تھی۔ دوسری طرف میاں صاحب طعنے دیتے تھے کہ پتا نہیں کب بیوی کے ہاتھ کا پکا نصیب ہوگا۔ تیسری طرف ساس کی باتیں...... فلاں کہہ رہی تھی، دھمکاں کہہ رہی تھی۔ تمہاری بہو کوئی کام نہیں کرتی اور میری بے وقوفی کہ کبھی زبان کھول کر میاں صاحب کو نہیں بتایا کہ آپ کی ماں بہنیں کتنی سختی سے میرے ہاتھ سے کام چھین لیتی ہیں۔

بس من من کر کے کہنا کہ امی وغیرہ کام نہیں کرنے دیتیں۔ کہتی ہیں ساری عمر کام کرنا ہی ہے۔ بس یہ سوچ تھی کہ میرے کہنے پر کہیں ماں بیٹے کی آپس میں لڑائی نہ ہو جائے۔

اور شروع دنوں میں ساس نندوں نے جو لاڈ جتایا تھا، میری مروّت والی فطرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ میں ان لوگوں کا رویہ میاں صاحب کو بتاؤں یا الفاظ دیگر شکایت لگاؤں۔ خیر دو ماہ بعد صفائی ستھرائی، کپڑے دھونا شروع کیا اور جب شادی کے چار ماہ بعد خوش خبری ملی اور میری طبیعت گری گری رہنے لگی۔ سر ہر وقت چکراتا تھا، متلی سے برا حال تھا۔ اس وقت کمال مہربانی اور احسان سے شام کے کھانے کا انتظام (جب سب افراد گھر پہ ہوتے تھے اور ہنڈیا بھی اسی وقت بنتی تھی) مجھے سونپا گیا۔''

س: میکے اور سسرال کے کھانوں میں کوئی فرق محسوس ہوا؟

ج) ''سسرال اور میکے کے کھانے پکانے کے طریقے بے حد مختلف تھے اور میں تو کھانا پکانے کی ماہر بھی نہیں تھی۔ اس لیے اس وجہ سے بھی بے حد اختلافات ہوئے۔ بہت باتیں سننا پڑیں۔ بہت تلخ باتیں، نم آنکھوں کے ساتھ برداشت کرنا پڑیں۔ میں کھانا پکانے کا ان کا طریقہ پوچھتی تو نندوں کو بڑا برا لگتا اور اکثر مجھے غلط بتاتیں اور مجھے باتیں سننا پڑتیں اور میں مروت کی ماری بے وقوف کبھی بتا نہ سکی کہ مجھے تو نند نے ایسے بتایا تھا۔ کبھی اپنے طریقے سے بنایا تو جو طوفان آتا تھا، آپ صرف اس کا تصور کر سکتے ہیں۔

س: سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کن باتوں پر تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟

ج) ''تعریفی جملہ تو نصیب نہ ہوا۔ تنقید تو ہر وقت سہنا پڑی کیونکہ میں اعلا تعلیم یافتہ تھی اور یہاں پانچ میٹرک پاس افراد کے علاوہ سب کم پڑھے لکھے تھے۔ اس لیے ان سب کا احساس کمتری اس طرح تسکین پاتا تھا کہ وہ سب ہر وقت مجھ پر تنقید کرتے تھے۔

س: کیا سسرال میں آپ کو آپ کا جائز حق ملا؟

ج) نہیں...... سسرال والوں نے کبھی مجھے میرا جائز حق نہیں دیا۔ ان لوگوں نے اپنے تمام گھریلو اور خاندانی معاملات ہمیشہ مجھ سے چھپا کر رکھے۔ رائے لینا اور اس کو اہمیت دینا تو بہت ناممکن بات لگتی ہے۔

س: سسرال سے جو توقعات تھیں پوری ہوئیں؟

ج) ''سسرال والوں سے بہت سی اچھی توقعات تھیں۔ اپنی محبت، خدمت، خلوص کے بھروسے پر توقع تھی کہ یہ سب مجھے بھی اچھا سمجھیں گے لیکن کوئی اچھی توقع پوری نہ ہو سکی۔''

س: بچوں کی پیدائش پہ سسرال والوں کا رویہ؟

ج) شوہر نے تو بچوں کی پیدائش کے مراحل میں تعاون کیا۔ بہت خیال رکھتے تھے (میرا؟ جی میرا ہی...... لیکن اپنے بچوں کے لیے)۔ لیکن سسرال والوں کی طرف سے اچھا رویہ نہیں ملا۔ پہلی مرتبہ جب خوش خبری ملی تو ظاہر ہے میں ناتجربہ کار تھی۔ میں اپنی بدلتی کیفیات سے اندازہ نہ لگا سکی کہ مسئلہ کیا ہے۔

میں نے ساس صاحبہ سے ذکر کیا کہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے، پیٹ میں بہت درد ہے۔ انہوں نے کچھ کہا نہ پوچھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانے لگیں۔ اسی وقت ایک عزیزہ آگئیں۔ انہوں نے ڈاکٹر کے پاس جانے کا سنا تو مجھ سے کچھ سوالات کیے اور بتا دیا کہ خوش خبری ہے۔ اس بات کو ساس نے ایشو بنا دیا کہ مجھے نہیں بتا سکتی تھی، اس کو بتا دیا اور گھر کی پہلی خوشی کو اس بے بنیاد بات کی وجہ سے مسئلہ بنا دیا۔

اس روز میں اکیلے کمرے میں اپنوں کو یاد کر کے بہت روئی تھی۔ اس کے بعد پورا عرصہ مجھے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بچہ ہوا تو اس پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ میری حیثیت محض اس کی آیا کی تھی اور نوکرانی کی طرح ہی مجھ سے باز پرس کی جاتی تھی اور اس میں میاں صاحب بھی شامل ہوتے تھے۔ کیا بتاؤں بلکہ کیا کیا بتاؤں بہت لمبی داستان ہے۔ رہنے دیں۔''

س: جوائنٹ فیملی سسٹم کے بارے میں آپ کی رائے؟

ج) مجھے شروع سے جوائنٹ فیملی سسٹم پسند تھا۔ لیکن اس سسٹم میں دو دہائیاں گزارنے کے بعد میری رائے بدل چکی ہے۔ میرے خیال میں شروع میں کچھ عرصہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنا چاہیے اور پھر علیحدہ ہو جانا چاہیے۔''

س: سسرال کے ماحول میں کوئی تبدیلی لا سکیں؟

ج) ''گھر کے ماحول کو بہتر بنانے کی میں نے بہت کوششیں کیں۔ کئی بار اپنی انا کو کچلا۔ سراسر بے قصور ہوتے ہوئے بھی ساس نندوں سے (میاں صاحب کے دباؤ پر) معافیاں مانگیں تاکہ گھر کا ماحول خوش گوار رہے لیکن بے سود۔ جو بھی کوشش کی، منہ کی کھانا پڑی۔ سسرال والے اور شیر ہو گئے۔

میرے خیال میں سسرال والے کبھی اپنے نہیں بن سکتے۔ یہ رشتے ہی ایسے ہیں کہ کبھی دوسروں کا احساس نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہر بچی کا نصیب اچھا ہو۔

تمام بہنوں سے ایک سوال ہے کہ اگر میں شادی نہ کرتی اور جاب کر کے خود مختار زندگی گزارتی تو وہ بہتر تھا کہ یہ زندگی بہتر ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ کئی بچوں کی ماں ہوں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میاں صاحب ہیں۔ جسمانی طور پر آسودہ ہوں لیکن روح پر اتنے زخم ہیں کہ شمار مشکل ہے۔ اپنی تعلیم کی وجہ سے اتنے طعنے سنے ہیں کہ حد نہیں۔ ویسے میں بہت خوش ہوں لیکن جب دل پہ چوٹ پڑتی ہے تو خیال آتا ہے شادی نہ کرتی۔

☆☆

دستک دستک دستک

شاہین رشید

اسماء عباس

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"ڈراموں میں آپ کے بڑے مختلف کردار ہوتے ہیں۔ بہت باکمال فنکارہ ہیں آپ؟"

"بہت شکریہ......"

"ایک بات پوچھوں...... بہت پیاری ہیں، بہت ورسٹائل ہیں آپ۔ اتنے مختلف روپ دھارنے والی فنکارہ عام زندگی میں کیسی ہیں؟"

ہنستے ہوئے۔ "اصلی زندگی میں میرا وہی روپ ہے جو میرے خدا نے دیا ہے۔ ایک محبت کرنے والی انسان، محبت کرنے والی بیوی اور ایک محبت کرنے والی ماں ہوں......اور میرا یہی روپ ہے۔"

"آپ کی زندگی میں تبدیلی کیسے آئی کہ آپ اسٹار بن گئیں؟"

"یہ تبدیلی اس وقت آئی جب میں نے پی ٹی وی پہ اپنی پہلی پرفارمنس دی تھی۔ جس میں میں نے ملکہ پکھراج صاحبہ کی پیروڈی کی تھی۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ راتوں رات میں مشہور ہو جاؤں گی۔ شاید اللہ نے مجھے اس فیلڈ میں لانا تھا۔ بس اس کے بعد تو لائن لگ گئی کہ ہمارے لیے کام کریں۔ ہمارے لیے کریں۔"

"مگر پھر بھی آپ نے کم کام کیا...... کیوں؟ اور واپسی بھی آپ کی کافی گیپ کے بعد ہوئی...... وجہ؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس گھر اور گھر کی ذمہ داریاں تھیں۔ گھر کو چھوڑ کر باہر کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتی تھی۔ کیونکہ میری پہلی ترجیح میرا گھر تھا اور گھر ہے اور گیپ کی وجہ تو میں نے بتا دی، اب یہ بتاؤں کہ گیپ ضرور دیا مگر پھر جب اینٹری دی تو مستقل دی اور اب تک کام کر رہی ہوں۔"

"سنا ہے کہ عباس صاحب آپ کے میاں بھی منع کرتے تھے؟"

"اسی وجہ سے کہ کہیں میں گھر کی ذمہ داریوں سے غافل نہ ہو جاؤں اور جب میں نے دیکھا کہ بچے بڑے ہو گئے ہیں تو میں نے عباس صاحب سے کہا کہ اب اجازت دے دیں ......اور انہوں نے اجازت دے دی...... مت پوچھیں کہ اس وقت میری کیا کیفیت تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح سب کو بتاؤں کہ میں فیلڈ میں واپس آ رہی ہوں۔"

"پھر سب نے ویلکم کیا؟"

"ایسا ویسا...... بہت زیادہ ویلکم کیا گیا اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے کام سے کبھی کسی کو مایوسی نہیں ہوئی۔"

"آپ بہت پیاری پرفارمر ہیں۔ اور آپ کی بیٹی "زارا نور" بھی عہد وفا میں بہت اچھا کام کیا ہے...... آپ کو اپنی بیٹی کام کرتی ہوئی کیسی لگتی ہے۔ اس کے لیے تو کوئی رکاوٹ نہیں آئی؟"

"بہت شکریہ تعریف کا...... میری بیٹی میں واقعی بہت صلاحیتیں ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ جہاں اس کی شادی ہوئی ہے وہاں بھی سب ہی اس فیلڈ سے وابستہ ہیں...... اور میری بیٹی بہت آگے تک جائے گی اور جو کام میں نہ کر سکی، وہ کرے گی۔"

"گیپ کے بعد جب آپ شوبز میں آئیں تو پہلا پروجیکٹ آپ کو کون سا ملا تھا؟"

"پہلا ہی کہوں گی کہ ایک بڑا پروجیکٹ تھا۔ "ننھی" کے نام سے اور حسیب احسن نے میرا انتخاب کیا اور اسے لکھا بھی ان کی بیگم نے تھا اور بہت شکر ہے کہ "ننھی" سیریل بہت کامیاب رہا۔ میرا کردار بھی بہت اچھا اور پاور فل تھا...... لوگوں نے بہت داد دی...... بہت سراہا میرے کام کو......"

"اس میں آپ نے لوگوں کی نفرت مول لی۔ پھر کوئی ایسا کردار کیا جس میں محبت ملی؟"

"بہت کردار کیے، جس میں لوگوں کو مجھ سے نفرت بھی ہوئی اور محبت بھی...... کچھ عرصہ قبل ایک ڈرامہ "رانجھا رانجھا کر دی" ہوا تھا۔ اس میں میں نے جو کردار کیا تھا، اس میں مجھے بہت محبت ملی اور میں نے ایک ایبنارمل بیٹے کی ماں کا رول جو کیا تھا۔ مجھے محبت تو ملنی ہی تھی۔"

"اپنے کردار کے لیے کتنا سوچتی ہیں؟"

"بہت زیادہ سوچتی ہوں۔ اس کردار میں اپنے آپ کو محو کر کے دیکھتی ہوں۔ کردار کی حقیقت اور پس منظر تک کو محسوس کرتی ہوں۔ تب پھر اس رول کو کرتی ہوں۔"

"کوئی بھی کردار کرنے کے بعد سوچتی ہیں کہ اس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا تھا...... میں بھی نہیں؟"

"نہیں۔ ایسا نہیں سوچا...... اگر مطمئن ہو گئی تو مزید کردار کیسے کروں گی۔ اس لیے ہر کردار کو اپنا پہلا کردار سمجھ کر کرتی ہوں اور ہر کردار کو بہت دل سے اور بہت محنت سے کرتی ہوں۔"

"پھر بھی اپنا کیا ہوا کوئی کردار جو آپ کو خود بھی بہت پسند آیا ہو؟"

"ننھی" "رانجھا رانجھا کر دی"۔ "دیوارِ شب" کا کردار بھی بہت اچھا رہا...... اور بھی بہت سے ہیں......اور میں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہوں۔"

"آنے والے کرداروں میں کوئی ایسا کردار جو آپ چاہتی ہیں کہ جلدی آن ایئر ہو اور لوگ دیکھیں؟"

"میرا ایک سیریل جلد ہی آن ایئر ہونے والا ہے "زیبائش" کے نام سے۔ اس میں میرا کردار میرے دل کے بہت قریب ہے اور اسے کرنے میں مجھے بہت مزہ آیا۔ کچھ ہی کردار ایسے ہوتے ہیں جنہیں کرنے میں بہت لطف آتا ہے۔"

"آپ سب بہنوں میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ یہ خداداد ہے یا اپنے آپ کو منوانے کے لیے بہت محنت کی آپ نے؟"

"جو ہم بہنوں میں ٹیلنٹ ہے، وہ تو واقعی خداداد ہے لیکن اپنے آپ کو منوانے کے لیے ظاہر ہے محنت تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ اب یہ سوچ لیں کہ صلاحیت ہے تو خود بخود سارے کام ہو جائیں گے

تو ایسا نہیں ہوتا۔ محنت تو ہر کام میں کرنی پڑتی ہے۔"

"اپنی تعریف سننا کیسا لگتا ہے؟"

"پتا نہیں کیوں...... مجھے شرم سی آجاتی ہے اور میں صحیح سے خوشی کا اظہار نہیں کر پاتی۔ دل چاہتا ہے کہ کہیں ادھر ادھر نکل جاؤں۔"

"لوگ کہتے ہوں گے کہ دیکھو کتنی مغرور ہے؟"

"ہو سکتا ہے مگر میرا بی ہیویر ایسا نہیں ہوتا۔ لوگ مجھ سے مل کر خوش ہی ہوتے ہیں اور مجھے خود بھی اچھا لگتا ہے دوسروں سے ملنا اور بات کرنا۔"

"بیٹی کی پرفارمنس سے مطمئن ہیں یا زارا تنقید کی زد میں رہتی ہے؟"

"میری بیٹی زارا کے لیے تو میں کہوں گی کہ وہ تو پیدائشی اداکارہ ہے۔ میں بچپن سے ہی اس میں ٹیلنٹ دیکھ رہی ہوں...... اور جب اسے اداکاری کا موقع ملا تو اس نے ثابت بھی کیا کہ اس میں بہت ٹیلنٹ ہے ماشاءاللہ اور جہاں تک تنقید کی بات ہے تو اگر میں اسے کچھ سمجھاتی ہوں تو اس کے فائدے کے لیے ہی سمجھاتی ہوں۔"

"آئے دن آپ ملک سے باہر رہتی ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کو ٹریولنگ کا بہت شوق ہے؟ کہاں کہاں جا چکی ہیں؟"

"جی...... ہاں...... مجھے ٹریولنگ کا بہت شوق ہے اور کافی ممالک جا چکی ہوں۔ ان میں دبئی، تھائی لینڈ، امریکہ، ملائیشیا، بنکاک اور کینیڈا وغیرہ۔"

"اور شاپنگ کا مزہ کہاں آتا ہے؟"

"ہر جگہ...... شاپنگ میری کمزوری ہے...... باہر کی شاپنگ کا مزہ یہ ہے کہ چیزیں بہت مناسب داموں میں بہت اچھی کوالٹی میں مل جاتی ہیں۔ دھوکا نہیں ہوتا اس لیے شاپنگ کے لیے بار بار باہر جانے کا دل چاہتا ہے۔"

☆☆☆

شگفتہ بھٹی

شگفتہ بھٹی ہم سب کی بہت پیاری دوست، بہت اچھی لکھاری ہیں۔ ان کے ڈرامہ سیریل "آتش" پیوند، بے دردی، قید، وہ میرا دل تھا" نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی...... شگفتہ کچھ عرصے سے علیل ہیں۔ ہم سب کی دعائیں شگفتہ کے ساتھ ہیں۔ سب قارئین سے گزارش ہے کہ ہماری پیاری دوست اور اپنی پیاری رائٹر کے لیے دعا کریں۔

"کیا حال ہیں شگفتہ...... طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

"اللہ کا شکر ہے...... کافی بہتر ہے۔ ٹریٹمنٹ بھی چل رہی ہے۔ اب جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔"

"آپ عمرہ کی سعادت حاصل کر کے آئی ہیں۔ بہت مبارک ہو اور جو دعائیں آپ نے مانگی ہیں، وہ رائیگاں نہیں جائیں گی؟"

"ان شاءاللہ...... کیونکہ اب جو رپورٹس آئی ہیں میری اس میں کافی امپروومنٹ ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ میں اللہ کے گھر سے خالی ہاتھ نہیں آئی ہوں۔"

"آپ کے فین آپ کی تحریروں کو پرنٹ میڈیا میں بھی پڑھنا چاہتے ہیں اور ٹی وی پہ آپ کے ڈرامے بھی دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"ان شاءاللہ میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی اور اپنے ٹھیک ہونے کی خوش خبری بہت جلد آپ سب کو سناؤں گی۔ کہ میرے سارے ٹیسٹ کلیئر ہو گئے ہیں اور جہاں تک ڈراموں کی بات ہے اور پرنٹ میڈیا میں لکھنے کی بات ہے تو بہت کچھ لکھا ہوا رکھا ہے۔ بس جیسے ہی طبیعت میں مزید بہتری آئے گی، میں اپنے کام میں لگ جاؤں گی اور آپ سب پھر سے میرے نئے ڈرامے اسکرین پہ دیکھیں گے۔ بس اللہ اپنا کرم کردے۔"

"بچے تو بہت خدمت خاطر کر رہے ہوں گے؟"

"بچے تو کر ہی رہے ہیں۔ باقی میرے چاہنے والے بھی دعائیں کر رہے ہیں اور میرے اپنے میری بات بھی کر رہے ہیں۔ سب لوگ میرے لیے بہت پریشان رہتے ہیں۔"

"اچانک آپ کی زندگی میں بہت بڑا چینج آیا۔ کبھی خوف آیا...... کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نا امیدی ہوئی؟"

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ میری پوری زندگی میں ایک دم سے بہت بڑا چینج آیا۔ خوف تو آتا ہی ہے مگر اللہ کی طرف سے کبھی مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ اگر اس کی طرف سے مایوس ہو گئی تو پھر زندگی میں رہ ہی کیا جائے گا۔ پھر دعائیں کس سے مانگوں گی۔ تو مجھے بالکل بھی نا امیدی نہیں ہے۔"

"کچھ کام بھی ادھورے رہ گئے ہوں گے؟"

"ہاں...... کیوں نہیں...... کافی کام ادھورے رہ گئے۔ حالانکہ میرا پلان یہ تھا کہ نئے سال میں تین پروجیکٹس ضرور آن ایئر ہو جائیں گے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ لیکن اب ان شاءاللہ بہت جلد اپنا کام دوبارہ شروع کروں گی آپ سب کی دعاؤں سے۔"

"اللہ آپ کو صحت دے...... ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

☆☆

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
Emale: id@khawateendigest.com

اپریل/مئی 2020 کے شمارے کی ایک جھلک

امتحان لیتی ہے محبت
محبت لین دین نہیں ہوتی صرف دین دین ہوتی ہے۔ محبت میں جو قربانی دیتا ہے وہی عظیم کہلاتا ہے۔ دو دوستوں کی روداد جنہوں نے محبت کا امتحان دیا دونوں نے ہی ایثار کیا۔
ایم الیاس کی کہانی کا دوسرا اور آخری حصہ،

کہتے ہیں جس کو عشق
ترقی پسند مصنفین کی کہانیوں میں عشق و محبت کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔ اس کہانی میں خواجہ احمد عباس نے کوشش کر کے رومان سے بھرپور کردار تخلیق کیے ہیں
عمران کے قارئین کے لیے کلاسیکل ادب سے انتخاب،

بار آور
انسان کو جانی بوجھی، سوچی سمجھی لذت گناہ عمل کے لیے مجبور کرتی ہے
یہ سوچے بغیر کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے۔
جاوید راہی کے سوچ کی پرواز،

ادھورا مجسمہ
چوری ہو جانے والا کانسی کا بنا ہوا مہاتما بدھ کا ادھورا مجسمہ اپنے اندر قیمتی راز چھپائے ہوئے تھا۔
کرنل زاہد اور کیپٹن جاوید خطرناک مہم پر قانون والا کے قلم کا جادو،

شعلوں کی گونج
اکثر خواتین اور لڑکیاں جنات کے عاشق ہونے کے ڈرامہ کرتی ہیں۔
صدف راشد کی معاشرے کے ناسوروں کی نشان دہی کرتی ایک پرسوچ تحریر،

اس کے علاوہ دیس بدیس کی رومینس، سسپنس اور تجسس سے بھرپور مشہور ومعروف مصنفین کی طبع زاد وترجمہ کہانیاں
اپریل 2020 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

ڈراما سیریل رسوائی کی وردا

منیٰ طارق سے ملاقات

شاہین رشید

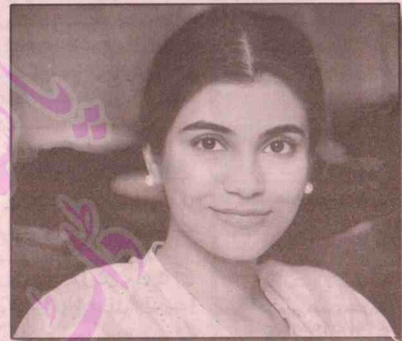

منیٰ طارق کا ایک تعارف تو یہ ہے کہ یہ روبینہ اشرف (معروف آرٹسٹ) کی دختر نیک اختر ہیں مگر ان کا اپنا تعارف یہ ہے کہ یہ ایک بہت ہی اچھی فنکارہ ہیں۔ چند سال قبل جب یہ سولہ سال کی تھیں تو انہوں نے ڈرامہ سیریل ''ونی'' کیا تھا جو کہ بہت مقبول ہوا تھا اور منیٰ کے کام کو بہت زیادہ سراہا گیا تھا...... اسے روبینہ اشرف صاحبہ نے ڈائریکٹ کیا تھا...... منیٰ طارق اس سیریل کے بعد اسکرین سے غائب ہو گئیں کیونکہ یہ اعلا تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلی گئی تھیں۔

آج کل مقبول سیریل ''رسوائی'' میں آپ منیٰ کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ ان کا دوسرا سیریل ہے اور اسے بھی روبینہ اشرف نے ڈائریکٹ کیا ہے جبکہ اسے نائلہ انصاری نے تحریر کیا ہے۔ اس سیریل میں بھی منیٰ کی اداکاری بہترین ہے۔

منیٰ سے ہماری بات ہوئی۔ وہ بہت دھیمے اور سلجھے لہجے میں بات کرتی ہیں۔

''کیا حال ہیں منیٰ؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''اب طبیعت کیسی ہے؟''

''جی الحمدللہ...... اب میں ٹھیک ہوں۔''

''رسوائی سیریل میں تمہاری پرفارمنس بہترین ہے اور کہانی کے اعتبار سے ''رسوائی'' بہت پسند کیا جا رہا ہے؟''

''بہت شکریہ کہ آپ پسند کر رہی ہیں اور مجھے بھی اس کا فیڈ بیک بہت اچھا مل رہا ہے۔''

''تمہارا لہجہ بہت دھیما اور میٹھا ہے۔ عام زندگی میں بھی ایسی ہی ہو یا اکھڑ، لڑاکا...... وغیرہ وغیرہ؟''

''اصل زندگی میں کہیں دھیمی ہوں۔ کہیں نہیں ہوں اور یہ منحصر ہے اس بات پر کہ کس کے ساتھ بات کر رہی ہوں۔ اگر تو دوست ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ دوستوں کے ساتھ کچھ الگ سے تعلقات ہوتے ہیں۔ زندگی کچھ الگ سی ہوتی ہے...... جبکہ فیملی کے ساتھ کچھ الگ سے معاملات ہوتے ہیں۔ تو یہ کہہ لیں کہ میں ''مکس'' ہوں ''اکھڑ'' نہیں ہوں بلکہ بالکل بھی اکھڑ نہیں ہوں۔ ''موڈی'' بھی نہیں ہوں۔ بس جیسی وردا (ڈرامے کا کردار) ہے ویسی ہی میں ہوں، بس تھوڑا سا فرق یہ ہے کہ میں ہنس مکھ ہوں اور ہر وقت خوش رہنے والی انسان ہوں۔''

''کہانی ''وٹہ سٹہ'' یہ بیس کر رہی ہے۔ تمہاری بھابھی کے ساتھ جو سلوک ہوا، وہ تمہارے ساتھ نہیں ہوا۔ پھر بھی تم میکے کا ساتھ دے رہی ہو۔ اگر اصل زندگی میں یہی سچویشن تمہارے ساتھ ہوتی تو کس کا ساتھ دیتیں۔ سسرال کا یا میکے کا؟''

''اگر اصل زندگی میں میرے ساتھ ایسا ہوتا جیسا رسوائی'' میں ''وردا'' کے ساتھ ہوا ہے تو میں اپنے سسرال والوں کا ساتھ دیتی، کیونکہ وردا کا بھائی جو کچھ یا جو سلوک ''سمیرا'' (ثناء جاوید) کے ساتھ کر رہا تھا جبکہ اس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ اور سلمیٰ اور سلمان نے جو سمیرا کے ساتھ کیا، اس کی کوئی معافی تلافی نہیں ہے۔ تو اگر میرے ساتھ ایسا ہوتا تو میں پوری طرح اپنے سسرال والوں کا ساتھ دیتی۔''

''اس سیریل کے لیے اور پھر اس رول کے لیے تمہارا انتخاب کیسے ہوا؟''

''اس رول کے لیے انتخاب ایسے ہوا کہ میں کام ڈھونڈ رہی تھی اور مختلف پروڈکشن ہاؤسز میں جا کر آڈیشن دے رہی تھی۔ سکس سگما کے پاس بھی گئی اور کسی اور ڈرامے کے لیے آڈیشن دے رہی تھی، اور ساتھ ساتھ وہ امی کو بھی اپروچ کر رہے تھے کچھ ڈائریکٹ کروانے کے لیے، تو جس ڈرامے کے لیے میں آڈیشن دے رہی تھی، اس میں میرا رول چھوٹا تھا اور رسوائی میں بڑا رول تھا تو انہیں میں اس رول میں یعنی ''وردا'' کے رول میں فٹ نظر آ رہی تھی...... انہیں لگا کہ یہ عام زندگی میں بھی اسی انداز میں بات کرتی ہے تو انہوں نے پھر مجھے اسی رول کے لیے منتخب کر لیا۔''

''ڈرامہ سیریل ''ونی'' کے بعد آپ کا کوئی ڈرامہ نظر سے نہیں گزرا کیوں؟ اتنا گیپ دینے کی کیا وجہ تھی؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ''ونی'' کے بعد میں نے بالکل کوئی کام نہیں کیا اور جب میں نے ونی کیا تھا

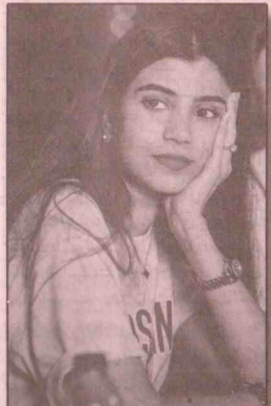

تو میرا خیال ہے کہ میں سولہ سال کی تھی اور اس وقت میں اسکول میں تھی اور تین سال کے بعد اسکول ختم کیا اور اس کے بعد میں چار سال کے لیے ''لندن'' شفٹ ہوگئی تھی۔ اپنی اعلا تعلیم کے لیے اور پھر میری واپسی ہوئی ہے 2014ء میں...... اس کے بعد مجھے تھوڑا ٹائم لگا ایکٹنگ کو سمجھنے میں اور میرے دماغ میں تھا کہ مجھے اداکاری کی طرف ہی آنا ہے مگر میں یکسو نہیں تھی۔ میرا دھیان دیگر کاموں کی طرف بھی تھا۔ بس اسی کشمکش میں کچھ سال لگ گئے اس طرف آنے میں۔''

''ونی'' کیا تو اپنی امی کے ساتھ...... اور اب ''رسوائی'' بھی ان ہی کے ساتھ...... آگے کیا ارادے ہیں؟''

''اس بار تو امی کے ساتھ کام نہیں کرنا تھا، بالکل اچانک یہ سب کچھ ہوا اور امی تو خود بھی کچھ نہیں کر رہی تھیں۔ یعنی ان کا اب زیادہ رجحان تو اداکاری کی طرف ہی تھا، ڈائریکشن تو تھوڑی پیچھے چلی گئی تھی...... بس کچھ اللہ میاں کی ٹائمنگ تھی اور کچھ میری قسمت تھی کہ یہ سب کچھ ایک ساتھ ہی ہوگیا...... امی کو ڈائریکشن کے لیے کہا گیا...... مجھے اسکرپٹ پڑھنے کو کہا گیا...... پروڈکشن کمپنی کو بھی ٹھیک لگا اور یہ رول میرے پاس آ گیا...... اور اب تو دیگر پروڈکشن ہاؤسز کے ساتھ بھی کام کرنا ہے۔ صرف امی کے ساتھ نہیں، کیونکہ امی تو پانچ دس سالوں میں صرف ایک بار ہی ڈائریکشن کرتی ہیں۔ ہاں امی کے ساتھ کمفرٹ لیول یہ ہے کہ امی جو کروا سکتی ہیں، جس حد تک لے جا سکتی ہیں لے جاتی ہیں، شاید دوسرا ایسا نہ کر سکے...... اپنے بچے کا تو پتا ہوتا ہے کہ مجھے اسے کس حساب سے ٹریٹ کرنا ہے اور اس کے اندر کا ٹیلنٹ کس طرح نکالنا ہے۔''

''گڈ...... مگر کہیں بھی کام کرو، ماں کی سرپرستی تو رہے گی نا، خیر گزشتہ چند سالوں میں کس ڈرامے نے متاثر کیا، یا کس طرح دیکھتی ہیں ڈراموں کو؟''

''جب میں نے ''ونی'' کیا تھا تو مجھے اس کام کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس وقت کے حساب سے تو میں جج نہیں کر سکتی۔ مگر اب مجھے لگتا ہے کہ سب لوگ ٹی وی کو بہت سیریس لیتے ہیں۔ ہمارا ٹی وی بنیادی طور پر ہماری فلم ہے۔ لوگ ڈرامہ دیکھتے ہیں۔ اسے پسند کرتے ہیں۔ لوگ آپ کو بتاتے ہیں کہ آپ نے کیا غلط کیا، کیا صحیح کیا...... اس وقت ایسا نہیں تھا جس وقت میں نے ''ونی'' کیا تھا...... لوگ اتنا شوق سے نہ دیکھتے تھے اور نہ ہی پہچانتے تھے مگر اب...... لوگ ''رسوائی'' دیکھ رہے ہیں اور مجھ سے ڈرامے کے حوالے سے سوال کرتے ہیں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا...... مثلاً ایک سین تھا، جب میں اپنے سسرال اور اپنے میاں سے پوچھے بغیر اپنے بھائی کی شادی میں چلی جاتی ہوں جس کی وجہ سے سسرال والے ناراض ہو جاتے ہیں تو لوگ مجھ سے اسی حوالے سے پوچھتے ہیں کہ ''آپ کیوں چلی گئی تھیں بھائی کی شادی میں'' یا ایسا کیوں کیا، ویسا کیوں نہیں کیا...... تو اب ٹی وی پوری دنیا میں یوٹیوب کی وجہ سے بڑے آرام سے اور جس وقت دل چاہے دیکھا جا سکتا ہے۔ تو لوگ بڑے آرام سے ہمارے ڈرامے دیکھ لیتے ہیں۔''

''ڈرامے بے شمار ہوگئے ہیں۔ ہر چینل سے پورا پورا ٹائم ڈرامے نشر ہو رہے ہوتے ہیں۔ اچھا ڈرامہ کسے کہتے ہیں آپ کی نظر میں؟''

''میری نظر میں اچھا ڈرامہ وہ ہے جس میں اچھی ایکٹنگ، اچھی ڈائریکشن اور اچھی کہانی ہو۔ اسے دیکھنے سے تو کوئی روک ہی نہیں سکتا اور یہ اللہ میاں کی مہربانی تھی کہ ہمارے پاس بہترین ڈائریکٹر، بہترین پروڈکشن کمپنی اور بہترین فنکار اور رائٹر...... تو ڈرامہ تو اچھا ہونا ہی تھا ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں یہ کرنے کو ملا۔''

''یہ بڑی اچھی بات ہے کہ اب تم اس فیلڈ میں مستقل آ گئی ہو...... لوگوں کو بہت امیدیں ہیں تم سے؟''

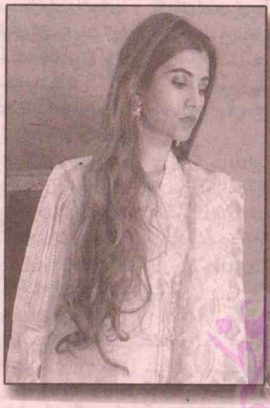

''ان شاء اللہ فیوچر میں یہی کام کرنا ہے...... اب شروع کیا ہے تو اب نہیں چھوڑنا...... لگاتار کرنا ہے، بس دعا یہ ہے کہ اچھے رول ملتے رہیں، لگاتار سے مراد یہ نہیں ہے کہ سب کچھ کرنا ہے، مگر بہت اچھا کام کرنا ہے تاکہ لوگ یاد رکھیں۔ جیسے آج تک لوگوں کو ''ونی'' یاد ہے۔ جیسے ''رسوائی'' میں بہت پذیرائی مل رہی ہے...... اور لوگ میرے اس کردار کو بھی یاد رکھیں گے۔''

''ہمارے جو ڈرامے ہوتے ہیں۔ آپ اس میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں موضوعات کے حساب سے، ڈائریکشن کے حساب سے، اداکاری کے حساب سے؟''

''میں تو خیر اتنا جج نہیں کر سکتی کہ ڈراموں میں کیا غلط ہے، کیا صحیح ہے...... بس مجھے تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ کہانی ایسی ہو جو لوگوں سے ریلیٹڈ ہو۔ کوئی ایسی کہانی نہ ہو کہ جس کا وجود ہی نہ ہو دنیا میں اور ہم بتا رہے ہوں، دکھا رہے ہوں۔ مطلب عورتوں پہ جس طرح کا ظلم ہم دکھاتے ہیں وہ ہم بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر دکھا رہے ہوتے ہیں۔ ہم اس کو ملٹی پلائی بائے 100 کر کے دکھا رہے ہوتے ہیں اور عورتیں سہہ بھی رہی ہوتی ہیں۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا۔ عورت اسٹرانگ ہوتی ہے کمزور نہیں۔''

''جی جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آج کے زمانے کی عورت بہت اسٹرانگ ہے اور بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ اپنے لیے اپنے ملک کے لیے، اس معاشرے کے لیے...... اور جو ڈراموں میں دکھاتے ہیں ایسا بہت کم ہو رہا ہے۔''

''تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا آئے تو کس

سے لکھوانا چاہو گی؟"

"میری موسٹ فیورٹ رائٹر عمیرہ احمد ہیں۔ میری زندگی کی بہترین رائٹر یہی ہیں۔ میں نے ان کو ڈرامہ سیریل "شہرِ ذات" سے دیکھنا شروع کیا تھا اور اس سے قبل "میری ذات ذرہ بے نشاں" آیا تھا اور ان دو ڈراموں نے مجھے جو سبق دیا تھا، وہ مجھے ساری زندگی یاد رہے گا اور میں بھول نہیں سکتی اور اس وقت میں بہت بڑی نہیں تھی، یہی کوئی سولہ یا اٹھارہ سال کی تھی...... تو عمیرہ احمد جس طرح ایک چھوٹی سی بات کو "اللہ" سے جوڑ کر آپ کو بتاتی ہیں اور آپ کو ایک سبق سکھاتی ہیں تو میں سمجھتی ہوں کہ ان سے بہتر کوئی نہیں سمجھا سکتا آپ کو۔ بہترین رائٹر ہیں وہ۔"

"آپ نے شروع کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میں آڈیشن دے رہی تھی۔ جبکہ تم پہلے بھی کام کر چکی ہو اور پھر تمہاری امی سے بھی سب واقف ہیں؟ تو آڈیشن کا کیا مطلب؟ یا کیوں ضروری ہے؟"

"ونی۔" کے لیے مجھے کافی سال ہو گئے ہیں تو میں شاید لوگوں کو یاد نہیں تھی تو اپنے آپ کو متعارف کرانے کے لیے میں نے خود ہی آڈیشن کا کہا...... اور اگرچہ میں "رسوائی" مکمل کروا چکی ہوں اس کے باوجود میں آڈیشن دے رہی ہوں اور مجھے آڈیشن دینے میں کوئی پرابلم بھی نہیں ہے اگر پروڈکشن ہاؤسز والوں کو میرے آڈیشن دینے سے اور مجھے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا مگر اب ایسا ہوتا ہے۔ کیونکہ پروڈکشن ہاؤسز والے دیکھنا چاہتے ہیں کہ جو کردار یہ کریں گی، اس میں یہ کتنی فٹ ہیں۔"

"شہرِ ذات" اور "میری ذات ذرہ بے نشاں" کے علاوہ کون سے ڈرامے ہیں جو تمہاری یادداشت میں محفوظ ہیں اور تمہیں بہت پسند ہیں؟"

"گزشتہ دو تین سالوں میں "دل موم کا دیا" بہت اچھا تھا اور "یقین کا سفر" بہترین اور ہاں کافی سال پہلے "زندگی گلزار ہے" دیکھا تھا جو کہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ یہ ڈرامہ بھی مجھے بھی بھولتا نہیں ہے، جب بھی میں بور ہو رہی ہوتی ہوں تو میں وہ ڈرامہ دیکھتی ہوں...... بار بار دیکھا ہے میں نے، میرے پسندیدہ ترین ڈراموں میں سے ہے۔"

"منّی! آپ نے بتایا کہ آپ اعلا تعلیم کے لیے چار سال لندن میں رہیں تو یہ بتائیں کہ کیا پڑھ کر آئی ہیں؟"

"فلم، ٹی وی اور میوزک کی ڈگری ہے میرے پاس۔ یعنی بی اے آنرز ہیں —— بیچلرز آف آرٹ۔" کی ڈگری ہے میرے پاس اور ان شااللہ یہ ڈگری میرے بہت کام آئے گی۔"

"اور بھائی ہیں اس فیلڈ میں؟ اس نے کیا پڑھا ہے؟"

"بھائی نے "لمز یونیورسٹی" سے ایم بی اے کیا ہے اور وہ ایک "مارکیٹنگ ایجنسی اسٹار کام" اس کے لیے کام کر رہا ہے۔ بھائی مجھ سے چھوٹا ہے...... تو فیلڈ تو اس کی یہی ہے مگر وہ بیک گراؤنڈ میں رہ کر کام کرے گا۔ یعنی جو ایڈ اور کمرشل آپ ٹی وی پر دیکھتے ہیں، اس سے ریلیٹڈ ہے اس کی جاب۔"

"اور شادی، منگنی...... ہوئی؟ کیا خیال ہے اس بارے میں؟"

"نہیں۔ ابھی نہیں ہوئی اور شادی کے بارے میں خیال وہی ہے جو سب کا ہوتا ہے...... جب اللہ کا حکم ہوگا ہو جائے گی۔ میں اس بارے میں زیادہ نہیں سوچتی کہ مجھے لگتا ہے کہ ہر کسی پہ ایک وقت آتا ہے جب اس کی زندگی میں یہ سب کچھ آنا ہوتا ہے تو یقیناً میری زندگی میں بھی یہ وقت آئے گا...... اور سب سے بڑھ کر کہ جب اللہ چاہے گا۔"

"امور خانہ داری سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"بالکل جی...... گھر گرہستی لڑکیوں کو بالکل آنی چاہیے اور مجھے بہت شوق ہے گھر کے کام کرنے کا، صفائی کرنے کا، مجھے ہر چیز قرینے، سلیقے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی اچھی لگتی ہے۔ بکھری ہوئی چیزیں یا گندگی مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے ہمارے گھر میں سب میں

بڑا ایشو ہیں کہ وہ گندگی اور چیزوں کا بکھرا ہوا برداشت نہیں کر سکتے...... ہم میں اور خاص طور پر مجھ میں صفائی کا "کیڑا" ہے...... کھانا بنوا کے کھاتی ہوں، بناتی نہیں ہوں۔"

"گیمز سے کتنی دلچسپی ہے؟ جیسے کرکٹ؟"

"کرکٹ کی میں بہت شوقین نہیں ہوں۔ مگر دیکھتی ضرور ہوں۔ پی ایس ایل بہت شوق سے دیکھا میں نے...... اور سیاست تو میری سمجھ میں ہی نہیں آتی اور سمجھنے کی کوشش بھی کروں تو سمجھ میں نہیں آتی، ابو بتاتے رہتے ہیں اور میں سنتی رہتی ہوں۔ ویسے مجھے پتا ہے کہ آج کل جو ملکی حالات ہیں، وہ اچھے نہیں ہیں، مشکل ٹائم چل رہا ہے ملک پر...... میں سنتی رہتی ہوں کہ اکانومی کے حالات بہت برے ہیں۔"

"ٹریولنگ کا شوق ہے؟"

"ٹریولنگ کا تو مجھے بہت بہت زیادہ شوق ہے...... اور ہر دو مہینے کے بعد اپنے آپ کو لے کر ایک چھٹی پہ جاتی ہوں۔ ویسے میری ٹریولنگ پارٹنر میری امی ہیں اور ہم ہر دو ماہ بعد گھومنے پھرنے نکل جاتے ہیں اور سال میں چار چھ مہینے ہم ضرور گھومتے ہیں اور بہت سارے ملک دیکھے ہیں۔ جن میں کینیڈا، انگلینڈ، امریکہ، گزشتہ سال یورپ کا ٹور کیا۔ اس میں ہم سوئٹزرلینڈ گئے۔ پیرس اور اسپین گئے انگلینڈ میں تو میں چار سال یعنی لندن میں رہی ہوں۔ دو ماہ قبل ہم دبئی میں تھے، دبئی میں میرے ماموں رہتے ہیں تو ہم ان کے پاس گئے تھے۔ میں اور امی بہت گھومتے ہیں، ہمارا کام ہی یہی ہے ہم کام کرتے ہیں۔ پیسے کماتے ہیں اور پھر چھٹی پہ نکل جاتے ہیں پھر آتے ہیں۔ پھر اپنے کام میں مگن ہو جاتے ہیں۔"

"کبھی مستقل طور پر باہر (ملک سے) رہنے کا دل چاہا؟"

"رہنے کے لیے تو پاکستان سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔ جو آسانیاں اور جو سہولتیں اپنے ملک میں ہیں کسی ملک میں نہیں ہیں۔ باہر تو آپ کو اپنے سب کام خود کرنے پڑتے ہیں، کھانا خود بنانا ہے، برتن خود دھونے ہیں۔ باتھ روم خود صاف کرنے ہیں...... تو اپنے ملک سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"مزاجاً کیسی ہیں...... فیشن اور دیگر شوق کے بارے میں بتائیں؟"

"مزاج کے معاملے میں تو بہت ہی دھیمی ہوں۔ مجھ پر کوئی بھی چیز بہت زیادہ اثر نہیں کرتی، بہت کم چیزیں اثر کرتی ہیں اور پھر وہ ایسی والی کرتی ہیں جن کا اثر بہت دیر تک رہتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی بات کو میں دل پہ لے لوں اور اس کے بارے میں یا اس کے لیے رونا دھونا مچاؤں...... فیشن کا بہت شوق ہے۔ کپڑے بنانے کا بہت زیادہ شوق ہے "رسوائی میں" میں نے سارے اپنے کپڑے پہنے ہیں اور اپنی وارڈ روب خود بنائی تھی...... کھانا مجھے دوسروں کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے کیونکہ ہر ایک کے ہاتھ کا ٹیسٹ الگ ہوتا ہے اور ہر ایک کے پکانے کی تراکیب بھی الگ ہوتی ہیں...... میری پسندیدہ ڈش بریانی — اور نہاری ہے اور میں انہیں ہر روز کھا سکتی ہوں اور ہاں دال چاول بھی۔ ویسے دال چاول تو روز ہی کھاتی ہوں تقریباً...... بریانی کبھی کبھار ملتی ہے، نہاری، پلاؤ بھی کبھی کبھار ہی کھانے کو ملتے ہیں...... اور کانٹی نینٹل کھانوں میں چائنیز بہت پسند ہیں۔ پیزا بہت پسند ہے اور ویسے میں ہر چیز کھا لیتی ہوں۔ خواہ سبزیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ مجھے کھانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے خوب صورت اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والی منّی طارق سے اجازت چاہی۔ شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔"

☆☆

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

رضیہ جمیل

آپ کے خط

حمیرا گل نے ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

کہانیاں لکھنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اجازت تو کیا دینا تھی، میرا اتنا پیار سے لکھا ہوا خط ہی نہیں شائع کیا۔

ثوبیہ نور شادی کی بہت بہت مبارک باد۔ اللہ خوشیاں دے، آمین اور ہاں ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ تبسم بشیر اور شہلا عدنان آپ دونوں کی امی کے لیے دعا گو ہوں۔

رضوانہ شکیل۔ آج کے دور میں لڑکیاں قرآن حدیث کے حوالے لے کر آجاتی ہیں کہ ساس سسر، بہو کی ذمہ داری نہیں۔ آپ نے اپنے سسر کے ساتھ جو بھلائی کی اس کا اجر تو صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔ بشریٰ پروین آپ کے خاندان کے بارے میں جان کر بے اختیار آپ کے لیے دل سے دعا نکلی۔ یاد رکھیے ہر کسی کی زندگی میں کوئی نہ کوئی محرومی ہوتی ہے۔

زرقا سکندر کی تحریر "بات ہے دانائی کی" اچھی رہی۔

لوگ شادی پر زیادہ پیسے خرچ کرنے کو ہی محبت کا اظہار سمجھتے ہیں۔ مدیحہ عارف کی "دلدل" میں جب تک حسن کی واپسی نہیں ہوئی۔ دل فریحہ کے لیے پریشان رہا۔ فائزہ ثمرین "ان کہی" بہترین رہی، ویری نائس۔ زارا ہنجرا کی تحریر "پچھل پیری" سبق آموز کہانی تھی۔ شبانہ شوکت کی تحریر "انا نہیں ہوتی" بھی اچھی رہی۔

☆ پیاری حمیرا! آپ کہانیاں لکھنا چاہتی ہیں، تو اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ آپ کہانی لکھ کر بھجوادیں۔ اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ خط اور تبصرہ بہت اچھا ہے لیکن ہم درخواست کریں گے کہ اس سلسلے کو پیغام رسانی کا یا مبارک باد کا سلسلہ نہ بنائیں۔ اپنی کوئی ذاتی بات لکھنا چاہیں تو بے شک لکھ سکتی ہیں۔

بنت محمد فیاض خان اشفاق کالونی کیماڑی کراچی سے شریک محفل ہیں

اس ماہ کا شعاع بیسٹ تھا۔ پہلی شعاع میں ہمیشہ توجہ سے پڑھتی ہوں۔ خاص کر نبی پاک ﷺ کی پیاری باتیں، افسانہ "کاسۂ عزت، شام کی حویلی میں" پورا رسالہ ہی بیسٹ ہے۔

اپنے علاقے کا مختصر سا تعارف لکھنا چاہتی ہوں۔ ہمارے گاؤں کا نام ابزار ہے جو کہ (ضلع صوابی نشان حیدر کیپٹن شیر خان) کے گاؤں سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ جہانگیرہ شہر سے آدھے گھنٹے کی دوری پر واقع ہے۔ چھ ہزار گھروں کی آبادی والے اس گاؤں میں بجلی، تعلیم، ٹیلی فون، سڑک کی سہولت موجود ہے۔ علاقے کے تقریباً 75 % لوگوں کا روزگار کاشت کاری (زراعت) سے وابستہ ہے۔ پچیس فیصد لوگ سرکاری ملازمین ہیں۔ جن میں پاک آرمی، پولیس، نیوی، واپڈا، ڈاک خانہ، ڈاکٹر، بیوروکریٹ، اساتذہ وغیرہ۔ مذہب کے حوالے سے ہمارے گاؤں کے لوگ بہت سلجھے ہوئے ہیں۔ سادہ طرز زندگی، فضول خرچیوں، فضول رسموں کو پسند نہیں کرتے۔ زیادہ تر لوگ حج، عمرہ، زکوٰۃ، صدقہ خیرات کرنے والے ہیں۔ خوشی اور غم کے موقع پر گاؤں کی تمام برادریاں اکٹھی ہوتی ہیں۔ گاؤں میں ایک ہسپتال بھی موجود ہے، جن میں گاؤں کے لوگوں کے علاوہ اردگرد کے گاؤں کے لوگ بھی علاج و معالج کے لیے آتے رہتے

ہیں۔ گاؤں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر دریا اباسین بہتا ہے، جس کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا ہوتا ہے۔ دریا میں مچھلیوں کا شکار کرنے کے لیے خیبر پختونخوا کے دور دراز کے علاقوں سے لوگ آتے ہیں۔ دریا کے پاس پکی سڑک بنی ہوئی ہے، جس پر ہر قسم کی گاڑی جا سکتی ہے۔ دریا کے کنارے اور دریا کے بیچ میں ریسٹورنٹ بنے ہوئے ہیں، جن میں ہر وقت آپ کو دریا کی تازہ مچھلی اور چائے دستیاب ہوگی۔

☆ بنت فیاض! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کے گاؤں کا احوال پڑھ کر لطف آ گیا۔ مختصر آبادی، سلجھے ہوئے لوگ، سادہ زندگی...... زندگی کی بنیادی سہولیات مہیا۔ گاؤں کے قریب بہتا دریائے اباسین۔ جس کے کنارے اور بیچ میں ریسٹورنٹ بنے ہوئے ہیں، واہ بھئی، بہت خوب صورت گاؤں ہے آپ کا۔

آپ نے اس بار صرف اپنے گاؤں کا تعارف کرایا، آئندہ شعاع کے بارے میں بھی اپنی رائے لکھیے گا اور اپنا نام بھی ضرور لکھیے گا۔

گڑیا راجپوت نے جاتری شریف سے لکھا ہے

میرے کسی بھی خط کو شعاع میں جگہ نہیں ملتی۔ میں نے بہت کوشش کر کے دیکھ لی ہے، شاید آپ کو میری لکھائی اچھی نہیں لگتی یا میرا لکھا پسند نہیں آتا۔ رخسانہ نگار کا ناول "شام کی حویلی میں" مجھے کافی پسند آرہا ہے۔ کشف کبھی کبھی تو اچھی لگتی ہے کیونکہ اس کا جھگڑالو پن اپنی عزت بچانے کی وجہ سے ہے۔ نعیمہ ناز کا "شہر تمنا" عائشہ پہ بہت ترس آتا ہے۔ اس کو جلد از جلد ماں مل جانا چاہیے، سب سے زیادہ برا تو نائلہ نے اپنے ساتھ کیا ہے جس خوب صورتی پر اسے بہت ناز تھا، وہ جمال کے ہاتھوں دو ٹکے کی بھی نہ رہی۔ کہیں یہ چنبیلی تو نہیں......؟ شاہ میر میرا موسٹ فیورٹ کریکٹر ہے۔ فرح بخاری کا "وہ نازنین" لگتا ہے اب نازنین کی مشکلات کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ واسع مجھے ذاتی طور پر پسند ہے پر تھوڑا بزدل سا ہے۔ ڈاکٹر فریال کے خط مجھے بہت پسند آتے ہیں۔ ماہا بشیر حسین اور تبسم بشیر حسین دونوں بہنیں ہیں کیا؟ مجھے ماہا کی صاف گوئی بہت بھاتی ہے۔ اب مجھے میری کہانیوں کے متعلق بھی بتادیں، قابل اشاعت ہیں یا نہیں۔

مجھے عدنان بھائی سے واٹس ایپ پر بات کرنی ہے، کیا ان کا نمبر مل سکتا ہے؟

☆ پیاری گڑیا! عدنان بھائی صرف پرچے کے ذریعے ہی جواب دیتے ہیں۔ آپ اپنا مسئلہ لکھ کر بھجوادیں، یہ ضرور ہے کہ ہم آپ کے خط کا فوری جواب دلوا سکتے ہیں۔ آپ کی رائٹنگ بہت اچھی ہے۔ خط بھی بہت اچھا لکھا ہے۔ سطر بھی چھوڑی ہے اور صفحے کے ایک جانب بھی لکھا ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ کے خطوں میں کوئی خرابی نہیں۔ اگر خط شائع نہیں ہوئے تو اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے کہ آپ کے خط ہمیں موصول نہیں ہوئے یا تاخیر سے موصول ہوئے۔

زوناش بابر، نادیہ انور، سحرش، شہلا، سدو وال سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

واؤ، ٹائٹل کتنا پیارا ہے۔ شعاع ہمیشہ کی طرح بہتر سے بہترین ہے۔ افشین نعیم کا افسانہ "یار دل دار" بہترین جا رہا ہے۔ آپی پوسٹ آفس بہت دور ہے۔ ہمارے گاؤں سے دوسرے گاؤں جا کر پوسٹ کروانا پڑتا ہے پھر بھی آپ خط کا جواب نہیں دیتیں۔ ہم آپ سے سخت ناراض ہیں۔ آپ کو ہم نے چھ ماہ پہلے کہانی بھیجی تھی۔ "لمحوں کا قرض" آپ نے ہم کو یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ قابل اشاعت ہے کہ نہیں۔ پلیز اس خط کے ذریعے بتادیں، اب ہم ایک اور کہانی بھیج رہے ہیں، یہ قابل اشاعت ہے کہ نہیں، ضرور بتائیے گا۔ سلسلے وار ناول بھی اچھے جا رہے ہیں۔

☆ پیاری بہنو! آپ کے سات آٹھ تو کیا ہمیں ایک خط بھی نہیں ملا، ورنہ ہم جواب ضرور دیتے۔ چونکہ آپ چار دوستوں نے مل کر خط لکھا ہے، اس لیے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ان ناموں سے کوئی خط نہیں ملا ہے۔ کہانی قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

گل ناز نے کراچی سے لکھا ہے

فہرست پر نظر دوڑائی تو سارے نئے نام تھے (نئے سے مراد جن کی دو یا تین، چار تحریریں شائع ہوئی ہیں)۔ بہرحال "شام کی حویلی" میں رخسانہ نگار سترھویں قسط کے

باوجود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ ''شہر تمنا'' میں، میں سیدہ بخاری سے متفق ہوں۔ ناولٹ میں فرح بخاری کو میں نے پڑھا نہیں، رہ گئی گل بانو تو نئی نسل کے لیے سبق آموز تحریر تھی مگر وہی موضوع پرانا۔ افسانوں میں طیبہ مغل کے انداز تحریر نے متاثر کیا۔ باقی افسانے ہلکے پھلکے موضوعات پر مبنی تھے۔ ''محبت سے'' کے علاوہ۔ نظمیں غزلیں میں عاطف سعید اور راشد ملک کو بھی لے کر آئیں۔ مستقل سلسلوں میں خط آپ کے، تجھ سے ناتا جوڑا۔ شعاع کے ساتھ اور شاعری سچ بولتی ہے۔ میرے پسندیدہ ہیں، لیکن شعاع کے ساتھ ساتھ اور شاعری سچ بولتی ہے، بالکل ہی غائب ہوگئے ہیں۔ کتابوں پر تبصرہ تو ایسے غائب ہوا ہے کہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ ''شعاع کے ساتھ'' اگر ہو بھی تو ایسا لگتا ہے جیسے گن پوائنٹ پر لکھوایا ہے، صرف ڈیڑھ پیرا گراف (یہ ظلم ہے یار)۔ دس سال پہلے کے شماروں میں ایک بہن کا تعارف ہی چار چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ ''شاعری سچ بولتی ہے'' بھی دو بہنوں کا شامل ہوتا تھا۔ پلیز ڈائجسٹ کے صفحات بڑھائیں۔ پچھلے مہینے 2003-04 کے شمارے لائی تو یقین کریں، پڑھ کر اتنا لطف آیا۔ ناول، افسانوں کے علاوہ بھی مستقل سلسلے بہت تھے۔ پرانی رائٹرز جیسے راحت جبیں، فائزہ چیمہ، غزالہ نگار، ثروت نذیر، فارحہ ارشد...... یہ سب کہاں کھوگئی ہیں۔ پلیز ان سے کچھ لکھوائیں، نئی رائٹرز بے شک اچھا لکھ رہی ہیں (لگتا ہے ان کا بھی بحران پیدا ہونے لگتا ہے۔ سائرہ رضا، ایمل رضا، سمیرا حمید اور سدرۃ المنتہیٰ کہاں مصروف ہیں آپ سب؟)

☆ پیاری گل ناز! ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ تمام لکھنے والے نئے ہوں۔ یہ محض اتفاق ہی سمجھیں، دراصل ہر ماہ ہمیں بڑی تعداد میں تحریریں موصول ہوتی ہیں اور سب تو نہیں لیکن بیشتر کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ زیادتی لگتی ہے کہ ان باصلاحیت مصنفین کو موقع نہ دیں۔

صفحات بے شک کم ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے سلسلوں کے حصے میں بھی کم صفحات آتے ہیں۔ ''تبدیلی'' حکومت آنے سے پہلے ڈالر 98 کا تھا، اب 160 روپے کا ہے۔ آپ اندازہ لگالیں، صرف کاغذ کی قیمت میں کتنی تبدیلی آئی۔ یہ اسی ''تبدیلی'' کے ثمرات ہیں۔ دعا کریں کہ وہ زمانے لوٹ آئیں جب پیٹرول 68 روپے فی لیٹر اور ڈالر کی قیمت سو روپے تھی۔

تبسم بشیر حسین ڈنگہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

امی کی طبیعت اب بہتر ہے۔ ٹائٹل پر نیناں چوہدری بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ ''پہلی شعاع'' کے لیے الفاظ نہیں، بہت خوب۔ پر آج کل دل کون دیکھتا ہے سب شکل و صورت، مال و دولت کے اسیر ہیں۔ ''حمد و نعت'' سبحان اللہ، ماشاء اللہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں، میں اس قابل کہاں کچھ کہہ سکوں؟ ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' میں ر۔ح کے حالات پڑھ کر دل بوجھل سا ہوگیا۔ کافی وقت تو سکتے کی حالت میں گزر گیا، یقین ہی نہیں آیا۔ کیا دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں؟ اتنے وحشی، اتنے ظالم؟ ایسے لوگوں کو اللہ ہی ہدایت دے۔ نظمیں، غزلیں سے محسن نقوی اور عدیم ہاشمی کی غزلیں پسند آئیں۔ اس ماہ کی مسکراہٹیں گدگدانی لگیں۔ باتوں سے خوشبو آئے، سے ماریہ نذیر اور نادیہ یاسر نے خوب خوشبو بکھیری۔ ''خط آپ کے'' میرا موسٹ فیورٹ سلسلہ ہے پر اس ماہ خطوط کافی کم تھے۔

☆ پیاری تبسم! آپ نے طبیعت خرابی کے باوجود ہمیں خط لکھا، اس محبت کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کی کہانی میں ذرا سی بھی گنجائش ہوئی تو ہم ضرور شائع کریں گے۔

ماہا بشیر حسین نے ڈنگہ سے لکھا ہے

ٹائٹل خوب صورت تھا، نظریں جم سی گئیں۔ ''پہلی شعاع'' آج کے زمانے میں صورت کے ہی پجاری ملیں گے، بے شک لکھوالیں۔ ''حمد و نعت'' ایمان کی غذا۔ ''نبی کی باتیں'' لاجواب بے مثال سلسلہ ہے۔ ''بندھن'' میں شگفتہ فرحت سے ملاقات کی، جو کہ سو سو رہی۔ ''دستک'' میں شیث ساجی سے ملے، مل کر ذرا مزا نہیں آیا۔ اب ڈراما اتنا بھی ہٹ نہ تھا، بس عورت کی بے وفائی ہی تھی۔ اس ماہ دونوں انٹرویو سو سو تھے۔ ''ناتا جوڑا ہے'' دل کیا، ر۔ح کے سسرالیوں کو توپ سے اڑادوں۔ میری بد دعا لگے گی

بقیہ صفحہ نمبر 242 پر

ماہنامہ کرن

اپریل 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

- اداکار ''عرفان کھوسٹ'' سے شاہین رشید کی ملاقات،
- آواز کی دنیا سے ''نازمین الطاف'' اس ماہ مہمان ہیں،
- اداکار ''نعمان سمیع'' کہتے ہیں ''میری بھی سنیے''،
- اس ماہ ''انیلا طالب'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،
- کیا ارسلہ کا نکاح آبص سے ہوجائے گا؟ یہ جاننے کے لیے پڑھیے۔
  ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- ربیکا واقعی میں حمزہ سے طلاق لینا چاہتی ہے؟ خزینہ تیمور کو معاف کردے گی؟
  ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول،
- ''کنار خواب جو'' فرح بخاری کا مکمل ناول،
- ''جفت ساز'' نگہت سیما کا مکمل ناول،
- ''پھول کھلنے لگے ہیں راہوں میں'' نوشین فیاض کا ناولٹ،
- ''اے دلِ بے خبر'' صدف ریحان گیلانی کے ناولٹ کی دوسری اور آخری قسط،
- نفیسہ سعید، ماہ نور بنت نعیم، عمارہ امداد اور فہمیدہ فرید کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- ''کرن کتاب''

دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزے دار ریسپیز کے ساتھ،

اپریل 2020ء کا شمارہ شائع ہوگیا

نعیمہ ناز

سحر تمنا

عالیہ بیگم اپنی بیٹی حمنہ کے رشتے کے لیے خاندانی لوگوں کی تلاش میں تھیں۔ جب کہ ان کی ساس کا کہنا تھا کہ رشتہ کے لیے دین داری اور شرافت کو ترجیح دینی چاہیے۔

عائشہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ رشتوں کے نام پر اس کی ایک خالہ تھیں جن کے دو بچے فہد اور علیزے تھے۔ فہد اپنے باپ کے پاس امریکہ میں پڑھنے گیا تھا۔ اس کی والدہ سلائی کر کے اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ عائشہ کی سہیلیاں اس کی بے پناہ خوب صورتی کو سراہتی تھیں۔

سید صاحب کو مسجد کمیٹی کا صدر منتخب کیا جا رہا تھا۔ ان کی بیٹی نائلہ ایک خود سر لڑکی تھی، اس کی اپنے شوہر سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ آئے دن اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر باپ کے گھر آ بیٹھتی۔ اس میں ماں کے مزاج کی جھلک تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی پر بہت ناز تھا۔ سید صاحب اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ نائلہ کے شوہر سرمد کا دوست جمال اس پر مرمٹا ہے۔

چنبلی کا تعلق بازار حسن سے ہے طلال شیخ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا بیٹا ہے جو چنبیلی کے حسن پر مرمٹا ہے۔

شاہ میر رسول بخش کا سب سے چہیتا شاگرد تھا، جو ان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔

احمد فجر کے بعد جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ آج ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے پڑوس کے کامران انکل اسے ا موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں دے سکے۔ اسے کافی انتظار کے بعد بس کی کھچا کھچ بھری چھت پر جگہ ملی۔ انتہائی تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے کچھ مسافر نیچے جا گرے جن میں احمد بھی شامل تھا۔

سرمد سو رہا ہوتا ہے تو جمال کا فون آتا ہے۔ اپنی بدقسمتی پر کڑھتی نائلہ کو جمال کی کال ایک نعمت لگتی ہے۔ جمال اپنی چک چپڑی باتوں سے اسے پھر سبز باغ دکھاتا ہے۔ اچانک نائلہ کی نظر اٹھتی ہے تو سامنے کھڑا سرمد اسے عجیب نظروں سے دیکھتا نظر آتا ہے۔

طلال چنبیلی کے شادی پر اصرار کرنے پر ہامی بھر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جلد مہک جان سے بات کرے گا۔ مہک جان سے بات کر کے وہ اس کی شرائط مان کر چنبیلی سے نکاح کر کے لے جاتا ہے۔

احمد کے انتقال کے بعد عائشہ اور اس کی امی بہت سارے مسائل کا شکار ہوتی ہیں لیکن اپنی غیور طبیعت کی وجہ سے کسی سے قرض ادھار نہیں لیتیں۔

ایک سلائی کے سوٹ کے لیے لیس اور دھاگہ خریدنے کے لیے عائشہ کو بازار جانا پڑتا ہے۔ شام زیادہ ہو جاتی ہے، وہ بس کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہے مانی بصد اصرار اسے لفٹ دیتا ہے۔ مانی کی امی اور بہن ماریہ گاڑی میں مانی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھتی ہیں لیکن پہچان نہیں پاتیں۔ مانی پوچھ گچھ پر ماریہ کے سامنے عائشہ کا نام لے دیتا ہے۔

جمال دوپہر میں فون کر کے نائلہ کو ہوٹل لے جانے کی بات کرتا ہے۔ دروازہ بجنے پر وہ باپ کو دیکھ کر وہ حیران رہ جاتی ہے۔ سید صاحب اس کا فون اٹھاتے ہیں۔ سید صاحب کے جانے کے بعد نائلہ جمال سے ملنے چلی جاتی ہے جہاں وہ ایک دوسرے سے التفات کا اظہار کرتے ہیں۔ جمال اسے اپنے نوتعمیر شدہ بنگلے میں لے جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ یہ تمہارا گھر ہے۔

چنبیلی طلال کے ساتھ شادی ہو جانے پر بہت خوش ہے۔ طلال اسے بتاتا ہے کہ ہر چیز جو اسے پسند آ جائے وہ قید کر لیتا ہے اور اس قید سے رہائی اس کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں۔

سید صاحب اپنے بیٹے فرحان سے اس کی شادی کی بات کرتے ہیں تو وہ پھر ٹال دیتا ہے حمنہ کے نکاح والے دن مانی' عائشہ کا انتظار کرتا ہے۔ ماریہ جو اس کی بہن ہے اس سے پوچھتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی امی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔

عائشہ کی خالہ کا فون آتا ہے وہ عائشہ کی امی سے کہتی ہے کہ جوان بچی کے ساتھ اکیلی کیسے رہو گی میرے پاس آ جاؤ، عائشہ کی امی انکار کر دیتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ کب تک بہن کو انکار کروں گی اگر مجھے کچھ ہو گیا تو عائشہ کا کیا ہو گا۔ وہ عائشہ کے رشتے کی بات کرتی ہیں۔

جھمکا جان بڑی بی کو ڈانٹتی ہے کہ تم اس انتظار میں رو رو کے کیوں مر رہی ہو، وہ نہیں آئے گا۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا مر مرا گیا۔ تارا جھمکا جان کو کبیر صاحب کے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔

نائلہ جمال کے گھر سے آنے کے بعد بھی اسی تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔ سرمد آتا ہے تو اسے بخار ہوتا ہے۔ وہ نائلہ سے چائے بنانے کا کہتا ہے نائلہ منع کر دیتی ہے اور گلی کے نکڑ سے اسے چائے لانے کا کہتی ہے۔ واپس آ کر سرمد، نائلہ سے پوچھتا ہی ہے کہ وہ آج دن میں کہاں گئی تھی۔

چنبیلی طلال کو ماں بننے کے متعلق بتاتی ہے تو وہ ناراض ہوتا ہے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں ہمارے یہاں خاندانی بیوی سے بچہ پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ کہتا ہے کہ ہم چھ بھائی ہیں اور چھٹا بھائی لاڈلا چہیتا یہ شادی کے چھٹے مہینہ پیدا ہوا تھا۔

ماریہ، عائشہ کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے رشتے کے لیے شام میں کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ مانی اتفاقاً وہاں سے گزرتے ہوئے سن لیتا ہے۔

ظفر صاحب کی بیٹی کو فائرنگ کے ذریعے ڈرا کر ان کو عملی دھمکی دی جاتی ہے۔

چنبیلی بیٹے کی پیدائش پر طلال کی توجہ پا کر پھر اپنا خیال رکھتی ہے لیکن طلال نشے میں چور گھر آ کر اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے پاس سے آ رہا ہے۔ چنبیلی کے سوال پر کہتا ہے کہ تو تو بیوی ہے محبوبہ تو وہ ہے جو فلیٹ میں رہتی ہے۔

جان محمد کی بیٹی کو ایکسیڈنٹ کے ذریعے مروا دیا جاتا ہے۔ اس کی بیوی بین کرتی ہے اور چلا چلا کے قاتلوں کے نام لیتی ہے اس کی رشتہ دار اسے چپ کرانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتی۔ میڈیا کے لیے یہ بہت بڑی خبر تھی کیس کے اہم گواہ کی بیٹی کی ایکسیڈنٹ میں موت۔ میڈیا کی بڑی تعداد اس کے گھر جمع تھی۔

ماریہ، شاہ میر کے ہاتھ کا سلا سوٹ دیکھ اس کی تعریف کرتی اور اسے کہتی ہے کہ تم اپنے چاچا کو تنگ کیوں کرتے ہو۔ انہوں نے تمہاری شکایت کی ہے۔ نائلہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود اپنی کیفیت خود نہیں سمجھ پاتی۔ وہ ڈرتی ہے کہ باہر جانے پر پہچان لی جائے گی۔ جمال اس کا یہ حل نکالتا ہے کہ اسلام آباد شفٹ ہو جائے۔

امداد بروہی پریس کانفرنس کر کے صفائی پیش کرتا ہے کہ جان محمد کی بیٹی کو مارنے میں اور ظفر صاحب کی بیٹی پر فائرنگ میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔

جان محمد کے جیل میں سارے عیش و آرام ختم ہو چکے تھے، اسے انتہائی بدبودار اور غلیظ کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا تھا۔ جب سے اس نے گولی نہ چلانے کا بیان دیا تھا اس پر شدید ٹارچ ہو رہا تھا۔

ترنم نے روتے روتے ارمانوں سے کرایہ پر لیا گھر خالی کیا، اماں دو ملازم ساتھ لائی تھی جو سارا سامان پیک کر رہے تھے۔ اسے تو ہوش نہ تھا ایک سوچ پریشان کر رہی تھی کہ ایسی کیا بات تھی جو اس نے دل پر لے لی اور دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔

سامان لوڈ ہو گیا تو اماں نے اسے اور بچوں کو ٹیکسی میں بٹھایا۔ خلیل نے جاتی ٹیکسی دیکھ کر کہا، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں ایک عورت چاچا سے ملنے آتی ہے اور پوچھتی ہے کہ میری امانت ہے تمہارے پاس۔ کیسا ہے وہ۔ چاچو کہتے ہی کہ ٹھیک ہے۔ وہاں ماریہ بھی چاچا سے ملتی ہے، وہ اپنی دوستوں کے ساتھ وہاں آتی ہے۔ عورت اٹھ کر چلی جاتی ہے، چاچا کسی سوچ میں گم تھے۔ شاہ میر ایک یتیم خانے میں اپنی آمدنی کا بڑا حصہ خرچ کرتا ہے۔

عالیہ بیگم بیٹی کی شادی کے لیے زیورات نکالتی ہیں، شوہر مانی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کی پسند کی لڑکی کے گھر کب جانا ہے، وہ انکار کر دیتی ہیں۔

عائشہ کی خالہ کا بیٹا ذوہیب گھر والوں کو سرپرائز دینے کے لیے ایک ہفتے پہلے آ جاتا ہے۔

ظفر صدیقی صاحب کو وفاقی وزیر بجل شاہ پولیس کے اعلا افسر کے ہمراہ اپنے گھر بلا کر انہیں مقدمے کو ختم کرنے کا کہتا ہے۔ پولیس افسر کرم الٰہی بھی انہیں سمجھاتا ہے کہ جان محمد اب بیان ولی شاہ کے حق میں دے گا۔ بجل شاہ ایک لفافے میں بلینک چیک دیتا ہے کہ اپنی مرضی کا اماؤنٹ بھر لیں۔ مانی یہ جان کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ظفر صاحب نے قصاص کے پیسے لے لیے۔

ترنم کی عدت ختم ہو جاتی ہے۔ ماں اسے کہتی ہے کہ وہ کچھ ہار سنگھار کر لے۔ ترنم اپنے بیٹے کی بسم اللہ کرنے کے لیے کہتی ہے۔

جمال فون سن کر زرد پڑ جاتا ہے۔ وہ نائلہ سے کہتا ہے کہ اپنا پرس اٹھاؤ اور چلو۔ وہ نائلہ کو خوب پیدل گھماتا پھراتا آگے بڑھتا ہے وہ کسی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ ایک جگہ جا کر وہ موٹر سائیکل کی پاس رکتا ہے اور اس پر بیٹھے ایک عجیب و غریب حلیے والے لڑکے کو کہتا ہے کہ نائلہ کو محفوظ جگہ پہنچا دے۔ وہ اسے انتہائی نچلے متوسط علاقے کے ایک گھر میں لے آتا ہے اور وہاں ایک عورت آ کر پوچھتی ہے کہ تم کون ہو۔

طلال کے پاس اس کے باپ کا فون آتا ہے کہ وہ ظفر صدیقی والے کیس سے دور رہے کیونکہ ان کے مفادات اس سے وابستہ ہیں۔ جھنڈے والی گاڑی کا خواب طلال کو اس کیس سے دور کر دیتا ہے۔

پریا طلال کی دیوانگی سے تنگ آ جاتی ہے۔ طلال اسے کہتا ہے کہ جو چیز اس کی ہوتی ہے وہ کسی اور کے قابل نہیں رہتی۔ وہ اس کے چہرے پر تیزاب ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ نائلہ کو پتا چلتا ہے کہ وہ جمال کا گھر ہے، راکٹ اس کا بھائی اور وہ لڑکی اس کی بھابھی ہے۔

چنبیلی طلال سے لڑ کر اپنا سامان پیک کرتی ہے۔ طلال اسے مارتا ہے اور دھمکی دیتا ہے کہ باہر نہ جانا۔ چنبیلی انتہائی بری حالت میں کوٹھے پر پہنچتی ہے۔ سب اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

اچانک چنبیلی کی چیخوں سے پورا گھر لرز جاتا ہے۔

چنبیلی کی چیخ سن کر جب سب اس کے کمرے میں پہنچتے ہیں تو اس کا چہرہ تیزاب کی وجہ سے موم بتی کی طرح پگھل رہا

تھا۔

ترنم کا بیٹا سپارہ پڑھنا شروع کر رہا ہے۔ ترنم بہت خوش ہے۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ اپنے بارے میں بھی کچھ سوچ وہ اسے شیخ صاحب کا بتاتی ہے۔ ترنم کہتی ہے کہ میں اپنے دونوں بچوں کو نہیں چھوڑوں گی۔

سومی، نائلہ کو بتاتی ہے کہ جمال پہلے یہاں ہی رہتا تھا۔ چھ مہینے پہلے گیا ہے اور وہ راکٹ کا بڑا بھائی اور اس کا جگری ہے۔ راکٹ کے آنے پر بات ٹل جاتی ہے۔

جھمکا جان طلال کے خلاف ایف آئی آر درج کراتی ہے۔ چاچا اسے سمجھاتا ہے کہ پرچہ تو کٹ جائے گا مگر طلال کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

عائشہ جس اسکول میں پڑھاتی ہے وہاں کچھ طلبا آ کر ان کا سامان اٹھا کر پھینکتے ہیں اور انہیں ڈرا دھمکا کر جاتے ہیں۔

مانی کے لیے یہ بات انتہائی صدمے کا باعث تھی کہ شاہ زین کے گھر والوں نے اس کے قاتلوں سے مذاکرات کر کے کیس ختم کر دیا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے ذوہیب اپنی امی سے باتیں کر رہا تھا عائشہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی کہ اچانک ذوہیب ماں کی آواز پر چونکتا ہے وہ بتاتی ہیں کہ ان کے پیٹ میں شدید درد اٹھا ہے۔ ذوہیب عائشہ سے کہتا ہے کہ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ خالہ کی حالت پر عائشہ خود پریشان ہو جاتی ہے۔

پندرھویں قسط

اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا، اس نے ایک بار پھر ویڈیو دیکھی میسج پڑھا۔

"اس چوہیا کی یہ ہمت؟ دماغ الٹ گیا ہے حرام زادی کا مجھ سے پنگا لے کر خودکشی کرنا چاہ رہی ہے۔"

طلال کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ باپ کی ساری نصیحتیں، اس کے دماغ سے نکل گئی تھیں، بے پناہ غصہ اور پریا کو نیست و نابود کرنے، کچل کر پھینک دینے کا جنون ایک دم ہی اس میں در آیا، موبائل کو پوری طاقت سے ایک طرف پھینک دینے کی منہ زور خواہش پہ اس نے بمشکل قابو پایا۔

یہ ویڈیو پریا کے بیڈ روم کی تھی جہاں ملک کے خاص الخاص کارندے نے اسے ڈرا دھمکا کر نکاح نامے پہ دستخط لیے تھے۔ وہ پوری ریکارڈنگ اسے پریا کے علاوہ کون بھیج سکتا تھا؟ طلال کا ذہن سارے تانے بانے بن رہا تھا، انہیں جوڑ رہا تھا۔ اسی غصے کے عالم میں اس نے وہ نمبر ملایا جس سے میسج اور ویڈیو موصول ہوئی تھی، مگر ظاہر ہے کہ وہ نمبر اسے بند ہی ملنا تھا سو بند ہی ملا، اسی جھنجلاہٹ میں اس نے دوسرا نمبر ملایا۔

"جی سر!" دوسری طرف موجود شخص کا لہجہ بہت مودب تھا۔

"حضور بخش، مجھے ایک ویڈیو میسج بھیجا گیا ہے، میں تمہیں سینڈ کر رہا ہوں۔ نمبر کا سراغ لگاؤ اور ذرا اس کا بھی پتا لگاؤ، ہماری کتیا رانی کہاں ہے؟ اس کی قبر کی جگہ تیار رکھنا، خود اپنے ہاتھوں سے دفن کروں گا۔"

طلال کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو خود کو گھورنے والے کی آنکھیں نکال لیتا تھا، اپنی طرف انگلی اٹھانے والے کو انگلی اور ہاتھ سے ہی نہیں بلکہ زندگی سے محروم کر دیتا تھا۔ پھر اسے بلیک میل کرنے کی جرأت؟ طلال کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یہ ہمت دکھانے والے کو زمین میں زندہ گاڑ دے اور سراغ

اس وہ یہی کرنے والا تھا۔

☆☆☆

انتظار کا موسم کتنا طویل ہوتا ہے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ انگلیوں کو اتنا چٹخایا تھا کہ وہ دکھنے لگی تھیں۔ کبھی اس کی ہراساں نظریں چھت اور در و دیواروں کو، ساز و سامان کو کھوجنے لگتیں جیسے ان میں کہیں چھپا ہو، اس کی خوشی، سکون اور اطمینان کا بھید، مگر کہیں کچھ نہیں تھا سوائے ایک خاموش انتظار کے۔

"کیا یہی ہے میرے مقدر میں؟" وہ خوف زدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

عین اس وقت درواز کھلا اور ایک عورت اندر آئی، موٹاپے کی طرف مائل فربہ بدن، چہرے کے نقوش اگرچہ جاذب نظر تھے مگر میک اپ کے باوجود بھی، چہرے پہ ایک عجیب قسم کی سختی اور کرختگی تھی۔ اس کا لباس بہت عمدہ تھا اور اس کے ساتھ میچنگ کے زیورات پہن رکھے تھے۔

"کون ہے تو؟" اس کی آواز بھی اس کے چہرے کی طرح تھی کچھ کرخت اور کچھ بیٹھی ہوئی سی، وہ یک ٹک نائلہ کو گھور رہی تھی اس کے اس طرح دیکھنے پر نائلہ کو اچانک ڈر لگنے لگا۔

"میں نائلہ ہوں۔" اس نے تھوک نگلا، خوف، بے بسی، ناامیدی سب مل کر اک دم ہی حملہ آور ہوئے تھے۔

"تو نائلہ ہے۔" وہ ایک قدم اور آگے آئی، اس کی آنکھوں میں پتا نہیں کیوں حیرانی تھی۔

"جمال کے ساتھ آئی ہے؟" وہ سوال پہ سوال کر کے نہ جانے کیا تصدیق کرنا چاہ رہی تھی۔

"جمال کہاں ہے؟" اس بار ہمت کر کے نائلہ نے سوال کر لیا۔

"چلا گیا۔" وہ جواب دے کر صوفے پہ جیسے گر سی گئی اس کی تیز اور سوالیہ نظریں، نائلہ پر گڑی ہوئی تھیں۔

"کہاں گیا؟ مجھ سے ملے بغیر؟ خدا حافظ کہے بغیر؟" نائلہ کی ٹانگیں کانپنے لگیں، اسے لگا کہ اگر فوراً کوئی سہارا نہ ملا تو وہ گر جائے گی اس نے مضبوطی سے صوفے کی ہتھی پکڑی۔

"بیٹھ جا۔" جھمکا کی آواز میں کچھ نرمی در آئی۔

"وہ جلدی میں تھا، اس لیے چلا گیا۔" جھمکا کی نگاہیں اب بھی اس کے نقوش ٹٹول رہی تھیں، اس کے اندر تک جھانک رہی تھیں، نائلہ کو ان تفتیشی آنکھوں سے الجھن ہونے لگی، اس نے پہلو بدلا۔

اب اور کتنا انتظار؟ اس کے خیال کی رو جمال تک پہنچی، آنکھوں تک آتی نمی اسے محسوس ہوئی اور گلے میں اٹکتا کوئی گولہ بھی۔

"شوہر سے بھاگ کر آئی ہے؟" جھمکا کا سوال تھا کہ چابک بغیر کسی لحاظ اور رعایت کے، شڑاپ سے پڑا تھا۔ اضطراب کے عالم میں اس نے اپنے ہاتھ جکڑے۔

"کیوں چھوڑا اپنے مرد کو؟" دوسرا چابک پڑا، نائلہ بل کھا کر رہ گئی، اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر حلق سے آواز نہیں نکلی۔

"شرابی تھا؟ جواری تھا؟ مار پیٹ کرتا تھا؟ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا تھا؟ کماتا نہیں تھا؟" جھمکا کے تابڑ توڑ سوالات پر اس کا سر بے اختیار نفی میں ہلا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ بس ایک ہی خرابی تھی اس میں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد زہرخند لہجے میں گویا ہوئی۔

"کوئی شریف انسان تھا اور تیرے اندر کی بری عورت کو کوئی بدمعاش چاہیے تھا۔" بولتے بولتے جھمکا کا لہجہ اتنا زہریلا ہو گیا کہ نائلہ کو اپنا آپ نیلو نیل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

"چپ ہو جاؤ، خدا کے واسطے۔" نائلہ کی آواز، آواز نہیں سسکی بن کر نکلی تھی۔

☆☆☆

خواب گاہ، نسبتاً بڑی تھی، بہت وسیع و عریض اور عالی شان سجاوٹ نہیں تھی نہ ہی بیش قیمت آرائش و زیبائش مگر نفاست اور قدامت کا امتزاج لیے ساز و سامان اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا تھا۔

پرانی طرز کی بھاری سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے ہاتھوں کا مساج کرتے کرتے انہوں نے آئینے میں نظر آتے اپنے شوہر کا عکس دیکھا اور ایک خیال آتے ہی وہ بیٹھے بیٹھے گھوم گئیں۔

''آپ نے مانی سے بات کی؟''

''کون سی بات؟'' گردش رنگ چمن میں محو، اس وقت تو وہ اپنے آپ کو بھی بھولے بیٹھے تھے، کوئی اور بات کیسے یاد آتی۔

''آپ پہلے کتاب بند کریں پھر بات کریں۔''

''کوئی ضروری بات ہے کیا؟'' شریک حیات نے بادل نخواستہ کتاب سے سر اٹھایا۔

''بہت ضروری ہے۔'' عالیہ بیگم کے حرکت کرتے ہاتھ اب رک چکے تھے۔

''ارشاد ہو۔'' انہوں نے کتاب بند کر کے رکھی۔

''سلمٰی آپا ہیں نا، فاروق ماموں کی بڑی بیٹی۔'' انہوں نے تمہید باندھی۔

''جی، جی آپ کی وہی کزن جن کے شوہر اور بیٹے بہت مشہور اور کامیاب بزنس مین بن چکے ہیں۔''

''شکر ہے آپ کو یاد ہیں۔ انہوں نے ایک فیملی کا ذکر کیا ہے ہیں تو وہ بھی بزنس مین مگر خاندانی ہیں، انہیں اپنی بیٹی کے لیے ایسا ہی گھرانہ چاہیے، شریف اور خاندانی، جو بے شک بہت دولت مند نہ ہو مگر لالچی بھی نہ ہو، وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر ہم کہیں تو لڑکی کے والدین سے ہماری ملاقات کروا دیں گی۔'' عالیہ بیگم نے تفصیل بتائی۔

''آپ جانتی ہیں، آپ کے بیٹے کی مرضی کہاں ہے پھر بھی ......''

''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' وہ جھنجھلائیں۔

''نوجوانی میں ہر چہرہ اچھا لگتا ہے، مگر اب وہ سمجھ دار اور باشعور ہے۔ کب تک ایک سراب کے پیچھے بھٹکتا رہے گا اور ویسے بھی آپ میرا مزاج جانتے ہیں۔ میں کسی بھی ایسے ویسے خاندان میں اپنے بیٹے کی شادی نہیں کروں گی۔ مجھے دولت کا، حسن کا، اسٹیٹس کا، کسی شے کا کوئی لالچ نہیں مگر بس حسب نسب ہونا چاہیے۔ ہڈی اور خون کی تاثیر نسل در نسل کی تعمیر کرتی ہے۔''

عالیہ بیگم کے خیالات میں آج بھی کوئی لچک، کوئی لوچ نہیں تھا۔ شریک حیات بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

''ویسے دنیا کے ہر انسان کا شجرہ نسب ایک ہی پیغمبر سے جا ملتا ہے۔'' انہوں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے بیگم کو دیکھا۔

''اب آپ بحث پہ اتر آئے۔'' وہ جھنجھلائیں۔

''آپ نے بھی تو ایک طرح کی ضد باندھی ہوئی ہے۔'' وہ ملائمت سے بول رہے تھے۔

''ضد کی بات نہیں ہے، اصول کی بات ہے، ہماری روایات اور قدریں ہیں اگر ہم انہیں چھوڑ دیں تو شاید ہمیں بھی کوئی فرق نہ پڑے، کسی بھی کرپٹ یا رشوت خور خاندان سے رشتہ جوڑ لیں یا محض شکل دیکھ کر کسی بھی ایسے ویسے لوگوں سے ناتا جوڑ لیں۔'' عالیہ بیگم کے پاس اپنے موقف کے لیے دلائل موجود تھے۔

''ہم کسی کے اعمال کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مگر بیٹے کی مرضی اور خوشی تو دیکھنی پڑے گی نا۔''

''آپ کا کام ہے بیٹے کو سمجھانا، نہ کہ اس کی باتوں میں آنا۔''

''باتوں میں آنے کی بات نہیں ہے، اولاد کی خوشی اہم ہوتی ہے، بیٹیوں کی بھی مرضی پوچھی تھی، رائے لی تھی۔''

''انہوں نے تو ہم پہ چھوڑا ہوا تھا سب کچھ، اچھی طرح دیکھ بھال کے ہی ایک کی شادی اور ایک کی منگنی کی ہے۔'' عالیہ بیگم نے ان کی بات کاٹی۔

''آپ نہ بات کو سمجھ رہی ہیں نہ معاملے کی نزاکت کو، آپ کے خیال میں، مانی ایک چھوٹا سا بچہ ہے جس کا ہاتھ پکڑ کر ہم جہاں چاہیں گھما دیں؟''

''آپ سے کچھ کہا ہے اس نے؟''

''آپ کچھ عرصہ ٹھہر نہیں سکتیں؟'' انہوں نے بیگم کے سوال کا جواب گول کیا۔

''کچھ عرصہ، کتنا عرصہ؟ اب وہ اسٹیبلش ہو گیا ہے۔ ماشاء اللہ اپنا ایک نام اور پہچان بنا چکا ہے آگے ان شاء اللہ اور بھی ترقی کرے گا، یہی عمر ہے شادی کی، کیا اس کے بوڑھے ہونے کا انتظار کروں؟''

انہوں نے ایسے ہونہار قابل بیٹے پہ فخر کرتے کرتے دوٹوک لہجے میں بحث کا خاتمہ کیا۔

☆☆☆

کئی ہفتوں بلکہ مہینوں کے بعد وہ آج چھٹی کے دن گھر پر تھا۔ صبح کی نماز پڑھ کے وہ واپس آیا تو ترنم چائے دم پہ لگا کے اس کی منتظر تھی۔

''میں تو چائے زیادہ نہیں پیتا، آپ اتنی تکلیف نہ کیا کریں۔'' چاند کے انداز میں رکھائی نہیں تھی، بالکل اجنبیت بھی نہیں تھی، مگر اپنائیت اور گرم جوشی بھی نہیں تھی۔ بس ایک عجیب سی لاتعلقی تھی۔

''ناشتہ بنا دوں؟''

''ٹھہر کے کروں گا۔''

''اچھا، چل یہ بتا دے کیا کھائے گا آج ناشتے میں؟'' ترنم ہمیشہ کی طرح واری صدقے ہو رہی تھی۔

''انڈا اور سلائس۔'' اس نے پانچ سالہ حل شدہ پرچہ جات کی کتاب اٹھائی اور رجسٹر نزدیک کھسکا لیا۔ حساب کے پیپر سے وہ سوالات کی مشق کر رہا تھا۔ میٹرک میں اس کا حساب کا پیپر چند نمبروں کی کمی سے رہ گیا تھا۔ سپلیمنٹری امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔

زندگی بہت مصروف ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تو دکان پر ہی ہو جاتی جہاں وہ خراد مشین کا کام سیکھ رہا تھا۔ دن میں کم از کم ایک بار مولوی صاحب کے پاس بھی حاضری لگاتا تھا کبھی رات میں کبھی صبح میں پیپر کی تیاری کرتا تھا۔

''میں نے تو کہا تھا کہ کوئی استاد رکھوا دیتی ہوں، بغیر کسی کی رہنمائی کے کوئی بھی امتحان پاس کرنا بڑا مشکل ہے؟'' ترنم نے اسے کتاب پر سر جھکائے دیکھا تو ہمدردی سے کہنے لگی۔

''زندگی سے بڑا استاد کوئی نہیں، سب کچھ سکھا دیتا ہے انسان کو۔'' چاند بابو سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

''کتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگا ہے، بڑا ہو گیا ہے میرا بیٹا۔''

ترنم نے کچھ فخر سے اور کچھ ڈر سے بیٹے کو دیکھا، جو قد کاٹھ نکال کر اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا اس کی سنجیدگی اور شعور بھی وقت سے پہلے ہی پروان چڑھ گئے تھے۔

کھلی کتاب اور حل کرتے کرتے ادھورے سوال کو چھوڑ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، چائے کا مگ لے کر بالکنی میں کھڑا ہو گیا جو چوڑی سڑک کے رخ پہ کھلتی تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ابھی صاف شفاف اور پٹرول و ڈیزل کی بو سے پاک تھے۔ ابھی سڑک پر ٹریفک کی روانی اور لوگوں کی چہل پہل میں کچھ وقت تھا۔ گھونٹ گھونٹ چائے پیتا ہوا وہ سرمئی غبار کو دھیرے دھیرے سویرے کی سفیدی میں بدلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

''بعض سیاہ و سرمئی غبار ایسے ہوتے ہیں جن کے سفیدی میں بدلنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔''

دور افق پہ اڑتے پرندوں کی جانب اس کی نگاہیں بھٹک رہی تھیں۔

☆☆☆

ایک ایک کر کے ہینگر میں لگے کپڑوں کا باریک بینی سے معائنہ کر رہی تھی۔ نفیس کڑھائی، عمدہ سلائی، رنگوں کا امتزاج منفرد بھی تھا، حسین بھی۔

"کتنے پیارے سوٹ بنے ہیں، ہیں نا؟" ماریہ کے صبیح چہرے پر خوشی اور کچھ کچھ فخر کی چمک تھی۔

"اپنی محنت اور تخلیق پہ ہر ایک کو ناز ہوتا ہے۔" شاہ میر مسکرایا۔

"کیوں نہیں، اگر ہم اپنے کام پہ ناز نہیں کریں گے تو دیکھنے والے کیسے سراہیں گے؟"

"یہ بھی ہے۔" شاہ میر نے سر ہلایا۔

"صلاحیت ہو، ہنر ہو یا انسان کا اپنا آپ، کسی کو بھی انڈر اسٹیمیٹ نہیں کرنا چاہیے۔" ماریہ کے ہلتے ہوئے سر کے ساتھ ساتھ اس کی پونی بھی ہل رہی تھی، اپنی بڑھتی ہوئی زلفیں اس نے پھر ترشوالی تھیں پھر لمبے بالوں میں شیمپو کرنا، انہیں سکھانا، سنوارنا اس کے لیے ایک جھنجھٹ سے کم نہیں تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا تم جیسی کاہل لڑکی اپنا بوتیک کیسے سنبھالے گی۔" فردا کو اکثر یہ فکر ستاتی تھی۔

"محبت میں انسان سب کچھ کر لیتا ہے۔ اگر مجھے لمبی لمبی زلفوں سے الفت ہوتی تو میں انہیں سنبھال لیتی، اپنے کام سے مجھے عشق ہے اور سستی کاہلی یا لاپروائی کبھی عشق کے آڑے نہیں آتی۔" گھر کی طرح شاہ میر کے سامنے بھی وہ اپنے خیالات کا بے لاگ اور کھل کر اظہار کر رہی تھی۔

"ہر کوئی تو اپنی نظر میں اتنا اہم نہیں ہوتا، خود کو کچھ یا بہت کچھ۔ سمجھنے والا، مغروریت کی طرف بھی جا سکتا ہے۔" شاہ میر نے اس سے نادانستہ نظریں چرائیں، اس سے بڑھ کر خود کو بے کار، فضول، ناکارہ بلکہ حقیر سمجھنے والا دنیا میں شاید کوئی اور نہیں تھا۔

"وہ تو الگ ہی کیٹگری ہوتی ہے، ایسے لوگ تو پستول بھی نہ ہوں تب بھی خود کو توپ سمجھتے ہیں۔" ماریہ نے اپنی دلکش ناک چڑھائی۔

اس لمحے وہ بہت انوکھی لگی۔

سنبھل کے شاہ میر تمہارے لیے ممنوعہ راستے ہیں سب۔

خود کو تنبیہ کرتے ہوئے اس نے سر جھٹکا، جادو اثر لمحے کا طلسم بکھرنے لگا، ویسے بھی یہ لڑکی محبت پہ کوئی خاص یقین نہیں رکھتی اور قائل تو میں بھی نہیں اس جذبے کا، بلکہ اس جذبے کے قابل بھی نہیں۔ اپنے آپ پہ ہمیشہ کی طرح ترس کھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں گلابی سی دھند جمع ہونے لگی۔

ماریہ اس کی طرف دیکھے بغیر، اس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر، ملبوسات دیکھتے ہوئے زور و شور سے تبصرے میں مصروف تھی۔

☆☆☆

مخصوص ریسٹورنٹ میں وہ کونے والی میز تھی جہاں وہ ہمیشہ ہی سال میں ایک بار آ کر بیٹھتی تھی۔ اس بار سال ابھی پورا ہونے میں ایک ماہ باقی تھا مگر اس بار اس نے جلدی پیغام بھجوایا تھا۔

"کیا بات ہے اب کی دفعہ جلدی آ گئی؟ سب خیریت تو ہے نا۔" چاچا نے بغور اسے دیکھا، ستا ہوا چہرہ، تھکی تھکی بوجھل آنکھیں، ہلکی گلابی لپ اسٹک میں چہرے کی زردی نمایاں ہو رہی تھی۔

"ہاں خیریت ہی ہے بس یونہی۔" اس کی دھیمی آواز سے بھی تھکاوٹ جھلک رہی تھی۔

"کیسا ہے شاہ میر؟"

"ٹھیک ہے، کام کر رہا ہے۔ بہت مصروف رہنے لگا ہے۔"

"ہاں، مجھے پتا چلا تھا، عبدل نے بتایا تھا، کسی لڑکی کے ساتھ مل کر بوتیک کھولا ہے۔" جھمکا خفیف سا مسکرائی۔

"تیرا جاسوسی کا نیٹ ورک ابھی تک چل رہا ہے؟ بڑا دم ہے تجھ میں۔" چاچا نے پلیٹ سے بسکٹ اٹھا کر چائے میں ڈبویا۔ وہ ویٹر رکھ گیا تھا۔

"دیکھنے والوں کو تو یونہی لگتا ہے کہ بڑا دم ہے مجھ میں، مگر سچ کہوں تو خود کو گھسیٹ رہی ہوں، بس۔" کچھ کہتے کہتے رک کر اس نے موضوع بدل دیا۔

"کیا وہ خوش رہتا ہے اب؟"

"اب کچھ ٹھہراؤ ہے۔ اضطراب اور بے سکونی کم ہو گئی ہے۔ شکوے شکایات بھی کم ہو گئے ہیں، خوشی کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" چاچا نے سوچ سوچ کر کہا۔

"اور، تو سنا کیسا چل رہا ہے سب؟" چاچا نے سوال کیا۔

"جیسا تھا، ویسا ہی چل رہا ہے سب کچھ، فٹے منہ۔" جھمکا نے برا سا منہ بنایا۔

"بڑی بی کے کیا حال ہیں؟"

"وہی، پہلے کی طرح، وہ کون سے پیغمبر تھے جن کا بیٹا ان سے جدا ہو گیا تھا اور وہ رو رو کر نابینا ہو گئے تھے؟" جھمکا نے اچانک سوال کیا۔

"وہ حضرت یعقوب علیہ اسلام اور ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ اسلام۔" چاچا نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں، تو یہ بڑی بی بھی ایک روز شاید اپنی جان ہی کھو بیٹھیں اس غم میں۔" جھمکا کے چہرے پہ ایک تاریک سایہ لہرایا۔ "یہ دکھ بالآخر انسان کو مار ہی ڈالتے ہیں، کبھی اندر سے، کبھی باہر سے۔"

"تو چاہے تو وہ شاید اس دکھ سے باہر نکل سکتی ہیں۔"

"تقدیر نہیں چاہتی، میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"تقدیر پہ الزام مت دھر، تو نے خود بتایا تھا کہ......"

"چھوڑو چاچا رہنے دو؟" جھمکا نے ان کی بات کاٹی۔

"جتنی محبت کی تھی اتنا ہی غم بھی سہنے دو، میں اسے یہاں لا کر کٹہرے میں کیوں کھڑا کروں؟ غلط تو شاید وہ بھی نہیں تھا۔ ایک عزت کی زندگی تو ہر انسان کا خواب ہوتی ہے اور اس کا حق بھی۔"

"ماں کا حق تو سب سے پہلے، سب سے زیادہ ہے۔" چاچا نے دلیل دی۔

"جانے والے کو احساس نہیں جس بات کا۔ اس میں کیا کر سکتی ہوں میں؟"

"تیرے اندر غم و غصہ ہے، شکایت ہے، بدلہ لے رہی ہے ماں سے؟"

چاچا نے ایک جملے میں اسے سر سے پاؤں تک ادھیڑ کر رکھ دیا اگر باہر لوگوں کے درمیان نہ ہوتی تو یقیناً بکھر ہی پڑتی، بڑی مشکل سے اس نے خود پہ قابو پایا، اپنی سرخ ہوتی متوحش نگاہیں اس نے چاچا پہ مرکوز کیں۔

"کیا مجھے حق نہیں اس کا؟ زیادتی تو میرے ساتھ بھی ہوئی تھی۔"

☆☆☆

انسانوں کے درمیان دل نہ بہلا تو وہ گھوڑوں کے فارم پہ آ گیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک عربی النسل، مشکی، ابلق ایرانی گھوڑے اور گھوڑیاں کئی سائیس اور خدمت گار جن کی دیکھ ریکھ میں مصروف تھے۔

طلال موتی کے پاس جا کھڑا ہوا، اس کے پسندیدہ گھوڑوں میں سے ایک، اس نے گھوڑے کا منہ کھولا اور مٹھی بھر بادام اس میں ڈال دیے۔ جتنی دیر گھوڑا منہ چلاتا رہا طلال اس کی ایال کے بال سہلاتا رہا قریب ہی ایک گھوڑے کو مالش کرتے خدمت گار نے حسرت بھری نگاہوں سے اس طرف دیکھا۔ اتنا خشک میوہ اس کی سات پشتوں نے بھی

کبھی اپنی پوری زندگی میں نہیں کھایا تھا جتنا اس فارم پہ موجود یہ جانور ایک دن میں کھا جاتے تھے۔

واہ میرے اللہ، تیرے کھیل نرالے ہیں دو وقت کی روکھی سوکھی کھانے کے لیے ہم ان جانوروں کو وہ چیزیں کھلاتے ہیں جو ہم خواب میں بھی نہیں کھا سکتے۔" دل ہی دل میں سوچ کر ایک تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پہ آئی۔

"ہاں بھئی حضور بخش، کیا خبر ہے پھر؟" ایال کے نرم بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ حضور بخش سے مخاطب ہوا۔

"چڑیا اپنے پنجرے میں نہیں ہے کہیں اور گھونسلہ بنایا ہے تلاش جاری ہے، مل جائے گا یہ گھونسلہ بھی اور قابو کر لیں گے چڑیا کو بھی۔"

"پر کب ملے گا؟ تب تک میں اس کی فرمائش کے مطابق اس کا اکاؤنٹ بھرتا رہوں؟"

"سب جگہ بندے پھیلا دیے ہیں سرجی، جس کونے میں بھی چھپی ہوگی، مل جائے گی۔"

"مستقبل کی باتیں مت کر حضور بخش، میرے کان ابھی کی بات سننا چاہتے ہیں حال کی، کہ وہ مل گئی ہے۔" طلال نے تیز لہجے میں بولتے ہوئے آخری لفظ پہ زور دیا۔

"ہتھیلی پہ سرسو کیسے جمے گی سرجی! جال بچھایا ہوا ہے پرندے کے آنے اور پھنسنے کا تھوڑا انتظار تو کرنا پڑے گا نا۔" حضور بخش نے اپنی نوکیلی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"یہ انتظار ہی تو غضب ہے۔" طلال نے ایک ہاتھ کا مکا بنا کر اپنی دوسری ہتھیلی پر زور سے مارا۔ "تو نہیں جانتا، میرے اندر کیسی آگ بھڑک رہی ہے، جب تک اس آگ میں اس کتیا کو نا جلا کر بھسم نہ کر دوں میرے اندر ٹھنڈ نہیں پڑے گی، نہ سکون ملے گا۔" بولتے بولتے وہ ایک طرف چلنے لگا۔

"کل ایک بیٹھک رکھی ہے سرجی، علاقے کے بڑے بڑے اور معزز لوگ بھی ہوں گے اور غریب غربا بھی مسائل پر بات ہوگی۔" "آپ کو ایسی باتیں اور ایسے وعدے کرنے ہیں کہ بس آپ کے نام کے نعرے لگاتے ہوئے لوگ اٹھیں۔"

"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے، بابا سے بات ہوئی تھی میری۔" طلال نے بے زاری سے کہتے ہوئے سر جھٹکا، اس کا دماغ تو کہیں اور الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

رات گہری سے گہری ہوتی جا رہی تھی اور نیند تھی کہ آنکھوں سے اتنی ہی اچٹتی جا رہی تھی، عائشہ اٹھ بیٹھی، چادر ایک طرف کی اور چلتے ہوئے دروازہ کھول کر ٹیرس پر آ گئی۔

ماریہ کا نمبر لینے کے باوجود اور چاہنے کے باوجود بھی وہ اسے کال نہیں کر سکی۔ ایک تو پہلے ہی اتنا سوچ سوچ کر اس نے نمبر ملانا شروع کیا مگر پھر مکمل کیے بغیر ہی موبائل آف کر دیا۔

شاید وہ سوچے کہ میں ماریہ کے ذریعے اس تک رسائی چاہتی ہوں؟ بجلی کی طرح یہ خیال ذہن میں کوندا تھا اور اس نے فون ایک طرف ڈال دیا تھا۔

بدگمانی ہے یہ، ناراضی یا احتیاط؟" عائشہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اپنی ہی کیفیات، اپنے ہی محسوسات وہ سمجھ نہیں رہی تھی۔

"کیا حرج تھا، بات کر ہی لیتی ماریہ سے، وہ تو سہیلی ہے۔" اس کے دل کا معصوم سا شکوہ، دماغ نے رد کر دیا۔ کمزور سی انا نے بھی دماغ کی تائید کی، ماریہ سوال کرے گی اس سے اور ضرور کرے گی وہ کیا بتائے گی اسے؟ وہ شخص جو ہواؤں پہ لکھ لکھ کر پیغام بھیجتا تھا جس کا نام پہلی بار دل کے خالی آسمان پہ ستارہ بن کر چمکا تھا، وہ اب......

عائشہ ٹیرس پہ کھڑی سامنے پھیلے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی جس میں کہیں کہیں روشنی کی ایک آدھ جھلک موجود تھی۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اندر سے بالکل خالی ہو گئی ہو، اتنی تنہائی، اتنا اکیلا پن تو اس وقت بھی محسوس نہیں ہوا تھا جب اس کی امی فوت ہوئی تھیں مگر اب شاید اس لیے کہ تب خالہ تو تھیں اسے تسلی دینے کو مگر اب تو کوئی نہیں جس کے کاندھے پہ سر رکھ کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ اسے شدت سے ایک غم گسار کی ضرورت اور طلب محسوس ہو رہی تھی۔

تم بھی عجیب ہو لڑکی، کبھی اکیلے آنسو بہانے کو دل کرتا ہے اور کبھی کوئی ہم دم و ہم ساز چاہیے، جو ان آنسوؤں کو پونچھ دے اپنے لفظوں سے تسلی و تشفی کے پھاہے رکھ دے دل کے زخموں پہ، کوئی اس کے اندر ہولے سے مسکرایا تھا۔

گھپ اندھیرے میں تمتماتی اکا دکا روشنیوں کو اس نے حسرت سے دیکھا۔ زندگی میں اتنا بھی اجالا ہو جائے تو...... تو شاید دل کی بے چینی کو کچھ چین آ جائے۔ اس نے ہوا کے جھونکے اپنے چہرے پہ اپنے وجود پہ محسوس کیے۔

"کیا پتا سب کچھ ٹھیک ہو ہی جائے، ایسا ہی اچھا اختتام جیسا کہانیوں ڈراموں اور فلموں میں ہوتا ہے۔"

دل خوش فہم نے تسلی دینا چاہی اور وہ کمرے میں واپس پلٹی۔

مگر زندگی کوئی ڈھیروں صفحات کا ناول ایک گھنٹے کا ڈرامہ یا تین گھنٹے کی فلم نہیں ہوتی اور ان کا اختتام کبھی طربیہ کے بجائے المیہ بھی ہوتا ہے۔ عقل فوراً آگے آئی اور اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔ تھکی تھکی پژمردہ اور اداس عائشہ خاموشی سے بیٹھ گئی اور جانے کتنی دیر بیڈ کراؤن سے پشت لگائے وہ یونہی بیٹھی رہی۔ جب اس کا موبائل بجنے لگا۔

"اس وقت کون ہے؟" عائشہ نے حیران ہو کر اپنا فون اٹھایا، اسکرین پر زوہیب کالنگ کے الفاظ چمک رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی فون کرتا تھا خیریت دریافت کر کے ہلکی پھلکی دو چار باتیں کر لیا کرتا تھا مگر اس طرح اتنی رات گئے اس نے کبھی فون نہیں کیا تھا۔

"ہیلو!" عائشہ نے متذبذب ہو کر کال اٹینڈ کی۔

"آئی ایم سوری عائشہ، اس وقت کال کر کے یقیناً تمہیں ڈسٹرب کر رہا ہوں مگر بس بات ہی کچھ ایسی ہے کہ میں تمہاری صبح اور یہاں رات ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا۔"

"سب خیریت ہے؟"

"کہاں خیریت ہے، اب پتا چلا کہ دل اک دم سے کیسے اپنے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ میں نے تم سے کہا کہ تھا نا کہ ابھی میں اپنی فیلنگز خود بھی نہیں جانتا مگر جب بھی کچھ محسوس کروں گا تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔" وہ پرجوش ہو کر بول رہا تھا۔

"تو؟"

"تو یہ کہ I am in love مجھے محبت ہو گئی ہے۔"

☆☆☆

اس کا خوب صورت کھلے گلاب سا چہرہ سرسوں کا زرد پھول بن چکا تھا جھمکا کے ساتھ ساتھ وہ چل تو نہیں رہی تھی بس سمجھو کہ گھسٹ رہی تھی۔ کمرے میں واپس آ کر وہ مسہری پہ گر سی گئی۔ اس کے حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے اور جسم سے جان آدھی نکل چکی تھی آدھی باقی تھی اور ایک انسان کے لیے اس سے زیادہ تکلیف شائد کوئی اور نہیں۔

"پانی!" بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

"جا، پانی لے کر آ......" جھمکا کے بولتے بولتے ہی تارا پھرتی سے باہر نکلی تھی۔ پانی کا گلاس نائلہ کے

ہاتھوں میں دیا تو بمشکل اس سے پیا گیا۔ ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے، کچھ پانی پی کر کچھ چھلکا کر اس نے متوحش نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔

''کون ہو تم؟ یہ کون سی جگہ ہے؟''

''سب کچھ دکھا دیا، سب سے ملا دیا۔ پھر بھی یہ سوال؟ ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا کہ تیرا چاہنے کہاں چھوڑ گیا ہے؟'' جھمکا نے حسب عادت تیوریاں چڑھائیں۔

''جمال سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟'' نائلہ نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری۔ پانی پینے کے باوجود بھی زبان اکڑی ہوئی تھی، ہونٹ جیسے تڑخ رہے تھے۔ اس کے حسین چہرے پہ ہراس بھی تھا، بے یقینی بھی اور خوف بھی۔

''خون کا رشتہ ہے۔'' تارا کے میک اپ زدہ چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ نائلہ کی ساتھ ساتھ جھمکا بھی بری طرح چونکی تھی۔

''اسے دیکھتے ہی باجی (جھمکا) کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے تو خون کا رشتہ ہوا نا۔''

تارا کی سنجیدگی قہقہے میں بدل گئی۔ مگر جھمکا نے مسکرانے کی زحمت کرنے کے بجائے اسے گھور کے دیکھا۔

''ہر وقت کامیڈی نہ کیا کر بتیسی بند کرا نی۔'' نائلہ حیران پریشان باری باری دونوں کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''جمال یہیں پیدا ہوا تھا، یہیں پل بڑھ کر بڑا ہوا، پھر یہاں سے بھاگ لیا، سال دو سال میں کبھی چکر لگا لیتا ہے جب اپنی غرض ہو تو ماں باپ تو کب کے فوت ہو گئے نانی ہیں ملوا دوں گی ان سے۔'' جھمکا اپنے مزاج کے برعکس نہ جانے کیوں اس پہ کچھ مہربان ہو رہی تھی۔

''بہری بوا خوش ہوں گی اپنی نئی بہو دیکھ کر۔'' تارا نے لقمہ دیا۔

نائلہ کا دماغ بالکل ماؤف ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟

''جمال بھائی کے سارے دھندے دو نمبر ہیں، زبان بہت میٹھی ہے چکنی چپڑی باتیں کر کے اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔'' تارا نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

''وہ مجھے یہاں کیوں چھوڑ کر گیا ہے؟'' نائلہ کی آواز کانپ گئی۔

''کہہ کر گیا ہے کہ ایک دو مہینے بعد آ کر لے جائے گا، مگر خرچا پانی نہیں دے کر گیا تیرا۔ اس کے بجائے مشورہ دے گیا کہ تجھے بھی کام سے لگا کر تیرا خرچا وصول کر لوں۔'' جھمکا کے انداز میں بے نیازی تھی۔

''بکواس مت کرو، جمال ایسا نہیں ہے، وہ ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔'' نائلہ ہذیانی ہو کر بلند آواز میں چیخی۔

''کیوں نہیں ہو سکتا وہ ایسا؟ اور کیوں نہیں کر سکتا ایسی بات؟'' جھمکا غرائی۔ ''شریف زادہ سمجھتی ہے تو اسے؟''

نائلہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ جہاں دیوار تھی۔ بالکل خالی دیوار، کچھ بھی تو نہیں تھا وہاں نوشتہ تقدیر بھی نہیں۔

☆☆☆

مسکراہٹ، انسان کی فطرت ہو نہ ہو ضرورت، ضرور ہے، جسمانی و دماغی تھکن، اعصابی تناؤ اور ذہنی دباؤ کے جس دور میں ہم زندہ ہیں، ہمارے لیے مسکراہٹ ناگزیر ہے۔ ایک بے ساختہ ہنسی ایک جادو اثر ٹانک ہے۔ ہر دور میں ایک قلیل تعداد ان کی گزری ہے جو اکثریت کو ہنسانے کے جتن کرتے ہیں، یقیناً بہت اچھا کرتے ہیں۔

دوسروں کو ہنسانا آسان نہیں ہوتا۔ محبت طلب کام ہے کبھی جسمانی حرکات سے کبھی لفظوں سے اور کبھی ان دونوں سے، لوگوں کو ہنسانے کے جتن کیے جاتے رہے ہیں۔ جو آج بھی جاری ہیں۔ مگر آج جہاں کئی اور شعبے

گراوٹ اور زوال کا شکار ہیں۔ وہاں طنز و مزاح کا مزاج اور معنی بھی بدلتے جا رہے ہیں۔

مذاق کرنے کے بجائے مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ شخصیات کا بہروپ بدل کر، سوانگ رچا کر نقلیں اتاری جاتی ہیں۔ جس کی اجازت اور گنجائش نہ ہماری معاشرت میں ہے نہ اخلاقیات میں اور نہ ہی مذہب میں، پھکڑپن کی انتہا کو پہنچے مزاحیہ ڈرامے ہوں کرداروں کی فضول حرکات اور مسطحی سے مکالمے، تخلیقی معیار کے ساتھ ساتھ دیکھنے والے عوام کا ذوق اور شعور کی سطح بھی پست ہوتی جا رہی ہے۔

اسٹیج ہو یا ٹی وی۔ اسکرین ہر جگہ مزاح کے نام پر جو کچھ بھی پیش کیا جا رہا ہے اس میں سے بعض تخلیقات ایسی ہوتی ہیں کہ اپنا سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے بعض مزاح ایسے ہیں کہ بجائے ہنسی کے الٹا رونا آتا ہے۔ مزاح کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آٹے میں نمک کے برابر ہونا چاہیے۔

اب ان کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ آٹا کم ہوتا جا رہا ہے اور نمک بڑھتا جا رہا ہے، تبھی لطف کے بجائے کڑواہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ ہنسنا بری بات نہیں، مگر ہر وقت کی ہنسی، پاگل پن کی علامت ہوتی ہے۔ مستقل ہنسنے والے دیوانے کہلاتے ہیں ہمیں ہنسایا جا رہا ہے، ہم ہنس رہے ہیں اور ہنستے ہی چلے جا رہے ہیں، بس ڈر یہ ہے کہ کہیں ہماری ہنسی، ہذیانی نہ ہو جائے۔

☆☆☆

دھوپ اتنی پھیل چکی تھی کہ وہ پوری عمارت ہی سنہری رنگ میں ڈوب گئی تھی۔ اس وقت تک عائشہ کلاس ختم کر کے آفس میں بیٹھ جاتی تھی، ماروی کی والدہ ابھی تک اسپتال میں تھیں، ماروی ان ہی کے پاس تھی۔ آج وہ کچھ دیر کے لیے آفس آئی تھی۔ وہ عائشہ کو اپنی امی کا حال احوال بتا رہی تھی جب مانی بھی وہاں پہنچ گیا۔ اسے ماروی نے کال کر کے بلایا تھا۔

''مجھے ضروری بات کرنی تھی آپ سے، فون پہ بات کرنا، مناسب نہیں لگا۔ فیس ٹو فیس شاید میں ٹھیک سے ایکسپلین کر سکوں۔'' ماروی تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ مستقل اسپتال میں اپنی امی کی پاس تھی۔

''ہاں، ماروی، کہو، کیا کہنا ہے؟'' مانی اس کی طرف متوجہ تھا۔

''بات یہ ہے کہ میری امی پیرالائز ہو گئی ہیں۔ دو چار دن میں اسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گی گھر میں ہم دو ہی بہنیں ہیں، چھوٹی موول میڈیکل کے پہلے سال میں ہے۔ ڈاکٹرز نے امید تو دلائی ہے کہ فزیوتھراپی اور میڈیسنز کے مستقل علاج سے امی ٹھیک ہو سکتی ہیں، تھوڑا بہت چل پھر سکیں گی مگر اس میں وقت چاہیے، کم از کم دو سے تین سال۔'' ماروی نے رک کر مانی اور عائشہ کو دیکھا۔

''اب میرے سوشل ورک کی زیادہ ضرورت میرے گھر میں ہے۔ میں یہاں کی پوری ذمے داری نہیں سنبھال سکتی۔ ایک دو گھنٹے دینے کی کوشش کر سکتی ہوں لیکن اس کا بھی وعدہ نہیں کر سکتی۔''

''اٹس آل رائٹ ماروی! تم اپنی امی کا خیال رکھو، اللہ انہیں جلد از جلد صحت یاب کرے، یہاں کی فکر مت کرو، میں کچھ نہ کچھ مینیج کر لوں گا۔'' مانی نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اسے تسلی دی۔

''اک دم اتنی اچانک یہ سب کچھ ہوا کہ بوکھلا گئی، اپنی اتنی ایکٹو ماں کو بستر پہ یوں لاچار دیکھنا بہت اذیت ناک ہے۔ اپنوں کو کھو دینے کا خوف کتنا ظالم ہوتا ہے مجھے اب اندازہ ہوا۔'' اتنے دنوں سے ضبط کرتی، خود کو سنبھالتی ماروی، اپنے مخلص دوستوں کے درمیان کچھ بکھر سی گئی۔

''ارے...... ماروی تم تو بہت بہادر ہو، پھر یہ آنسو۔'' مانی اس کے بہتے بے قابو آنسو دیکھ کر بوکھلا گیا۔

''اپنوں کو کھو دینے کا خوف بہت ظالم ہوتا ہے اور اپنوں کو کھو دینے کا غم اس سے بھی زیادہ برا، میں یہ غم سہہ چکی ہوں، اللہ تعالیٰ تمہیں اس غم سے محفوظ رکھے، یہ ٹھنڈی چھاؤں تمہارے سر پہ سلامت رکھے۔'' عائشہ، ٹشو پیپر

سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ حزن وملال کے پھیلتے سائے بتا رہے تھے کہ اس وقت اسے شدت سے اپنی امی کی یاد آئی ہے۔

☆☆☆

شام کی سبک اور قدرے خوشگوار ہوا درختوں، پودوں اور پھولوں سے اٹھکیلیاں کرتی گزر رہی تھی۔ چھٹی کی ایسی شام میں اور شریک سفر کا ایسا ساتھ، روز روز نہیں ملتے تھے یہ مواقع، لان میں کرسیوں پہ بیٹھے دونوں میاں بیوی اپنے ایک ایک لمحے سے ایک دوسرے کی ہمراہی کی خوشی کشید کر رہے تھے۔ ملازمہ ابھی ابھی تلے ہوئے گرم گرم کباب رکھ گئی تھی۔ جن کی اشتہا انگیز مہک فضا میں پھیل رہی تھی۔

ارباب خان نے کباب کا ٹکڑا کانٹے کی مدد سے منہ میں رکھا اور منہ چلا کر ذائقے کا لطف لینے لگے۔ وہ قریباً پچپن چھپن برس کے ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ باقاعدگی سے ورزش اور صحت بخش عمدہ غذاؤں نے انہیں ابھی تک کسی بھی سنجیدہ تکلیف یا بیماری سے دور رکھا ہوا تھا۔ خوشحالی اور کامیاب زندگی ان کے چہرے پہ چمک بن کر بکھری ہوئی تھی۔ بال جھڑ جھڑ کر جب سر آدھا گنجا ہو گیا تو انہوں نے خود ہی پوری ٹنڈ کروا لی اور اب کافی عرصے سے باقاعدگی سے ان کا یہی اسٹائل تھا مگر اس ٹنڈ نے ان کی جاذبیت اور کشش میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔

امریکہ میں جب وہ زوہیب کے ساتھ تھے تو دونوں باپ بیٹے اپنا "لک" ایک جیسا رکھتے تھے، کبھی دونوں کی صرف مونچھیں ہوتیں، کبھی داڑھی کے ساتھ، کبھی کلین شیو تو کبھی فرنچ کٹ، ایک بار زوہیب نے ابراہام لنکن کے انداز کی داڑھی رکھی تھی۔

"اب ہٹلر کٹ مونچھیں نہ رکھ لینا، اس میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گا۔" انہوں نے بیٹے کو وارننگ دی جسے وہ ایک قہقہے میں اڑا گیا تھا۔

"زوہیب کے کیا ارادے ہیں؟" بیٹے کا خیال آتے ہی انہیں کچھ یاد آ گیا تھا۔

"آپ پوچھیے نا، میں تو جب بھی کچھ کہتی ہوں یا پوچھتی ہوں، ٹال جاتا ہے۔" بیگم نے گیند ان کے کورٹ میں ڈال دی۔

"میری کل بات ہوئی تھی، کہہ رہا تھا کہ بہت جلد آ کر گڈ نیوز دوں گا۔" انہوں نے کانٹے کی مدد سے پورا کباب ختم کر لیا تھا۔ گلاس میں اورنج جوس انڈیلنے لگے۔

"اور کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں، میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا، تمہیں معلوم تو ہے اس کا مزاج جب اپنی مرضی ہو گی تبھی کچھ بتائے گا، ورنہ اس کا منہ کوئی نہیں کھلوا سکتا۔" جوس پیتے ہوئے وہ مسکرائے۔

"خدا کرے کہ اس بار خوش خبری سنا ہی دے۔"

"یہ بچی اچھی ہے جسے تم بہو بنانے کی خواہش مند ہو مگر کیا یہ زوہیب کے ساتھ موو کر پائے گی؟ آئی مین بہت حد تک سیدھی سادی لگتی ہے۔ زوہیب کا مزاج اور سوچ کافی الگ ہے، اسے کانفیڈنٹ، ایکٹو اور تھوڑی ماڈ قسم کی لڑکی پسند ہے، اس کی ساری فرینڈز میں نے ایسی ہی دیکھی ہیں۔"

ارباب خان اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے، بیٹا کئی برسوں سے ان کے ساتھ تھا امریکہ میں، پہلے پڑھائی پھر بزنس، اپنی بیوی کی نسبت وہ اپنے بیٹے کو زیادہ قریب سے جانتے تھے، اس کے مزاج، پسند ناپسند سے آگاہ تھے۔

"جس قسم کی لڑکیاں وہ پسند کرتا ہے، وہ دوستی کی حد تک تو ٹھیک ہیں مگر ضروری تو نہیں کہ شادی بھی کسی ایسی

ہی لڑکی سے کرے، پھر عائشہ میں کیا کمی ہے؟ خوب صورت ہے، عزت اور محبت کرنے والی بچی ہے۔ شادی کے بعد زوہیب جیسے چاہے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے۔" انہوں نے شوہر کے خدشات دور کرنے کی کوشش کی۔

"عائشہ کی مرضی پوچھی تھی یا بس......"

"ارے بھئی سب کی مرضی اور خوشی دیکھ کر ہی رشتہ کریں گے، کوئی زبردستی کر سکتا ہے آج کی نسل کے ساتھ؟ خصوصاً آپ کے بچوں کے ساتھ؟ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔" انہیں بیٹے کے ساتھ ساتھ بیٹی کا بھی خیال آ گیا۔

"آپ علیزے کو سمجھاتے کیوں نہیں، یہی عمر ہے شادی کی، اب نہیں تو کب کرے گی؟"

"ٹھیک ہے، میں بات کرتا ہوں اس سے، ویسے میں سوچ رہا تھا کہ اس بار اپنی ویڈنگ اینیورسری پہ روم چلتے ہیں یا اسپین۔"

"رہنے دیں پچھلے تین سال سے سن رہی ہوں، کبھی کینیڈا، کبھی روم، کبھی اسپین، کبھی تاج محل دکھانے کا وعدہ کرتے ہیں اور ہر بار اینیورسری یونہی گزر جاتی ہے۔"

"اس بار ایسا نہیں ہو گا۔" ارباب خان کی مسکراہٹ سے ان کا وعدہ جھلک رہا تھا۔

☆☆☆

باہر بھرے پرے بازار کی رونق، چہل پہل اور لوگوں کا ہجوم، سب اپنی جگہ بھرپور طریقے سے موجود تھا۔ مگر دکان کا یہ حصہ اندر ہونے کی وجہ سے نسبتاً خاموش اور پرسکون تھا، بازار کا سارا شور شرابا، یہاں تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ جاتا تھا۔ شاہ میر۔۔۔ نے سلی ہوئی قمیض ماریہ کے سامنے کی۔

"واؤ!" ماریہ نے ہونٹ توصیفی انداز میں گول کیے اور معائنہ کرتے ہوئے وہ آستین دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"یہ اضافہ میں نے کیا ہے، مجھے لگا کہ یہ کلر اچھا لگے گا۔" اس میں شاہ میر تھوڑا جھجک گیا، اس نے ماریہ کے ڈیزائن میں معمولی سی ترمیم کی تھی۔

"تمہارا رنگوں کا شعور زبردست ہے مسٹر پارٹنر، تمہاری یہ صلاحیت گاڈ گفٹڈ ہے۔" ماریہ بے اختیار کہہ اٹھی، شاہ میر اکثر کسی میں ڈیزائن اور رنگوں کے انتخاب میں معمولی سی ترمیم یا اضافہ کرتا اور پیراہن کی خوب صورتی بڑھ جاتی۔

"شکریہ!" شاہ میر نے چمکتی ہوئی شفاف آنکھوں والی اس لڑکی کو دیکھا، جس کی عنایت اور مہربانی کے سامنے یہ لفظ اسے چھوٹا ہی لگتا تھا مگر اس کے علاوہ اور اس سے زیادہ کہنے کے لیے اور تھا ہی کیا؟

"مجھے لگتا ہے کہ تمہاری شاگرد بن جانا چاہیے، مجھے تم سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔"

"آپ تو خود بہت قابل ہیں اتنی باصلاحیت۔"

"ہاں، اب تک تو میرا یہی خیال تھا مگر کچھ چیزیں ہیں جو تم سے سیکھ سکتی ہوں۔ بلکہ سیکھنی چاہئیں۔"

"ماریہ بی بی! آپ اپنی سادگی میں کسی کو بھی آسمان پہ بٹھا دیتی ہیں۔" شاہ میر اسٹول پہ ٹک گیا۔

"اتنی سیدھی سادی نہیں ہوں میں، ہر کسی کو آسمان پہ تو کیا کرسی پہ بھی نہیں بٹھاتی، لیکن تم میں کچھ ہے، دراصل تم خود بھی اپنے آپ سے، اپنی صلاحیت سے، اپنے ہنر سے بے خبر ہو۔"

"بے خبر ہی تو نہیں ہوں، بس یہی مسئلہ ہے۔" شاہ میر کا خیال خیال ہی رہا، لفظوں میں ڈھل کر زبان تک نہیں آیا۔

"کیا ہوا؟" اس کی خاموشی ماریہ کے لیے سوال بن گئی۔

"کچھ نہیں۔" شاہ میر نے سر جھٹکا۔

"ویسے کبھی کبھی میں بھی سوچ میں پڑ جاتی ہوں۔" ماریہ بھی دوسرے اسٹول پہ بیٹھ گئی۔ آنچل سلیقے سے شانوں پر تھا پھر بھی عادتاً اسے سنبھالتے ہوئے خلاف معمول ذرا سنجیدہ دکھائی دی۔

"کیسی سوچ؟"

"یہ جو ہم اتنی محنت کر رہے ہیں اس کا رزلٹ کیا نکلے گا؟"

"آپ کو یقین نہیں ہے خود پہ اور اپنی محنت پہ؟" شاہ میر نے سوال کیا۔

"ہے تو سہی، پھر بھی، ہر معاملے کا دوسرا رخ بھی تو ہوتا ہی ہے، امکان نہ ہو تو دھیان تو آتا ہی ہے۔ بائی داوے تم کیا سوچتے ہو؟" ماریہ کے چہرے پہ ہنوز گھمبیرتا تھی۔

"میں...... میں یہ سوچتا ہوں کہ محنت کا رزلٹ اچھا ملے یا نہ ملے یہ کیا کم ہے کہ وہ سب کرنے کا موقع مل جائے جو انسان سوچتا ہو، جس کے خواب دیکھتا ہو، آپ نے اپنے کام کے بارے میں خواب دیکھا، کوشش کی اور آپ کے لیے راستے بنتے چلے گئے، ہر تنگی، کشادگی میں بدل گئی، اس رستے کی خوشی کو انجوائے کریں گی تو منزل کی ٹینشن کم ہوگی کہ کب ملے گی اور کیا ملے گی۔" شاہ میر شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا، ماریہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"دانیہ سچ کہتی تھی۔" اس نے سر ہلایا۔

"کیا؟" شاہ میر چونکا۔

"یہی کہ تم وہ نہیں ہو جو دکھائی دیتے ہو، اور جو ہو، اس کا کسی کو علم نہیں ہونے دیتے۔"

"میں نے ایک سیدھی سادی بات کہی تھی، آپ گھما پھرا کر بات اور بندے دونوں کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہیں۔" شاہ میر نے کہا۔

"تم ہو کچھ اور مسٹر پارٹنر!" ماریہ نے اتنے یقین سے کہا تھا کہ وہ بے اختیار مسکرا اٹھا۔

"دنیا کا ہر انسان کچھ اور ہی ہوتا ہے، اندر سے کچھ باہر سے کچھ۔" شاہ میر نے کپڑوں کے ہینگر ٹھیک کیے۔

"ٹھیک کہتے ہو شاید، ایسا ہی ہے۔" ماریہ کو کچھ خیال آیا تھا۔

اسے مانی اور عائشہ کا خیال آیا تھا۔ اس روز کی الجھن ابھی تک سلجھی نہیں تھی کہ وہ عائشہ کو دیکھنے کے باوجود رکا کیوں نہیں؟ ماریہ گواہ بھی اور آگاہ بھی، اس کی بے تابیوں سے، بے قراری سے، اس کی تلاش سے، اور جب وہ سامنے آئی تو یہ گریز کیوں؟ رخ دریاؤں نے بدلے ہیں یا انسانوں نے؟ کیا میرا بھائی بھی انہی لوگوں میں سے ہے جو اندر سے کچھ باہر سے کچھ ہوتے ہیں؟

☆☆☆

"اری جوگن، تو بھی لگوا لے، سارا سر کھچڑی ہو رہا ہے۔" اماں کا اشارہ ترنم کی طرف تھا۔ جہاں بالوں کی سیاہی، چاندی ہوتی جا رہی تھی۔

"ہاں لگوا لوں گی۔" ترنم نے ہمیشہ کی طرح ٹال مٹول کی۔

"اب تو گرمیاں آ گئی ہیں، پہلے تو سردی کا بہانہ تھا، ٹھنڈ لگ جائے گی نزلہ ہو جائے گا، زکام ہو جائے گا، میں تو بارہ مہینے لگواتی ہوں، کچھ نہیں ہوا اب تک۔" اماں کی زبان جتنی تیز چل رہی تھی، بہری بوا کے ہاتھ اتنے ہی دھیرے دھیرے، آرام آرام سے ان کے سر میں مہندی لگا رہے تھے۔

"اب تو بیٹا جوان ہو گیا ماشاء اللہ، پہلی کمائی کی مٹھائی بھی بانٹ دی ٹھسے سے رہا کرو۔" بہری بوا مسکرائیں۔

"اونہہ رہ لی بس، خدا جانے کس پہ گئی ہے۔ ایسی مرگھلی باؤلی سی، ہماری تو سات پشتوں میں اب تک ایسی عورت نہیں گزری، دوسرے کو انگلیوں پہ نچانے کے بجائے خود ہی خاک میں ملی جا رہی ہے۔"

اماں کی باتوں پہ ترنم زیر لب مسکرائے جا رہی تھی، اب بیٹے کے حوالے سے کچھ اور ہی ارمان دل میں انگڑائیاں لے رہے تھے۔

کل رات جب چاند نے اپنی پہلی کمائی اس کے ہاتھ پہ رکھی تو وہ فرط جذبات سے آبدیدہ ہو گئی۔

"میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا؟" اس نے سر اٹھا کر اپنے دبلے پتلے لمبے سے بیٹے کو آنسو بھری آنکھوں میں سمویا، جس کے شانوں تک بھی وہ اب بمشکل پہنچتی تھی۔ وہ جذباتی تھی، حد سے زیادہ جذباتی، بیٹا اس کے الٹ تھا سرد مہری کی حد تک کم گو، ماں کے جذبات کی توہین نہیں کرتا تھا مگر پذیرائی بھی نہیں کی بھی، گوشت پوست کے بنے انسان سے زیادہ وہ کبھی کبھی ایک مشین لگتا یا روبوٹ، ایک مشینی انسان، میکانکی انداز میں اپنے سارے امور سر انجام دیتا، مگر ترنم اس میں بھی خوش تھی۔ اس کا بیٹا بڑا ہو گیا۔ کمانے کے لائق اور محنت کر کے کما بھی رہا تھا۔ وہ سنجیدہ تھا، کم گو تھا، بھی الجھا ہوا سا پریشان سا لگتا تو کیا ہوا؟ وہ اس کی لاٹھی تھا، اس کی آنکھوں کی روشنی، اس کے خوابوں کی تعبیر، اس کے سر کی چھاؤں، ترنم نے ڈھیروں مٹھائی منگوا کر سب کو بانٹی تھی۔

☆☆☆

"سرکار، ہم نے ایک چھوٹی سی فرمائش کی تھی، آپ نے اسے پورا کرنے کے بجائے اپنے پالتو...... ہمارے پیچھے لگا دیے، اب آپ کے پاس دو دن کا وقت ہے جو کہا ہے اس پر عمل کریں، ورنہ مجھے یقین ہے کہ یہ ویڈیو بہت جلد وائرل ہو گی۔"

پیغام ایک بار پھر آیا تھا اور طلال کو سر سے پاؤں تک راکھ کر گیا تھا۔

"حضور بخش، تیری سستی اور کاہلی نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا، وہ حرام زادی قابو میں آئے تو اس کی ہڈیوں کا سراغ بھی نہیں ملے گا کسی کو۔" طلال، حضور بخش پہ برس رہا تھا۔

"سر جی، بہت قریب پہنچ چکا ہوں، آپ بے فکر ہو جائیں بس کچھ وقت کی بات ہے پھر شکار آپ کے پیروں کے نیچے ہوگا، چل کر ماریں مار کر چلیں، جیسے آپ کی خوشی۔"

"اور اس کا کیا کروں؟" طلال نے جھنجلا کر موبائل اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"اپنی جان کا صدقہ سمجھ کر وار دیں۔"

"میری جان کیا اتنی سستی ہے جو ان جیسے چوہوں کے ہاتھ میں ہے؟" وہ بھڑک اٹھا۔

"ٹھنڈے ہو کر سوچیں سر جی، شکار کو گھیرنے کے لیے چال چلنی پڑتی ہے ذرا دیر کے لیے خود کو پیچھے لے جانا پڑتا ہے۔"

"نہ ابھی تک نمبر کا سراغ ملا کہ کس کا ہے نہ اکاؤنٹ نمبر کا کچھ پتا چلا، تو بالکل نکما ہو گیا ہے حضور بخش، تو بھی ملا ہوا ہے دشمنوں سے۔" طلال اپنی ساری جھنجلاہٹ اور غصہ اس پر نکال رہا تھا۔

"آپ کا نمک خوار ہوں جی غلام ہوں۔ اگر کوئی شک ہے شکایت ہے تو بے شک گردن کاٹ دیں پر میری وفاداری پہ شک نہ کریں۔" حضور بخش نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"اوئے، میرا دماغ الٹا کے رکھ دیا ہے اس ذرا سی چوہیا نے۔" طلال نے اپنی پیشانی مسلی۔

"میرے ہوتے ہوئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے سر جی، اس سے پہلے بھی مایوس کیا ہے آپ کو؟"

"جو کچھ کرنا ہے جلدی کر، مجھ سے صبر ہوتا ہے نہ انتظار۔" طلال بظاہر تو دھیما پڑ گیا تھا مگر اس کی آنکھوں

میں الاؤ دہک رہے تھے۔

☆☆☆

پیازی اور بسنتی رنگوں کے امتزاج سے بنے پیراہن میں اس کی چمپئی رنگت خوب کھل رہی تھی۔ دوپٹے کو اسکارف کے انداز میں سر پہ لپیٹے وہ لیپ ٹاپ میں ڈیٹا دیکھ رہی تھی، کچھ کام ماروی سمجھا گئی تھی، کچھ اسے کرتے کرتے خود ہی سمجھ میں آ رہا تھا، کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو ماروی فون پہ گائیڈ کر دیتی۔ جب تک کسی اور ورکر کا بندوبست نہ ہو جاتا۔ اسے یہ ذمہ داری نبھانی تھی۔ ویسے تو عائشہ کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا، گھر کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی اس پر، اپنے معاملات میں وہ آزاد اور خود مختار تھی، جو دل چاہے کرے، خالہ نے اسے فری ہینڈ دیا ہوا تھا۔ ویسے بھی وہ عائشہ کی مصروفیات جانتی تھیں اور خود اس کی نیچر کو بھی، انہیں اپنی بھانجی پہ پورا اعتماد تھا پھر اسے وسائل اور سہولتیں بھی مہیا تھے۔

ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں آ جاتی اور واپسی پر بھی وہ لینے آ جاتا، مشکل کوئی نہیں تھی۔ اس کے لیے نہ ہی پریشانی، سوائے اس کے کہ وہ مانی کا سامنا کرنا بھی چاہتی تھی اور نہیں بھی، اپنی حالت پہ اسے رونا بھی آتا اور ہنسی بھی، میں شاید پاگل ہوں تھوڑی سی وہ خود کو ڈانٹتی اور پھر ترس بھی خود پہ آ جاتا۔

کیا ضروری تھا کہ وہ میری زندگی میں آتا؟ اور جب آ ہی گیا تو...... تو یہ سب کیا ہے؟ اپنی لایعنی سوچوں میں الجھ الجھ کر تھک سی گئی، کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

''ہیلو، بیوٹی کوئین!'' حرا نے اس کی بند آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تھا۔

''کن خیالوں میں گم ہو؟'' حرا لنچ ٹائم اسی کے ساتھ گزارتی تھی۔

''اپنے ہی خیالوں میں۔'' عائشہ نے بند آنکھیں کھول دیں۔

''اتنی بڑی اور انسانوں سے بھری دنیا میں کوئی اس قابل نہیں کہ ایک پیاری سی لڑکی کے خیالوں میں آ سکے؟''

''کیا پتا ہم ہی کسی قابل نہ ہوں؟'' وہ مسکائی۔

''تم جیسی لڑکی پہ ایسی باتیں سوٹ نہیں کرتیں۔''

''انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے اور دنیا کی ایک بڑی حقیقت یہ ہے کہ محبت نصیب سے ملتی ہے اور نصیب والوں کو ملتی ہے۔''

''کس گدھے نے دل توڑ دیا تمہارا؟''

''ارے......!'' عائشہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''یونہی ایک بات کہنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ہی مجرم گردانی جاؤں۔''

تم کہتی ہو تو بے گناہ مان لیتے ہیں تمہیں۔'' حرا نے ایک شان سے کہا۔

''اب یہ بتاؤ، لنچ لائی ہو یا باہر سے کچھ منگوانا ہے؟''

''نہیں بھئی، خالہ نے ڈانٹ ڈانٹ کر لنچ دیا ہے اس تاکید کے ساتھ کہ یہی کھانا ہے، باہر سے کچھ نہیں منگوانا، جب سے وہ چھولوں کی کھٹی چاٹ کھا کر گلا خراب ہوا ہے، مجھ پہ بڑی پابندیاں لگ گئی ہیں۔''

''محبت کرتی ہیں خالہ تم سے، خوش نصیب ہو۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' عائشہ نے اعتراف کرتے ہوئے لب بھینچ لیے، اتنی محبتوں کے جواب میں اس نے وہ ریٹرن نہیں کیا، جو ان کی خواہش تھی، اگرچہ انہوں نے اپنی محبت کا کوئی بدلہ تو نہیں مانگا تھا عائشہ سے، پھر بھی اسے خود ہی ندامت اور شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔

''پھر ہو گئیں کسی کے خیال میں گم، تم میری عادتیں نہ اپناؤ، جلدی جلدی کھانا کھاؤ۔'' حرا نے جون ایلیاء کے دو مصرعوں میں تیسرا مصرعہ اپنا بھی ٹانک دیا۔

☆☆☆

گرما گرم بحث اپنے نقطہ عروج پر تھی۔

''میاں، تمہارا یہ جوش اور جذباتیت، تمہاری عمر کا تقاضا ہے، تم جیسے نوجوان جو سچ، سچائی اور صداقت کی رٹ لگائے رہتے ہیں ذرا آنکھیں کھول کر حقائق کا جائزہ تو لیں، آج کے دور میں اور خصوصاً ہمارے جیسے معاشروں میں مکمل سچ اور بالکل سچا سچ صرف ایک ہی فرد بول سکتا ہے وہ جسے خدا نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے بھیجا ہو، مگر اب پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ بند ہو چکا ہے آخری نبی کے بعد سچ کا پرچار کرنا، حق و صداقت کا علم اٹھانا، خود کو سولی پہ چڑھانے کے مترادف ہے، کس میں ہے اتنی ہمت؟''

جلیل صاحب خود چاندی سر لیے بیٹھے تھے مگر نوجوانوں سے زیادہ جذباتی تھے۔

''ہر کوئی اپنی مرضی کا سچ بولتا ہے۔'' مانی نے لب کشائی کی۔

''جی نہیں، بعض افراد دوسروں کی مرضی کا بھی سچ بولتے اور لکھتے ہیں اور اس کی بہت اچھی قیمت بھی وصول کرتے ہیں۔'' سلیم الدین نے مداخلت کی۔ ''حق و سچ کی آواز بلند کرنا کسی بھی دور میں آسان کام نہیں رہا۔ مگر ہر دور میں ایسے لوگ رہے ہیں جنہوں نے حق کی آواز بلند کی ہے بے شک وہ قلیل تعداد میں ہوں، آپ ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے نہ ہی ان کا انکار کر سکتے ہیں۔''

مانی نے جلیل صاحب کو بطور خاص مخاطب کیا جو ہر معاملے، ہر بات کا تاریک پہلو دیکھنے کے عادی اور دکھانے میں ماہر تھے۔

''آج کون ہے یہ قلیل تعداد، آپ نشان دہی کر سکتے ہیں؟'' جلیل صاحب نے اپنے چاندی رنگ بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے طنزیہ انداز اختیار کیا۔

''ہم بتائیں بھی تو آپ کہاں ماننے والے ہیں صاحب! آپ کی عینک اور ہماری نگاہوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔'' سلیم الدین نے لطیف لہجے میں طنز کیا۔

''آپ اور آپ جیسے افراد خوش فہمیوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے بلی کا خطرہ ٹل نہیں جاتا جو گھات لگائے بیٹھی ہے۔ سارا نظام گل سڑ چکا ہے۔ سب کچھ ختم ہے اندر سے، بس اوپر اوپر کی شوشا ہے، آپ دیکھ لیجئے گا، یہ ملک قائم نہیں رہنے والا، ٹکڑے ٹکڑے۔'' ان کی بات منہ میں ہی رہ گئی، مانی فوراً بول پڑا۔

''ٹھیک ہے جناب، بحث کا اختتام یہیں پہ ہوتا ہے۔ اب آگے مزید کچھ نہیں۔'' اس قسم کی باتوں پہ اسے افسوس بھی ہوتا تھا اور غصہ بھی آتا تھا۔ دنیا بھر کے ترقی یافتہ ممالک سے لے کر پسماندہ ممالک تک ہر جگہ مسئلے مسائل موجود ہیں کہیں کم، کہیں زیادہ اور کہیں بہت زیادہ، مگر لوگ ان مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کہیں بھی ملک ٹوٹنے کی باتیں نہیں ہوتیں، سوائے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے۔''

''مدثر میاں، پورا سچ لکھنے کی جرات تو تمہیں بھی نہیں ہے اور اگر یہ جرات کر بھی لو تو چھاپنے کی ہمت کون کرے گا۔'' جلیل صاحب کو خود کو خاموش کروانا ناگوار گزرا تھا۔

''جتنی چادر میسر ہے یہ بھی غنیمت ہے۔ اس میں ہی پاؤں پھیلا لیں گے۔'' مانی نے صلح جو لہجے میں بولتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

☆☆☆

کھلتی ہوئی رنگت، بادامی آنکھیں، ذرا سی پھینی ناک، مگراس کے چہرے کی بناوٹ پہ پھبتی تھی۔ کٹاؤ دار ہونٹوں پہ ہلکی سی لپ اسٹک تھی۔ کمر سے نیچے تک آتے شہد رنگ بالوں میں برش کرتے ہوئے وہ گنگنا رہی تھی۔ اس کالاٹھی اور اٹھان اچھی تھی۔ اس پرنوعمری کی کشش، دیکھنے والوں کو نگاہیں نہیں ہٹانے دیتی تھیں۔

''امی! ذرا حلیم منگوادو گولڈن حلیم والے سے، مسالہ تیز۔'' ترنم سے فرمائش ہوئی مگر بہت دھیمی آواز میں، ساتھ ہی اس کی نگاہیں چوکنا انداز میں ادھرادھر بھی گھوم رہی تھیں۔

''نانی ڈانٹیں گی، مرچ مسالے کی چیزیں کھا کر دانے نکل آتے ہیں۔'' ترنم نے اسے ڈرایا۔

''ذرا سی حلیم سے کچھ نہیں ہوتا، تم بس منگوا کر رکھ دو، میں خاموشی سے کھالوں گی، ٹھیک ہے۔'' بالوں میں برش پھیرتے پھیرتے وہ ملتجی انداز میں بول رہی تھی۔

''اچھا، منگوادوں گی۔'' ترنم نے نرمی سے اسے تسلی دی۔

بے چاری منی بچپن سے ہی نانی کے زیادہ قریب رہی۔ انہوں نے ہی پالا پوسا اور تربیت کی، ترنم تو بس بیٹے کے چاؤ چونچلوں اور لاڈ پیار میں لگی رہتی تھی۔ کبھی اسے اپنی کوتاہی اور غفلت کا احساس ہوتا اور کبھی یہ سوچ کر دل کو تسلی دے دیتی کہ جتنی محبت اور لاڈ پیار سے نانی نے پالا ہے۔ شاید وہ خود بھی اپنی بیٹی کو نہ دے پاتی، شاید یہی وجہ تھی کہ جب بھی منی جھوٹے منہ بھی اس سے کوئی چھوٹی سی بھی فرمائش کرتی تو اسے پورا کر ہی دیتی، ملازم لڑکے سے حلیم منگوا کر کچن میں رکھ دی تھی۔

اماں نے اپنے کمرے میں ترنم کو بلوایا تھا۔

''ارے ہائے کہیں اماں کو حلیم کا تو علم نہیں ہوگیا؟'' ترنم کو پہلا خیال یہی آیا اور ان کی متوقع ڈانٹ کے لیے خود کو تیار کرنے لگی، مگر وہاں پہنچی تو کچھ اور ہی معاملہ تھا۔

''منی کا بیاہ کررہی ہوں میں۔'' اماں نے بڑے آرام سے اطلاع دی تھی۔

''ہائیں!'' حیرت سے ترنم منہ کھل گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو اماں۔'' وہ ہکلائی۔

''منی کی شادی کا کہہ رہی ہوں اور کیا، تو تو ہر وقت بیٹے کے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہے، بیٹی کے بارے میں کبھی سوچا بھی ہے، اس کا بیٹا کیا ہوگا؟'' انہوں نے اپنی تیز نگاہوں سے بیٹی کو گھورا۔

''مگر اماں وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ سولہ کی ہوئی ہے ابھی۔''

''تو کیا بیس کی ہونے کا انتظار کروں؟'' وہ بھڑک گئیں۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں تو بس......''

''رشتہ اچھا ہے، ہم جیسوں کے حساب سے تو بہت اچھا ہے۔ زمین دار ہے۔ بہت بڑی جاگیر کا مالک ہے، گاؤں میں بھی حویلی ہے، شہر میں بھی بنگلے ہیں، منی کے نام گاڑی، بنگلہ، زیور، نقدی سب لکھ کر دینے کو تیار ہے۔ پہلی شادی باپ نے خاندان میں کی ہے، بڑی عمر کی ہے بیوی، اب اپنی مرضی سے دوسری بیوی لانا چاہتا ہے، جب سے اپنی منی کو دیکھ کر گیا ہے، مانو، لٹو ہوگیا ہے، پیغام پہ پیغام بھجوا رہا ہے جواب کے لیے۔'' اماں نے ساری تفصیل بتائی۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' ترنم کا دماغ سچ مچ ماؤف ہورہا تھا۔

منی ابھی تک اسے منی ہی نظر آتی تھی، لاابالی، کھلنڈری، شوخ جو ابھی تک اپنے بچپن کی انگلی تھامے ہوئے تھی۔

''بیٹی کی عمر مت دیکھ، جوبن تو دیکھ، غضب کی جوانی ہے، اپنے سامنے ہی کسی کھونٹے سے باندھ دوں تو

اطمینان رہے گا، میری آنکھیں بند ہوگئیں تو کون سنبھالے گا اسے؟ تیرا بیٹا تو پہلے ہی الگ دماغ لیے پھرتا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں پان چباتی ہوئی ترنم کو سمجھا رہی تھیں۔ ان کی جہاں دیدہ آنکھوں کی تہہ میں محبت اور تشویش کی نمی تھی۔

''جیسے تم مناسب سمجھو اماں، میری تو عقل کام نہیں کررہی اس معاملے میں۔'' ہمیشہ کی ڈبو اور کمزور ترنم نے ماں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

☆☆☆

کھلے ہوئے بال شانوں پہ پڑے تھے، حال ہی میں انہیں نئے انداز میں ترشوایا تھا اور ڈائی بھی کروائے تھے، چہرے پہ میک اپ تھا اور تھوڑا سا خوف دہراس بھی، ایک بے زاری کے عالم میں اس نے کانوں سے ہینڈز فری نکال کر پھینکا اور موبائل بھی ایک طرف ڈال دیا۔ کشن سر کے نیچے رکھ کر آڑی ترچھی صوفے پہ لیٹ گئی۔

''کب تک ڈر کر چھپی رہے گی یہاں، اس کے لیے گواہی دے دی اب کس بات کا ڈر ہے؟'' بانو کئی دنوں سے اس کے خوف اور ڈر کو دیکھ رہی تھی، بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہی تو مصیبت ہے، میں نے دوستی، مروت یا محبت میں آکر احسان کیا ہے اس پر، ڈرادھمکا کر اپنا کام نکالا ہے اس نے، اسے یہ خدشہ ضرور ہوگا کہ کہیں میں کسی کے سامنے حقیقت نہ اگل دوں، وہ شاید مجھے زندہ نہ چھوڑے۔'' پریا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے گرد باندھے وہ بہت سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔

''وہم میں نہ پڑ، ذرا اپنی شکل دیکھ شیشے میں، ڈر ڈر کر کیا حال کرلیا اپنا، ہڈیاں نکل رہی ہیں۔'' بانو نے لتاڑنے کے انداز میں سمجھایا۔

''وہم نہیں ہے میرا۔'' پریا نے نفی میں سر ہلایا۔

''کل بھی کوئی گاڑی پیچھا کررہی تھی میرا، بڑی مشکل سے ڈاج دے کر گھر پہنچی تھی۔''

''اگر ایسی بات ہے تو اس سے پہلے کہ وہ وار کرے، تو اپنا داؤ کھیل جا، میڈیا میں جاکر بتادے سب کچھ، یہ بھی شو کردے کہ تیری جان کو اس سے خطرہ ہے، پھر اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکے گا تجھ پر۔'' بانو کا دماغ خوب کام کررہا تھا۔

''میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ پہلے میں نے جھوٹ کہا تھا اور اب سچ بول رہی ہوں؟ عدالت کو بھی تو ثبوت چاہیے ہوگا''

''تو کب تک یونہی دبک کر بیٹھی رہے گی؟''

''پتا نہیں۔'' پریا آج سے پہلے اتنی کمزور اور بے بس کبھی نہیں تھی۔

☆☆☆

کبھی کبھی تازہ ہوا کھانے چھت پہ آجاتا تھا۔ بلندی سے ہر منظر واضح نظر آتا تھا۔ گھر بازار، دکانیں، سڑکیں، گاڑیاں، روشنیاں، چاند ستارے، زمین، آسمان، دونوں کو دیکھتا رہتا اور اپنے خیالات میں الجھا رہتا، آج مگر وہ جیسے ہی چھت پہ پہنچا، ایک نیا منظر سامنے تھا۔ ایک لمحے کو تو وہ ٹھٹک گیا۔ زمین نے جیسے اس کے پیر پکڑ لیے اور اگلے ہی لمحے جو کچھ ہوا وہ بے اختیاری اور لاشعوری تھا، وہ تقریباً بھاگتا ہوا اس آدھی دیوار تک پہنچا جو چھت کے کنارے کنارے پوری لمبائی میں پھیلی ہوئی تھی، اس دیوار پہ کھڑی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اس نے پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچا اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی نیچے گرا۔

☆☆

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

افشین نعیم

یار دل دار

''پھر، کیا سوچا تم نے ......؟'' ماں کی آواز پر کوفتے آلو سے اچھی طرح انصاف کرتے احسن نے کچھ چونک کر سر اٹھایا۔

''جی؟ مجھ سے کچھ کہا......؟'' اس نے تصدیق طلب انداز میں ماں کو دیکھا۔

''نہیں، دیواروں سے باتیں کر رہی ہوں۔'' جھنجھلاہٹ بھری خفگی اس نے لہجے کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی محسوس کی۔

''دیواریں کہاں آپ کی باتیں سمجھیں گی اماں! آپ ایسا کریں مجھ سے بات کریں۔'' روٹی ختم کرنے کے بعد بچا ہوا شوربہ ایک سڑپے کے ساتھ پیتے ہوئے اس نے ماں کو مخاطب کیا۔

''میں نے تم سے ایمن کی نند والے معاملے پر غور کرنے کے لیے کہا تھا۔'' وہ بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے بولیں۔

''اچھا، ادھر آیئے اور یہاں بیٹھ کر تسلی سے میری بات سنیے۔'' احسن نے اپنے قریب جگہ بناتے ہوئے ماں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

خاموشی سے بیٹھ کر منتظر نظروں سے وہ اسے دیکھنے لگیں۔

گلا کھنکھار کر احسن نے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے دزدیدہ نگاہوں سے ماں کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ دل میں انکار کے لیے مناسب الفاظ کا چناؤ کیا تاکہ ماں کو کم سے کم صدمہ ہو۔

''دیکھیں، امی اب اللہ کے فضل و کرم سے میں پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ اور ہوں بھی سب سے بڑا تو اس حساب سے ذمہ داریاں بھی بے حد وحساب عائد ہوتی ہیں ناتواں کندھوں پر۔''

گردن گھما کر ماں کے تاثرات کا جائزہ لیا، وہ لب بھینچے اس کی بات سن رہی تھیں۔

''تو، اب اگر میں ایمن کی نند کے لیے ہاں کر دیتا ہوں تو مجبوراً مجھے باقی چار کی نندوں سے بھی شادی کرنا پڑے گی۔ اور چونکہ اسلام میں پانچویں شادی کی اجازت نہیں ہے تو مساوات قائم کرنے اور انصاف کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے مجھے پہلی بیوی یعنی کہ ایمن کی نند کو فارغ کرنا پڑے گا۔'' ابھی بات مکمل نہ ہو پائی تھی کہ امی نے چپل پاؤں سے اتار لی۔

احسن نے فوری طور پر وہ جگہ چھوڑی اور دو چھلانگوں میں دروازے کے قریب رکھی کرسی پر جا بیٹھا، تکیہ، گود میں رکھ لیا تاکہ بوقت ضرورت حفاظت کے لیے منہ کے آگے کیا جا سکے اور سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

''تو جب ایمن کی نند اپنے اُجڑے وجود کے ساتھ ماں باپ کی دہلیز پر پہنچے گی تو اس کے ماں باپ اور بھائی اس منظر کی تاب نہ لا سکیں گے۔''

پہلی جوتی اڑتی ہوئی احسن کی طرف آئی اور اس تکیے سے ٹکرائی جو احسن نے فوراً ہی منہ کے سامنے کر لیا تھا۔

''گڈ تھرو اماں......!'' احسن نے انگوٹھا ڈن والے انداز میں ماں کو دکھایا۔

''آپ، نیشنل ٹیم میں کیوں نہیں ٹرائی کرتیں......'' ماں نے دوسری چپل اتاری۔

''نہیں نہیں اماں...... میری وجہ سے میری بہن کا گھر اجڑ جائے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔'' تکیہ واپس گود میں رکھ کر چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر اب وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

کھٹاک کی آواز کے ساتھ جوتی اس کے کندھے سے ٹکرائی۔ بے چارہ بلبلا کر رہ گیا۔

''اف، کس قدر ظالم خاتون ہیں آپ۔'' کندھے کو سہلاتا وہ سیدھا ہوا۔

''احسن! میں بہت برداشت کر رہی ہوں۔ باز آ جاؤ تم۔'' چہرہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

''اللہ اللہ! برداشت پر یہ عالم ہے، عدم برداشت پر تو میری لاش یہاں تڑپ رہی ہوتی اب تک۔'' دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتا وہ ان کے غصے کو مزید ہوا دے گیا۔

''مسئلہ کیا ہے آخر تمہارے ساتھ......؟'' وہ زچ ہو کر بولیں۔

''اللہ نہ کرے جو کوئی مسئلہ ہو میرے ساتھ۔ الحمدللہ، ذہنی، جسمانی ہر لحاظ سے فٹ ہوں میں۔'' وہ بال سنوارتے ہوئے بولا۔

''تو پھر شادی سے اتنا بدک کیوں رہے ہو؟ سب سے بڑے ہو۔ اصولاً ایمن اور ثمن سے پہلے تمہاری شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ چلو، تمہاری ضد تھی کہ پہلے بہنوں کی شادی ہو۔ میں بھی مان گئی۔ لیکن، اب تمہارا نمبر ہے۔ کرن کے لیے دو تین جگہوں سے پیام آ چکے ہیں۔ میں تمہاری اور کرن کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتی ہوں مگر تم ہو کہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہے۔'' وہ بولتے بولتے ہانپ سی گئیں۔

''جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں......'' وہ سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے بولا۔ ''بولو۔'' ناراضی سے اس کو دیکھتے وہ گویا ہوئیں۔

''میں شادی سے نہیں، اس وٹے سٹے سے بدک رہا ہوں۔ آپ ایمن کی نند والا آپشن ذہن سے نکال کر بات کریں۔ ان شاء اللہ مجھے سو فی صد راضی پائیں گی۔'' بات مکمل کر کے اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے بال سنوارے۔

''کہیں کوئی اور چکر تو نہیں ہے؟'' مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''مطلب......؟'' اس کے کان ماں کے انداز پر کھڑے ہوئے۔ سو ابرو چڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''مطلب، آفس میں تو کوئی چکر وکر نہیں ہے۔'' انہوں نے بھی صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''آفس میں تو، میں صرف گھن چکر بنا ہوتا ہوں وہ بھی کام میں۔ دوسرے آپ کی مزید تسلی کے لیے بتا دوں، ہمارے آفس میں لڑکیاں نہیں ہوتیں۔''

''بھئی، کوئی پتا تھوڑی ہوتا ہے۔ اچھا لڑکا دیکھ کر لڑکیاں پھانس لیا کرتی ہیں۔'' اماں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''ہاہ......!'' ایک ٹھنڈی سانس اس کے حلق سے خارج ہوئی۔

''اپنی، ایسی قسمت کہاں......آج تک کسی حسینہ نے پھانسنے کی کوشش نہیں کی۔'' حسرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے یوں ہی ماں پر نظر پڑی تو وہ نیچے جھکی کسی جوتی کی تلاش میں نظر آئیں۔

''یہ رہیں دونوں جوتیاں۔'' احسن نے اپنے قریب پڑی جوتیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھہر جاؤ ذرا تم......'' وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''یہ ٹھہرنے کا نہیں بھاگنے کا ٹائم ہے۔'' وہ بھی جلدی سے کھڑا ہوا۔ دروازے تک پہنچ کر جاتے جاتے رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا امی، جوتیوں کے انتہائی قریب پہنچ چکی تھیں۔

''ویسے اماں! اگر کوئی جوہر شناس حسینہ مل گئی اور اس نے ذرا سی بھی کوشش کی مجھے پھانسنے کی تو ایمان سے......فوراً پھنس جاؤں گا۔'' کہہ کر وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا کہ اماں جوتی ہاتھ میں لے کر نشانہ باندھ چکی تھیں۔

☆☆☆

''کتنا اچھا لگ رہا ہے نا......نکھرا نکھرا سا۔'' عادل کی بات پر حیدر رسید ھا ہوا۔

''ہاں یار......دوست، رشتے دار سب یہی کہہ رہے ہیں۔ بہت نکھر گیا ہوں میں شادی کے بعد، کم ہی لوگوں پر اتنا روپ آتا ہے......اصل میں نا۔''

''میں، گھر کی بات کر رہا ہوں۔'' عادل اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''وائٹ واش کے بعد بہت نکھر گیا ہے۔ نیا نیا سا لگ رہا ہے۔''

''حالانکہ تجھے میری بات کرنی چاہیے تھی، شادی میری ہوئی ہے۔ گھر کی نہیں۔'' حیدر منہ بگاڑ کر بولا۔

''وائٹ واش گھر کا ہوا ہے۔ تیرا نہیں۔'' عادل بھی دو بدو بولا۔

''ہونہہ......حاسد دنیا۔'' حیدر نے کہتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا۔

تب ہی محب اللہ اور احسن سلام کرتے ہوئے ٹی وی لاؤنج سے اندر داخل ہوئے۔

''لو بھئی گرما گرم پکوڑے۔ عیاشی کرو۔'' احسن نے خاکی کاغذ میں لپٹے گرم پکوڑے درمیانی ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

حیدر نے ہاتھ بڑھا کر پکوڑے اٹھانے چاہے تو عادل نے جلدی سے پکوڑوں والا لفافہ اپنے قبضے میں کیا۔

''ابھی نہیں، چائے بناتا ہوں۔ چائے کے ساتھ کھائیں گے۔''

''منحوس انسان......!'' حیدر زیر لب بڑبڑایا۔

عادل، ایک دل جلانے والی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتا کچن کی سمت بڑھ گیا۔

''یہ، تم دونوں آج ایک ساتھ کیسے......؟'' حیدر نے سوالیہ نظروں سے محب اللہ کو دیکھا۔

''میں گھر کی طرف آ رہا تھا تو راستے میں مولوی پکوڑے خریدتا نظر آیا، بس میں رک گیا۔ پھر میرے بھائی نے مجھے سموسہ خرید کر دیا اور ہم ہنسی خوشی پہنچ گئے گھر۔'' جواب، احسن کی طرف سے آیا۔

''ہوں......؟'' حیدر نے سر ہلایا۔

''انس کدھر ہے......؟'' محب اللہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے حیدر سے پوچھا۔

''کٹنگ کروانے گیا ہے۔''

''بالوں کی......؟'' احسن کا سوال بے ساختہ تھا۔

''نہیں، زبان کی۔'' حیدر مسکراتے ہوئے بولا۔

''حالانکہ کٹنگ کی ضرورت تیری زبان کو ہے۔'' احسن، حیدر کو گھورتے ہوئے بولا۔

''یار! اباجی کا شادی کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔'' محب اللہ اپنے ہی دھیان میں بولا۔

''یہ عمر ہے تیرے اباجی کی......شادی کا مطالبہ کرنے کی۔ توبہ توبہ......جوان اولاد شادی کے قابل ہے۔ اور ان کو اپنی شادی کی پڑی ہے۔'' احسن طیش اور افسوس کی ملی جلی کیفیت میں گھر کر بولا۔

''میری ہی شادی کی بات کر رہے ہیں وہ......'' محب اللہ، احسن کو گھورتے ہوئے بولا۔

''اوہ......!'' ہونٹ گول کر کے بس وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''ویسے شادی کے لیے تو آج کل میری اماں بھی بے چین ہیں۔'' احسن نے شرماتے ہوئے بتایا۔

''میری شادی......'' جلدی سے وضاحت بھی کر دی۔

''تو پھر کب ہو رہی ہے تیری شادی......؟'' حیدر نے سوال کیا۔

''پتا نہیں......'' احسن نے کندھے اچکائے۔

''ویسے یار! اماں نے بڑی دلچسپ بات کی۔'' کہہ رہی تھیں اچھے اور شریف لڑکوں کو لڑکیاں پھانس لیتی ہیں۔''

ہمیں تو آج تک کوئی ایسی نہ ملی......'' احسن حسرت سے بولا۔

''کیونکہ آپ میں صرف ایک خوبی ہے اور وہ کہ آپ محض ایک لڑکے ہیں......اور یہ خوبی ہمارے معاشرے میں بدرجہ اتم موجود ہے۔'' عادل چائے کی ٹرے میز پر رکھتا ہوا بولا۔

''پکوڑے......؟'' حیدر نے سوالیہ نظروں سے عادل کو دیکھا۔

''کچن سے لے کر آ......'' عادل نے اس کو اشارہ کیا۔ حیدر فوراً ـــ کچن کی طرف گیا۔

''انس کے لیے ایک پلیٹ میں الگ کر دینا پکوڑے۔'' محب اللہ نے آواز لگائی۔

''اچھا......!'' حیدر نے وہیں سے جواب دیا۔

ابھی وہ چائے پکوڑوں سے انصاف کر ہی رہے تھے کہ باہر بہت سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں اور ساتھ ہی ساتھ ـ فرنیچر کی اٹھا پٹخ کی آوازیں آنے لگیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے......؟'' احسن نے سوالیہ نظروں سے باقیوں کو دیکھا۔

''پتا نہیں۔'' محب اللہ نے کندھے اچکائے۔

''مونا میم کی بیٹی اور نواسی کی آمد متوقع تھی۔ شاید اسی سلسلے میں کچھ انتظامات وغیرہ ہو رہے ہوں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

دل ایک گلشن

رضیہ جمیل

300

چلمن

نادرہ خاتون

قیمت -/300 روپے

نسیم سحر قریشی

قیمت -/400 روپے

دستِ کوزہ گر

فوزیہ یاسمین

قیمت -/750 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

گے۔" عادل نے لب کشائی کی۔

حیدر، چائے ختم کر کے کھڑا ہوا۔ "ذرا دیکھیں تو سہی، کیا انتظامات ہو رہے ہیں۔"

حیدر باہر آیا تو وسیع و عریض ٹیرس کے دوسرے سرے پر واقع سامنے والے پورشن کا دروازہ کھلا نظر آیا، جس کو اپنی آمد کے بعد سے لے کر اب تک انہوں نے لاکڈ ہی دیکھا تھا۔

سنسان و ویران پورشن رنگ و روغن کے بعد لشکارے مار رہا تھا۔ کچھ مزدور ٹائپ لوگ نیا نکور فرنیچر اس پورشن میں شفٹ کرنے میں مصروف تھے۔

ایک انتہائی ویل ڈریسڈ سوٹڈ بوٹڈ جوان مزدوروں کو ساتھ ساتھ ہدایات جاری کر رہا تھا۔

حیدر انتہائی دلچسپی سے یہ منظر ملاحظہ کر رہا تھا تب ہی اس خوش پوش جوان کی نظر اس پر پڑی۔

"ہیلو......!" وہ خوش اخلاقی سے کہتا حیدر کی جانب بڑھا۔ حیدر بھی دو چار قدم بڑھا کر اس کے قریب ہوا۔ خوش دلی سے دونوں نے مصافحہ کیا۔

"میں سیموئیل کیمفرٹ ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"آپ کی تعریف ......؟" اب وہ حیدر کے بولنے کا منتظر تھا۔

"جی، تعریف شعریف کوئی نہیں کرتا ان کی۔ بے چارے اس لائق ہی نہیں ہیں۔" عادل جو احسن اور محب اللہ کے ساتھ عین اس لمحے باہر آیا تھا جب وہ دونوں مصافحہ کر رہے تھے، اونچی آواز میں بولا اور ساتھ ہی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

عادل سے ملنے کے بعد، سیموئیل نے محب اللہ اور احسن سے ہاتھ ملایا۔

"جی، میں حیدر ہوں، یہ عادل، یہ محب اللہ اور یہ احسن ہیں۔" حیدر نے کندھا مار کر عادل کو سائیڈ پہ کیا اور جلدی سے اپنے ساتھ ساتھ، باقی تینوں کا بھی تعارف کروا دیا۔

سیموئیل نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ اور گویا ہوا۔

"میں انٹیریئر ڈیکوریٹر ہوں اور "کازے مون" ______ کی طرف سے آیا ہوں۔ اس پورشن کا کنٹریکٹ ہماری کمپنی کو ملا ہے۔ کام مکمل ہوتے ہی میں آپ لوگوں کو یہاں کا وزٹ کرواؤں گا۔" اس نے سامنے والے پورشن کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"آپ کو لگے گا کہ آپ بالکل کسی نئی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں۔"

"وہ تو یقیناً ہمیں لگے گا کیونکہ ہم آج تک ویسے بھی اس پورشن میں کبھی نہیں گئے۔" خاموشی سے بات سنتے سنتے، عادل کی زبان میں سب سے پہلے کھجلی ہوئی۔

سیموئیل صاحب، عادل کی بات سنے بغیر اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

"ہماری کمپنی کا پیکج سب سے بہترین ہے۔ ریٹس بھی مارکیٹ میں سب سے مناسب ہمارے ہی ہیں۔"

"یہ ہمیں کیوں بتا رہا ہے یہ سب......؟" محب اللہ نے احسن کے کان میں سرگوشی کی۔

"کلائنٹ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔" احسن نے جوابی سرگوشی کی۔

"بے چارہ، غلط جگہ وقت ضائع کر رہا ہے۔" (محب اللہ دل میں سوچ کر رہ گیا۔)

"اگر آپ لوگوں کو اپنا پورشن فرنش، رینوویٹ یا ڈیکوریٹ کروانا ہو تو ہم سے رابطہ کیجیے گا۔ ہم آپ کو اسپیشل ڈسکاؤنٹ دیں گے۔" انتہائی پروفیشنل انداز میں کہتے ہوئے اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر ان لوگوں کی طرف بڑھایا۔

"یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ آپ کو جب بھی ضرورت ہو اس پر نمبر درج ہے آپ لوگ رابطہ کر سکتے ہیں۔"

حیدر نے ہاتھ بڑھا کر کارڈ تھام لیا۔

سیموئیل صاحب مسکراتے ہوئے مزدوروں کو ہدایات جاری کرتے، وہاں سے چلے گئے۔

حیدر کارڈ الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا، محب اللہ، احسن اور عادل اس کے گرد گھیرا ڈالے یونہی کھڑے تھے۔

اسی وقت انس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ بے دھیانی میں سامنے والے پورشن کی چہل پہل دیکھتا وہ اپنے پورشن کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ ان چاروں کو

وہاں دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گیا۔

"آپ لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں......؟"

"لڈی ڈالنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آ، تو بھی ہمیں جوائن کر۔" عادل اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یار! آپ لوگ سیدھا جواب نہیں دے سکتے کسی بات کا۔" انس سخت خفا۔ خفا سے لہجے میں کہہ کر اندر جانے ہی لگا تھا کہ احسن نے اس کا بازو دبوچا۔ مجبوراً اس کو رکنا پڑا۔

"کیا ہے......؟" روٹھے روٹھے سے انداز میں گردن موڑ کر احسن کی جانب دیکھا۔

"میرا ہاتھ ہے۔ اور تیرا بازو ہے۔" احسن نے آنکھ کے اشارے سے پہلے بازو اور پھر انس کو دیکھا۔

"چل، میں دیتا ہوں تیرے سوال کا سیدھا جواب۔" حیدر، احسن کے پیچھے سے گھوم کر انس کے سامنے آیا۔

"ہم، یہاں کھڑے" کچھ نہیں کر رہے تھے۔ "اب خوش......؟" دونوں بازو کھڑے کر کے وہ انس کو دیکھ کر مسکرایا۔

احسن نے اس کا بازو چھوڑا۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتا ہوا اندر کی طرف بڑھتا گیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رکا۔

"مونا میم ملی تھیں ابھی نیچے۔ کہہ رہی تھیں آٹھ بجے تک سب نیچے آ جانا، ڈنر سب لوگ میرے ساتھ کرنا۔" خبرنامے کی صورت پیغام نشر کر کے وہ اندر غائب ہو گیا۔

عادل خوشی کے مارے محب اللہ کے گلے لگ گیا کیونکہ آج اس کی روٹی پکانے کی باری تھی۔

☆☆☆

وہ لوگ تیار ___ ہو کر جوں ہی باہر نکلے۔ سامنے کھڑے سیموئیل صاحب سے سامنا ہو گیا۔

"میں ابھی آپ ہی لوگوں کو بلانے آ رہا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ان کو مخاطب کیا۔

"جی، اچھا......" حیدر جوابی مسکراہٹ اچھالتا سائیڈ سے ہو کر نکلتا چلا گیا۔

نیچے سے اٹھتی ہوئی اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبوئیں، کچھ مقناطیسی کشش کے ساتھ اس کو اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ ایسے میں سیموئیل صاحب کی کارکردگی دیکھنے اور انہیں شاباشی دینے کا اس کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

سیموئیل بے چارے نے حیرت سے اس کی پشت ملاحظہ کی، جس نے اس کی بات تک سننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

"وہ، آپ آ کر دیکھ لیجیے، سارا کام سو فی صد مکمل ہو چکا ہے۔" سائیڈ سے نکلتے عادل کے سامنے اس نے جلدی سے مدعا بیان کیا جو حیدر کے پیچھے پیچھے سیموئیل صاحب سے کنی کترا کر گزرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یار! کام کر لیا ہے تو سیدھے سیدھے گھر جا۔ کیوں اپنا اور ہمارا وقت برباد کر رہا ہے۔" باوجود چاہنے کے عادل یہ جملہ کہہ نہیں پایا۔ کہا تو صرف اتنا......

"امید ہے، آپ نے بہترین کام کیا ہو گا۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔ ابھی آپ کچھ جلدی میں لگ رہے ہیں۔" اس کا کندھا تھپکتے وہ آگے بڑھ گیا۔

ایک نظر عادل کی پشت پر ڈالتے کچھ مایوسی سے وہ احسن کی طرف مڑا۔ احسن جوان دونوں ہی کی طرح سائیڈ سے نکلنے والا تھا۔ اس کے چہرے پر بے چارگی کے سے تاثرات دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

"چلیں آئیں، دکھائیں کہ کیسا ڈیکوریٹ کیا ہے آپ نے گھر......؟" محب اللہ کے جملے نے اس کا اعتماد کچھ بحال کیا۔

"انس، احسن اور محب اللہ، اس کی تقلید میں چھچھاتے، لشکارے مارتے پورشن کی طرف بڑھے۔

اندر آ کر تو ان کو لگ رہا تھا کہ کسی اور ہی جہان میں آ گئے ہیں۔ قیمتی فرنیچر، بیش قیمت قالین، دبیز صوفے کے کپڑے سے میچنگ پردے۔ چھوٹی، بڑی

ہر چیز اپنی قیمت کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی۔ دل کھول کر انہوں نے سیموئیل صاحب کی پسند کو سراہا، ان کے کام اور لگن کی تعریف کی اور ہنستے مسکراتے وہ سب نیچے آ گئے۔

نیچے، عادل اور حیدر، مونا میم کی باتیں خاموشی سے سن رہے تھے۔ ان سب نے سلام کر کے نشستیں سنبھالیں سوائے سیموئیل کے جو چابی، مونا میم کے حوالے کر کے جانے کے لیے پر تول رہا تھا اور مونا میم بصد اصرار اس کو کھانے کے لیے روک رہی تھیں۔

''وہ، اصل میں میڈم، میری نئی نئی شادی ہوئی ہے تو میری مسز (بیگم) میرے بغیر کھانا نہیں کھاتیں۔'' کچھ شرماتے ہوئے اس نے اپنی مجبوری بیان کی۔

''چھچھورا کہیں کا......'' حیدر نے کچھ ایسے تپے ہوئے لہجے میں کہا کہ عادل کی بے ساختہ ہی ہنسی چھوٹی۔

''ویسے، میں تیرا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔'' عادل نے ہمدردانہ لہجے میں کہتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جس کو حیدر نے منہ بگاڑ کر ہٹایا۔

سیموئیل صاحب کو رخصت کرنے کے بعد مونا میم ان لوگوں کی جانب متوجہ ہوئیں۔ ''ہاں تو میں ان لوگوں کو آج کی دعوت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ رائز پیک والوں سے ارینجمنٹ کروایا ہے آج کے ڈنر کا شیف، ویٹر سب انہی کے ہیں۔'' انہوں نے محب اللہ اور انس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ آج کا ڈنر ہے کس سلسلے میں میم ......؟ آپ کی بیٹی اور نواسی تو غالباً کل پاکستان پہنچ رہی ہیں نا......؟'' احسن نے اپنی الجھن کو زبان دی۔

''ہاں......! شہربانو اور میرب کل رات کی فلائٹ سے پہنچیں گی۔'' انہوں نے سر ہلا کر کہا۔

''تو مطلب یہ سارا اہتمام ہمارے لیے ہے۔'' عادل نے آخری حد تک آنکھیں پھیلا کر حیدر کی جانب دیکھا۔ جو اس کی جانب قطعاً متوجہ نہیں تھا بلکہ مونا میم کی بات سن رہا تھا۔

''اصل میں آج، میں نے احتشام کو بلایا ہے۔ احتشام، جس سے میرب کی شادی طے ہوئی ہے۔'' انہوں نے وضاحت کی۔

ان سب نے سر ہلایا۔

''یہ احتشام صاحب، آپ کے رشتے دار ہیں......؟'' محب اللہ نے یونہی ایک سوال کیا۔

''نہیں...... رشتے دار تو نہیں ہیں۔ میرے داماد کے کسی دوست کے جاننے والے ہیں۔ انہی کے توسّط سے یہ رشتہ ہوا ہے۔ بس، میرب نے یہاں پاکستان میں میرے پاس رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری وجہ سے کافی فکرمند رہتی ہے۔ یہ اوپر والا پورشن ان ہی دونوں کے لیے سیٹ کروایا ہے میں نے۔ احتشام کے والدین اور بہن بھائی تو بہاول پور میں ہوتے ہیں، یہ اپنے کام کی وجہ سے ادھر اسلام آباد میں ہوتا ہے۔'' مونا میم نے کافی تفصیل سے بتایا۔

''کیا کرتے ہیں احتشام صاحب......؟'' انس نے سوال کیا۔

''ادھر بلیو ایریا میں گاڑیوں کا شوروم ہے۔'' مونا میم نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اطلاعی گھنٹی کی آواز نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

☆☆☆

لائننگ والی شرٹ اور گرے پینٹ میں ملبوس احتشام صاحب یعنی کہ محفل کے مہمان خصوصی سے مونا میم نے سب کا تعارف کروایا۔

فرداً فرداً سب سے مصافحہ کرنے کے بعد اب وہ مونا میم کے چھوٹے چھوٹے سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔

اس کے ملبوس سے اٹھتی قیمتی پرفیوم کی خوشبو، برینڈڈ جوتے، ہاتھ میں بندھی قیمتی گھڑی اور پھر چال ڈھال سب مل کر اس کو ایک پُروقار شخصیت ثابت کر رہے تھے لیکن کچھ تھا جو احسن کو کھٹک رہا تھا۔

ویٹرز نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس سب کے ساتھ ہی دھلے دھلائے نئے

اور کپڑوں میں ملبوس سائیکل بھی ایکٹیو ہو چکا تھا۔ وہ سب لوگ میز کے گرد نشستیں سنبھال چکے تھے۔

''یار، یہ بندہ کچھ نقلی نقلی سا نہیں لگ رہا۔'' احسن نے اپنے پاس بیٹھے حیدر کے کان میں سرگوشی کی جس کا سارا دھیان چکن تکہ اپنی پلیٹ میں منتقل کرنے پر تھا۔

حیدر نے نظر اٹھا کر دیکھا، سربراہی کرسی پر مونا میم براجمان تھیں، ان کے دائیں ہاتھ پہ احتشام صاحب اور بائیں ہاتھ عادل بیٹھے تھے۔

عادل کے برابر محب اللہ تھا، احتشام کے برابر سائیکل بیٹھا تھا۔ مونا میم کے عین سامنے والی کرسی پر احسن اور اس کے ایک طرف حیدر اور دوسری جانب انس بیٹھا تھا۔

حیدر کی نظر پلٹ کر واپس آئی تو احسن کو منتظر سا اپنی طرف دیکھتا پایا۔

''لالے، داڑھی مونچھ تو اس بندے کی ہے نہیں۔ بال بھی اوریجنل ہی لگ رہے ہیں۔ اب مزید نقلی لگنے والی کیا چیز رہ گئی ہے۔'' اس سے پہلے کہ احسن، حیدر کی بات پر کوئی تبصرہ کرتا۔ عادل کی بات پر سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔

''احتشام صاحب! مجھے لگتا ہے ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔'' عادل کچھ سوچتی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ (اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس بندے کو اس سے پہلے اس نے کہاں دیکھا ہے۔)

''ویل۔'' انتہائی نفاست سے چکن کا پیس پلیٹ میں رکھتے ہوئے احتشام نے کندھے اچکائے۔

''مجھے تو ایسا نہیں لگ رہا۔ ویسے کرائے دار ہیں نا آپ لوگ گرینڈ مام کے تو اب تو ملاقات ہوتی رہے گی۔'' اطمینان سے کہہ کر وہ دوبارہ کھانے میں مشغول ہو چکا تھا۔

عادل بھی سر جھکا کر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اُگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت -/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/400 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/600 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1100 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

"یہ......" احسن نے حیدر کے پاؤں پر پاؤں مارا۔ "اپنی حرکتوں سے نقلی نقلی سا لگ رہا ہے۔"

حیدر نے سر اٹھا کر احسن کی طرف دیکھا جس کی پلیٹ ابھی تک خالی تھی۔

"کھانا نہیں کھانا تو تھوڑی دیر چپ کر کے بیٹھ جا، مجھے کھانے دے سکون سے۔"

کھانے کے اختتام، چائے اور پھر مہمان خصوصی کے رخصت ہونے تک احسن بے چین ہی رہا۔

اور جب وہ لوگ رخصت ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ تو مونا میم نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اختشام کے کام کے متعلق تسلی کرنا چاہتی ہیں اور اس سلسلے میں انہیں ان لوگوں کا تعاون درکار تھا۔

دو لوگ جو بخوشی اور فوراً تعاون کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ وہ تھے عادل اور احسن۔

☆☆☆

یہ ڈنر کے دو دن بعد کی بات تھی کہ مونا میم کی طرف سے چائے پر ان لوگوں کو بلوایا گیا تھا۔ سوائے احسن کے وہ سب لوگ گھر پر ہی موجود تھے۔ سو نیچے چلے آئے۔

مونا میم کی بیٹی شہر بانو ان کی جوانی کا عکس محسوس ہو رہی تھیں اور ان کی بیٹی میرب ہو بہو اپنی ماں کی جوانی کا عکس تھی۔ بہت اچھے ماحول میں ان لوگوں نے چائے پی۔

"میری!" مونا میم نے نواسی کو مخاطب کیا۔

"جی...... گرینڈ ما......" وہ نازک سی پتلے پتلے نین نقش والی لڑکی۔ ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

"تم، اوپر جا کر اپنا پورشن دیکھ آؤ۔ یہ شہر بانو تو دن میں دیکھ کر آئی ہے بہت پسند آیا ہے اس کو۔ تم سو رہی تھیں تو ہم نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"اچھا گرینڈ ما...... میں جاتی ہوں۔" وہ جوش سے کھڑی ہوئی۔

"اور ہاں......" مونا میم کو کچھ یاد آیا۔ میرب عرف میری دروازے تک پہنچ کر پلٹی۔

"وہ اختشام کا فون آیا تھا۔ وہ راستے میں ہے، بس پہنچتا ہی ہوگا وہ آتا ہے تو میں تمہیں بلواتی ہوں۔"

"او کے ...... اب میں جاؤں۔" اس نے اجازت طلب کی۔

"جاؤ۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

اس کے جانے کے بعد وہ شہر بانو سے مخاطب ہوئیں۔

"اتنے ماڈرن ملک میں رہنے کے باوجود، تم نے ان دونوں کا کوئی رابطہ نہیں کروایا۔"

"میری کا اپنا کوئی انٹرسٹ نہیں تھا۔ نہ لڑکے میں، نہ رابطہ رکھنے میں تو میں نے بھی زور نہیں دیا۔" انہوں نے چائے کی پیالی ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اس کی ساری دلچسپی اور توجہ کا مرکز یہاں آپ کے پاس رہنا تھا۔ اب اس کے پاپا نے یوں تو اس کو آنے نہیں دینا تھا سو اس نے شادی کے لیے ہامی بھر لی۔" مونا میم نے سر ہلایا، پھر ان لوگوں کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"بھئی بچو! تم نے شہر بانو کی مدد کروانی ہے شادی کی تیاری کے سلسلے میں۔" محب اللہ، انس، عادل اور حیدر نے سر ہلایا پھر وہ مونا میم کی ہدایات سننے لگے۔

☆☆☆

میرب، ایک ایک چیز کو دیکھ کر بے تحاشا خوش ہو رہی تھی۔

جب سائیکل اس کو بلانے آیا۔

"باجی! وہ بھائی صاحب آ گیا ہے۔ مونا میم آپ کو بلا رہی ہے۔ آپ آ جاؤ۔"

"اچھا، میں آ رہی ہوں۔" سائیکل کو واپس بھیج کر اس نے جلدی جلدی ہاتھوں سے بال سنوارے۔ شیشے میں اپنا جائزہ لیا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔

ہونے والے لائف پارٹنر سے پہلی ملاقات، وہ ساری زندگی مغرب میں گزارنے والی اندر سے

رتی لڑکی اچھا خاصا گھبرا رہی تھی۔

ٹیرس عبور کر کے وہ سیڑھیوں تک پہنچنے ہی والی تھی کہ کوئی اجنبی نوجوان اپنی دھن میں گاتا گنگناتا اوپر آتا دکھائی دیا۔ (یہ ان چاروں میں سے تو نہیں ہے جن سے میں نیچے ملی ہوں) تو پھر......

احسن بھی اپنے گھر کی انٹرنس پر اجنبی حسین چہرہ دیکھ کر تھوڑا گھبرا گیا۔

"تو آپ اوپر ہی آ گئے......؟" کچھ شرماتے ہوئے وہ لڑکی اس سے مخاطب تھی۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

"میں نیچے ہی آ رہی تھی آپ سے ملنے۔" میری اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"دیکھیے ایسا مذاق نہ کیجیے۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔" بمشکل احسن کے منہ سے نکلا۔

"اچھا چلیں! آئیں، آپ بھی گھر دیکھ لیجیے۔ اتنا پیارا سیٹ کروایا ہے گرینڈ ما نے۔" لڑکی کا اعتماد بحال ہو چکا تھا سو دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "جی میں دیکھ چکا ہوں۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"آئیے نا، دونوں مل کر دیکھتے ہیں۔" کہتے ہوئے وہ اندر کی جانب بڑھی۔

احسن ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ذہن میں کہیں ماں سے کہا ہو جملہ گونج رہا تھا۔

"مجھے اگر کسی حسینہ نے پھنسانے کی کوشش کی تو فوراً پھنس جاؤں گا۔"

اب وہ دونوں رینوویٹڈ پورشن کے اندر کھڑے تھے۔ دماغ کہہ رہا تھا لڑکی کی غلط فہمی فوراً دور کر دے۔ جب کہ دل کہہ رہا تھا۔ "ابھی نہیں...... تھوڑی دیر اور ٹھہر جا۔"

"کتنی خوب صورت کلر اسکیم ہے نا؟" اس نے تائید چاہی۔

"آپ سے زیادہ خوب صورت تو کچھ بھی نہیں یہاں......" احسن نے بمشکل خود کو کہنے سے باز رکھا۔

کچھ شور شرابے اور باتوں کی آواز نے ان کی توجہ اپنی جانب کھینچی۔ احسن فوراً — باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے میرب بھی باہر آ گئی۔

ٹیرس کے دوسری جانب وہ چاروں اپنے پورشن کی طرف جاتے جاتے احسن اور اس کے پیچھے کھڑی میری کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئے۔ چاروں انتہائی معنی خیزی سے کھڑے ان کو دیکھ رہے تھے۔ احسن ان لوگوں کو دیکھنے کے بجائے آسمان پر اڑتے پرندے دیکھ رہا تھا۔

"میری باجی! وہ صاحب کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ مونا میم بول رہی ہیں جلدی نیچے آؤ۔" کوئی فسوں تھا جو سائیکل کی آواز سے ٹوٹا تھا۔

"کون انتظار کر رہا ہے......؟" وہ حیرت سے سائیکل کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کا ہونے والا صاب باجی۔" اس نے اپنے الفاظ میں وضاحت کی اور جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔

"تو پھر آپ کون ہیں......؟" وہ احسن کی جانب گھومی۔

"میں کوئی نہیں ہوں......"

"میں کہیں نہیں ہوں......"

اس کا دل چیخ چیخ کر صدائیں بلند کر رہا تھا۔

"میں کرائے دار ہوں۔" دل گرفتہ سے انداز میں کہتا وہ اپنے ساتھیوں کی سمت بڑھا۔

"نام تو بتاتے جائیں۔"

اپنے پیچھے اس پری چہرہ کی آواز سنی اس نے۔ احسن کی زبان بولنے سے انکاری ہو گئی۔ اچانک ملنے والی خوشی اور پھر صدمے نے گویائی چھین لی تھی۔

دوستوں کی تقلید میں وہ اپنے پورشن میں داخل ہوا۔ دروازہ بند کرنے کے لیے مڑا تو وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

اک نئی کہانی کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔

☆☆

ناولٹ

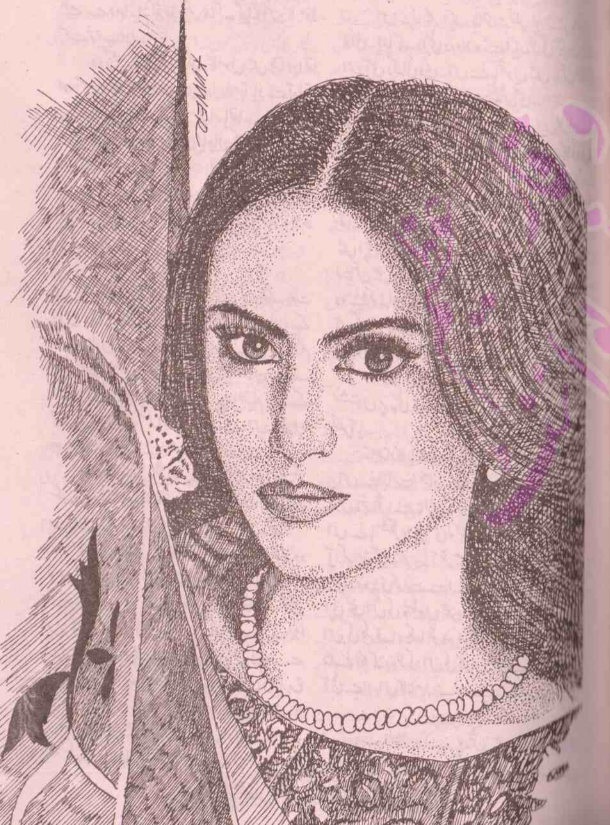

حُمیرا شفیع

بہار آنے کو ہے

ذیشان آج بے حد مصروف تھا کیونکہ شام کو گھر میں اس کے بڑے بھائی کے نکاح کی چھوٹی سی تقریب منعقد کی جا رہی تھی اور ابا جان نے انتظامات کی تمام تر ذمہ داری اس کے سر پر ڈال دی تھی۔ اس لیے اس وقت بھی وہ احاطے میں کھڑا اپنے خاندانی نائی کو کھانے سے متعلق ضروری ہدایات دے رہا تھا۔

"بس چاچا شیدے! اتنا خیال رکھنا کہ بریانی میں بوٹیاں وافر مقدار میں ہوں تاکہ مہمان آپس

میں چھینا جھپٹی نہ کریں اور نہ ہی جاتے جاتے شکایت کریں کہ خالی چاول ہی ہاتھ آ سکے۔" وہ فکرمندی سے گویا ہوا۔

چاچا شیدا کچھ دیر تک اپنے گنجے سر کو کھجاتا رہا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"شانی پتر! اتنی تمہاری عمر نہیں ہے جتنا میرا تجربہ ہے۔ تم لاکھ کھلا گوشت ڈلوا لو چاولوں میں لوگ کھائیں گے بھی، ضائع بھی کریں گے اور جاتے جاتے نقص بھی ضرور نکالیں گے۔ برسوں سے ہماری ناشکری قوم کا یہی شیوہ ہے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں چاچا جی! مگر ابا جان کو اگر کوئی کمی بیشی محسوس ہوئی تو انہوں نے طوفان کھڑا کر دینا ہے۔" وہ حقیقی معنوں میں مہمانوں سے زیادہ ابا جان سے خائف تھا۔

"تم فکر نہ کرو۔ ان شاء اللہ سب اچھا ہو جائے گا۔" چاچا شیدے نے اسے تسلی دی اور مسالوں سے بھری ٹرے اٹھا کر صاف کرنے لگا۔

وہ بھی احاطے کے دوسرے حصے میں چلا آیا جہاں مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیوں اور دیگر ساز و سامان کا ڈھیر دھرا تھا۔ اگرچہ مہمانوں کی تعداد محدود رکھی گئی تھی۔ صرف خاندان بھر سے چیدہ چیدہ افراد کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی تسلی کرنا چاہ رہا تھا کہ سامان پورا ہی آیا ہے۔ کوئی چیز کم تو نہیں ہے۔ ابھی اس نے گنتی شروع کی ہی تھی کہ گڈو بھاگتا ہوا آیا اور زور سے بولا۔

"شانی بھیا! ابا بلا رہے ہیں۔" وہ سخت بدمزہ

ہوا۔ اس نے گڈو کو گھور کر دیکھا اور گنتی جاری رکھی۔ گڈو پھر بے صبری سے بولا۔

''بھیا! ابا جان جلدی بلا رہے ہیں۔''

''کیا مصیبت ہے؟ آ رہا ہوں۔ تم جاؤ۔'' وہ غصے سے دھاڑا۔ گڈو ڈر کر بھاگ گیا۔ اس کا موڈ سخت خراب ہوا۔

وہ صبح سے تن تنہا مختلف کاموں میں جتا ہوا تھا اور جس کا نکاح تھا وہ جب سے اسلام آباد سے آیا تھا تب سے کمرہ بند کر کے آرام فرما رہا تھا۔

اوپر سے گھڑی گھڑی ابا جان کی ہدایات نشر ہو رہی تھیں۔

اس نے ایک دفعہ پھر سامان گن کر اپنی تسلی کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا رہائشی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

لندن کا موسم آج خاصا خوش گوار تھا۔ بہت دنوں کے بعد مدھم سی دھوپ چمکی تھی اور یہاں کے رہنے والوں کے لیے یہ مریل سی دھوپ بھی ہفت اقلیم کی دولت کی طرح تھی۔ اسے اپنے پاکستان کی چمک دار اور روشن دھوپ یاد آئی اور بے اختیار اس کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

یونیورسٹی کا ہال طلباء سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مگر سکوت اور ڈسپلن بلا کا تھا۔ سیمینار کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا اس لیے سب ہی اپنی اپنی جگہ مصروف تھے۔

اس کا یہاں آنے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو اپنے فلیٹ میں کسل مندی سے لیٹا تھا۔ مگر حماد اسے زبردستی کھینچ کھانچ کر لے آیا تھا۔ دراصل پریزنٹیشن بھی اسی کی تھی۔ مگر رات کو اس نے ایک بڑا سائز اسٹرابری شیک کا چڑھا لیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا حساس گلا بند ہو چکا تھا۔ اب وہ گونگوں کی طرح اشاروں میں ہی بات چیت کر رہا تھا۔ چونکہ اس کا آرٹیکل شیڈول میں شامل تھا۔ اس لیے اب اسے کینسل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ہنگامی طور پر اسے تیار کیا تھا کہ وہ اس کا آرٹیکل پڑھ دے۔ اسی سلسلے میں وہ انتظامیہ سے مذاکرات کرنے اسٹیج کے پیچھے گم ہوا تھا اور وہ بے زار بیٹھا دل ہی دل میں اسے کوس رہا تھا۔

اس نے پھر ایک طائرانہ نظر پورے ہال پر ڈالی۔ اچانک داخلی دروازہ سے ایک لڑکی عجلت میں اندر آتی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھوں میں فائل تھامی ہوئی تھی۔ غالباً اس کی بھی پریزنٹیشن تھی۔

بے حد عام سی شکل و صورت والی اس لڑکی کے سراپے میں اسے جس چیز نے متاثر کیا وہ اس کا دوپٹہ لینے کا انداز تھا۔ ہلکے سبز رنگ کے دوپٹے کو اس نے بڑی اچھی طرح سے اسکارف اسٹائل میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ پاکستان میں اپنی ماں اور بہن یاد آ گئیں۔ وہ بھی بالکل اسی اسٹائل میں دوپٹہ اوڑھا کرتی تھیں۔ وہ اکثر ان کے دوپٹے کو مذاق میں بیڈ شیٹ کہا کرتا تھا۔ مگر جب لندن میں گوری میموں کی ننگی پنڈلیاں دیکھ کر اس کا جی الٹتا تھا۔ تو اسے ان دوپٹوں کی بڑی یاد آتی تھی۔

وہ لڑکی اس کے پاس سے گزرتی ہوئی پچھلی نشستوں پر چلی گئی۔ اتنے میں حماد اسے اپنی جانب نظر آیا۔

سیمینار کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اپنی باری آنے پر اس نے نہایت اعتماد سے آرٹیکل پڑھا۔ حماد پورے جوش و خروش سے تالیاں بجا بجا کر اسے داد دیتا رہا۔ اس نے بامشکل اپنی ہنسی کو کنٹرول کیا اور اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ تقریباً آخر میں اس لڑکی کی پریزنٹیشن تھی۔ وہ بڑی محویت سے اسے سن رہا تھا جب حماد نے اپنی کہنی اس کی پسلیوں میں چبھوئی۔ اس نے کراہ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بتانے لگا کہ وہ لڑکی اس کی کلاس فیلو ہے۔ انڈیا سے آئی ہے اور اس کا نام زینب نور ہے۔

☆☆☆

جب ذیشان اپنے پورشن میں داخل ہوا تو برآمدے میں اماں، ابا اور پھوپھو سرگوشیوں میں

باتیں کر رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر سب خاموش ہو گئے وہ ذرا زیادہ قریب آیا تو اماں نے اسے دیکھتے ہی دوپٹہ منہ پر رکھ لیا اور چھکوں پھکوں رونا شروع کر دیا۔ وہ بے حد گھبرا گیا۔

''کیا ہوا......؟ کیا ہوا ہے اماں!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو اماں روتے روتے بامشکل بولیں۔

''شانی بیٹا! علی چلا گیا ہے......!''

اس کے سر پر گویا آسمان پھٹا۔ ''کیا......؟ علی چلا گیا؟ ہائے میرا جوان جہان بھائی چلا گیا......! کیسے چلا گیا؟''

اس نے ماتمی انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹنا شروع کیا تو پھوپھو اس کا مطلب سمجھ کر تڑپ اٹھیں۔

''تمہارے منہ میں خاک شانی! علی اس دنیا سے نہیں اس گھر سے چلا گیا ہے......؟ وہ نکاح نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

مگر آخر کیوں؟ وہ نکاح کیوں نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔''

اس نے ہونق پن سے پوچھا۔

اس کے سوال کے جواب میں ابا جان نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور خاموشی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ مڑا تڑا سا کاغذ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

پیاری اماں جان!

السلام علیکم! میں نے بار بار شادی سے انکار کیا۔ اشاروں کنائیوں میں کچھ بتانا چاہا مگر آپ لوگوں نے میری ایک نہ سنی اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ تنگ آ کر میں نے ہی گھر آنا چھوڑ دیا۔ اب آپ نے اچانک ابا جان کے بیمار ہونے کا بہانا بنا کر اچانک بلوایا تو میں پریشان ہو کر فوراً چلا آیا۔

مجھے کیا خبر تھی کہ آپ نے یوں اچانک میرے نکاح کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ کھٹک تو میں اسی وقت گیا تھا جب بس سے اتر کر گھر آتے ہوئے میں نے ابا جان کو بھلا چنگا گلی کے نکڑ پر دودھ ملائی پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ باقی اصل بات گھر آ کر معلوم ہوئی۔ اب میں آپ سب پر واضح کر دوں کہ میں نے بھی اپنا دل یہاں پر کسی کو دے رکھا ہے۔ اب یہ میرا دل ہے کوئی موبائل کا چارجر نہیں تو جو میں کسی کو ادھار دے کر پھر واپس مانگ لوں۔ اس لیے جا رہا ہوں ہو سکے تو معاف کر دینا۔

آپ کا ناخلف بیٹا علی حیدر

علی کا خط پڑھ کر اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔ اس کا سیدھا مطلب یہی تھا کہ اب دیگوں اور باقی تمام ساز و سامان کا کرایہ اسی اکیلے کو اپنی جیب سے بھرنا ہوگا۔

ابھی وہ گومگو کی کیفیت میں ہی تھا کہ اماں، ابا اور پھوپھو اس کے زیادہ قریب آ گئے۔ اماں نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ پھوپھو شفقت سے کمر سہلانے لگیں اور ابا جان اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس کو اپنا آپ اس جانور کی طرح لگ رہا تھا جس کی تھوڑی دیر بعد قربانی کی جانی ہو۔

پیار کے اس مظاہرے پر اسے کچھ کچھ انہونی کا احساس ہو رہا تھا۔ اماں نے آخرکار بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی۔

''شان پتر! علی چلا گیا تو کیا ہوا......! اب ہم تمہارا نکاح ثانیہ سے کر رہے ہیں...... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں......!''

برآمدے کے گویا چاروں ستون اس پر آ گرے۔ اس ہنگامی صورت حال میں اس کے منہ سے فقط گھسا پٹا سا ڈائیلاگ ہی نکل سکا۔

''میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔ میں تو ثانیہ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔''

''اوئے شادی سے پہلے میں بھی تمہاری ماں کو اپنی بہن ہی سمجھتا تھا۔'' ابا نے اس کے اعتراض کو گویا ہوا میں اڑا دیا۔

ابا کے اس انکشاف پر اماں تھوڑا سا شرمائیں۔ اس نے بھی اپنے اندر حوصلہ پیدا کیا اور سلطان راہی

مرحوم کی یاد تازہ کرتے ہوئے بھڑک لگانی چاہی مگر ایک منمناتی ہوئی آواز ہی حلق سے برآمد ہوئی۔

''میں یہ شادی ہرگز نہیں کرسکتا۔''

''کیسے نہیں کرسکتے؟'' یہ شادی ہوگی اور ابھی ہوگی...... ابا جان نے اس کے کندھے پر زوردار ہاتھ مارا اور گرجے۔

''تم لوگوں نے مجھے بتا کمزور سمجھ لیا ہے۔ ایک تو بھاگ گیا ہے اور اب اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو میں اس ٹوکی سے تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔''

انہوں نے اوپری شیلف پر پڑے ٹوکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سفاکی سے کہا تو وہ جی جان سے فرار ہوگیا۔

''اب فوراً اپنے کمرے میں جاؤ اور دولہا بننے کی تیاری کرو۔'' انہوں نے آخری حکم دیا اور محفل برخاست کردی۔ وہ مرے مرے قدموں سے اندر کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

جونہی وہ فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو الیاس اسے اتنی جلدی واپس آتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''تم اتنی جلدی چلے آئے......؟ ابا جان تو خیریت سے تھے......؟''

''ہاں! ابا جان تو خیریت سے تھے مگر انہوں نے میری تباہی کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ شام میں نکاح تھا میرا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔'' اس نے تفصیلاً بتایا تو وہ بھی پریشان ہوگیا۔

''اب کیا ہوگا علی......؟''

''کچھ نہیں ہوگا...... خط لکھ کر رکھ آیا ہوں۔ دو چار گالیاں دے کر ٹھنڈے ہوجائیں گے۔'' اس نے گویا ایک طرح سے خود کو تسلی دی۔

''بس یار! تم مجھے جلدی سے کچھ کھانے کو لادو۔ بڑی زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ صبح بس ایک خالی کپ چائے کا نصیب ہوا تھا۔ وہ بھی کام والی ماسی نے شاید سالن والی پتیلی میں پکا کردی تھی۔ ابھی تک حلق میں مرچیں چبھ رہی ہیں۔''

''اچھا میں کچھ لاتا ہوں۔'' الیاس کچن میں چلا گیا اور علی صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔

☆☆☆

ذیشان اسٹیج پر دولہا بنا سخت بیزار بیٹھا تھا۔ ہنگامی بنیادوں پر اس نے علی حیدر کے جو کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ وہ اس کے سائز سے بہت چھوٹے تھے۔ علی حیدر نہ صرف جسامت میں اس سے دبلا تھا بلکہ قد کاٹھ میں بھی چھوٹا تھا۔ اس لیے اس کا سفید کرتا اس کے موٹے تازے وجود پر بری طرح سے پھنسا ہوا تھا اور شلوار اتنی اونچی تھی کہ ایک طرف سے لانگ نیکر معلوم ہو رہی تھی۔

اس نے پہلے ہی اپنے ایک دو قریبی دوستوں کو بھائی کے نکاح کی تقریب میں بلا رکھا تھا۔ مگر اب اچانک جب بھائی کے نکاح کی تقریب اس کے اپنے نکاح میں بدل گئی تھی تو ان ہی ایک دو دوستوں نے میسج کرکے اس کے تمام دوستوں کو بلالیا تھا۔

وہ سڑی ہوئی شکل بنا کر بیٹھا تھا مگر اس کے دوست اس کی اندرونی حالت سے بے نیاز مبارک باد دے رہے تھے۔ زبردستی گلے مل رہے تھے۔ کلو بھر مٹھائی مذاق ہی مذاق میں اس کو کھلائی بلکہ ٹھنسائی جاچکی تھی۔ ان کو اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ شادی کن حالات میں ہو رہی ہے۔ وہ خوش ہے یا ناخوش۔ ان کے نزدیک تو اس کی اصل خوش نصیبی اس کا یوں اچانک بیٹھے بٹھائے دولہا بن جانا تھا۔

وہ سب تو ایک عرصے سے اپنے لیے اس نیک گھڑی کو ترس رہے تھے مگر ابھی تک ان کے سہرے کے پھول کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ وہ اس کے ناشکرے پن پر اسے لتاڑ بھی رہے تھے۔ دوسری طرف پوری تقریب میں ابا جان نے اسے ذرہ برابر بھی لفٹ نہیں کروائی تھی۔ اور مسلسل اپنے دوستوں میں مصروف رہے تھے۔

پھر نکاح ہوا۔ کھانے کا دور چلا۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ اس کے دوست بھی ہنستے گاتے اس کو چھیڑتے ایک ایک کرکے چلے گئے۔ وہ اسٹیج پر اکیلا

بیٹھا فضا میں کچھ گھورتا رہا۔ ذہنی رو بھٹک کر ثانیہ کی طرف چلی گئی۔ اس نے تو پھر کچھ نہ کچھ احتجاج کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس بے چاری کو تو شاید اتنا بھی موقع نہ مل سکا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے تمام کزنز میں سب سے زیادہ ثانیہ سے بے تکلف تھا مگر اس حوالے سے تو اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ پھر وہ اس کے بھائی سے منسوب تھی اور اس کی بھابھی کے رتبے پر فائز ہونے جارہی تھی۔ کیا پتا تھا کہ بھابھی کے بجائے بیوی بنادی جائے گی۔''

''ہائے ابا مرواڈالا......'' وہ دیر تلک بیٹھا سوچتا رہا اور پھر شکستہ قدموں سے اندرونی پورشن کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

زینب نور کو دوسری دفعہ اس نے ایک ریسٹورنٹ میں دیکھا جہاں وہ حماد کے ساتھ سوپ پینے گیا تھا۔ وہ بھی اپنی ایک دوست کے ہمراہ تھی۔ حماد کی چونکہ کلاس فیلو ہونے کی وجہ سے پہلے ہی سے شناسائی تھی۔ اس لیے اس نے جھٹ آگے بڑھ کر ہیلو ہائے کی اور ساتھ ہی اس کا تعارف بھی کروادیا۔

اس بلا کی سردی میں وہ دونوں بھی سوپ پینے ہی آئی تھیں۔ اس ریسٹورنٹ کا یہ اصول تھا کہ اگر چار لوگ مل کر ایک ہی ڈش کا آرڈر دیں تو خصوصی ڈسکاؤنٹ ملتا تھا۔ لندن جیسے مہنگے شہر میں یہ ڈسکاؤنٹ کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

حماد نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہی ٹیبل بک کروالی۔ اس نے دیکھا کہ وہ آج بھی اپنے مخصوص اسٹائل میں شال لپیٹے ہوئے تھی جبکہ اس کی دوست باب کٹ بالوں کے ساتھ لانگ اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ دونوں لڑکیوں کی موجودگی میں حماد کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

وہ خاموشی سے سوپ پی رہا تھا جبکہ زینب پرسکون لہجے میں حماد کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ اس کا باپ انڈین مسلمان تھا جبکہ ماں انگریز تھی۔

الف لیلہ
ہزار داستانیں

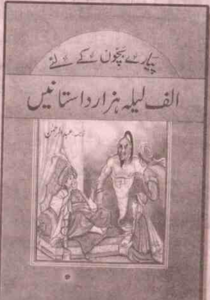

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ -/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہء عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

اس کو بے پناہ حیرت ہوئی کیونکہ اس کی گہری سانولی رنگت کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے خون میں کسی گوری کے خون کی آمیزش بھی شامل ہوگی۔ شاید وہ پوری کی پوری اپنے باپ پڑی تھی۔

اس کا باپ اس کی ماں کو انڈیا لے گیا تھا۔ وہ بھی وہیں پیدا ہوئی تھی۔ زندگی کے پہلے دس سال اس نے وہیں گزارے۔ اس کی اسکولنگ بھی وہیں کی تھی۔ پھر وہاں کی گرد آلود فضا اس کی ماں کو راس نہ آئی اور جب اس کا دمہ بہت بگڑ گیا تو ناچار اس کے باپ کو پھر دوبارہ لندن شفٹ ہونا پڑا۔ مگر اب بھی وہ اپنے باپ کے ہمراہ اکثر اپنے ددھیالی رشتہ داروں سے ملنے دہلی جاتی رہتی تھی۔

اس کی رنگت کے پیش نظر اکثر کلاس فیلو یہی سمجھتے تھے کہ وہ شاید حال ہی میں انڈیا سے آئی ہے حالانکہ وہ اب کئی سالوں سے مستقل لندن میں ہی رہائش پذیر تھی۔

☆☆☆

سب سے پہلے اس نے واش روم میں جا کر علی حیدر کے کپڑوں سے نجات حاصل کی اور وہاں لٹکتا ہوا اپنا پرانا شلوار سوٹ پہنا۔ پھر ہولے ہولے چلتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ سامنے بیڈ پر ایک طرف پھوپھو اور دوسری طرف اماں جان محو استراحت تھیں۔ ان کے منہ سے دو مختلف سروں کے خراٹے نکل کر عجیب سی موسیقی بکھیر رہے تھے۔ وہ حیران پریشان سا تھوڑا اور آگے بڑھا اور پھر اچانک کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل فرش پر گرتے گرتے بچا۔

اس نے حلق سے برآمد ہونے والی بے ساختہ چیخ کا منہ پر ہاتھ رکھ کر بامشکل گلا گھونٹا مگر پھر کسی کے کراہنے کی آواز پر پلٹ کر دیکھا تو ششدر رہ گیا۔

دلہن بنی ثانیہ اپنا گھٹنا پکڑے رکوع کی حالت میں جھکی ہوئی تھی۔ وہ غالباً قالین پر سو رہی تھی اور اس کا پاؤں اس کے لہنگے سے الجھا تھا۔ اب وہ دونوں پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ثانیہ کا کاجل پھیل چکا تھا۔ بالوں کی آوارہ لٹیں دوپٹے کی قید سے آزاد ہو کر ادھر ادھر جھول رہی تھیں۔ ہونٹوں کے کناروں سے باہر نکلتی ہوئی لپ اسٹک اس کو مزید مضحکہ خیز بنا رہی تھی۔ پھر وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''سارے گھر کی بتی چلی گئی تھی۔ صرف اسی کمرے میں یو پی ایس پر پنکھا چل رہا تھا۔ پھوپھو اور تائی اماں یہیں بیڈ پر باتیں کرتے کرتے سو گئیں تو میں بھی نیچے کارپٹ پر لیٹ گئی تھی۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ مختصراً بولا اور پھر ڈرائنگ روم میں آ کر ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

سراج دین اور تاج دین دو بھائی تھے۔ سراج دین کی بیگم کا نام رفعت آرا تھا جبکہ تاج دین کی بیگم کا نام عالیہ جہاں تھا۔ دونوں بھائیوں میں تو مثالی سلوک تھا۔ البتہ دیورانی جٹھانی کے تعلقات میں اکثر اتار چڑھاؤ آتا رہتا تھا۔

سراج دین کے تین بیٹے تھے۔ علی حیدر نے ذیشان عرف شان اور گڈو جب کہ تاج دین کے صرف دو بچے تھے۔ بیٹا وقار اور بیٹی ثانیہ۔ رفعت آرا کے میکے میں تو صرف ایک بھائی تھا جو برسوں پہلے کینیڈا جا بسا تھا۔ جبکہ عالیہ جہاں کے میکے میں ایک بھائی اور بہن موجود تھے۔ بھائی وکیل تھے جو چند گلیاں چھوڑ کر رہائش پذیر تھے۔ وکیل بھائی کا فقط ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام عالیان تھا۔ ان کی بہن سلیمہ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں اور اپنی ایک پیاری سی بیٹی نیلم کے ساتھ بھائی کے گھر میں ہی رہتی تھیں یعنی ان ہی کی زیر کفالت تھیں۔

نیلی نیلی سی آنکھوں اور پریوں جیسے حسن کی ملکہ نیلم میں تو گویا اس کی خالہ عالیہ جہاں کی جان بند تھی۔ اپنی ماں سے زیادہ اس نے اپنی خالہ کی گود میں پرورش پائی تھی۔

نیلم کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے اکلوتے بھتیجے عالیان سے بھی بہت پیار تھا۔ دونوں بچے اکثر ان ہی کے آنگن میں پائے جاتے۔ خاندان کے سبھی بچوں کی عمروں میں چونکہ سال دو سال کا ہی فرق تھا۔ سوائے گڈو کے۔

اس لیے ان کے شوق اور دلچسپیاں بھی تقریباً ایک جیسی تھیں۔ جب ثانیہ اور نیلم گڑیا کا گھر گھر کھیلتیں تو علی حیدر، ذیشان، وقار اور عالیان بھی ان کے کھیل میں شامل ہو جاتے اور جب تمام لڑکے کرکٹ کھیلتے تو دونوں لڑکیاں بھی بیٹ بال اٹھا لیتیں۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ یونہی کھیلتے کودتے بچے بچپن سے لڑکپن میں آ گئے۔

☆☆☆

ایک خاندانی تقریب میں سب جمع تھے۔ نیلم سرخ رنگ کے انارکلی فراک میں تتلی بنی گھوم رہی تھی۔ اس کی خالہ عالیہ جہاں کو اس پر اتنا پیار آیا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکیں اور انہوں نے اچانک بیٹھے بٹھائے اسے اپنے بیٹے وقار کی دلہن بننے کا اعلان کر دیا۔

عورتوں میں چونکہ مقابلے کی سی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ان کی بھاوج نے بھی پیچھے رہ جانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ نجانے کب سے اپنے اکلوتے بیٹے عالیان کے لیے دل ہی دل میں ثانیہ کو پسند کیے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے عالیہ جہاں سے بھی زیادہ جذباتی پن کا مظاہرہ کیا۔

بچوں میں گھسی ثانیہ کو کھینچ کھانچ کر خود سے لپٹا لیا اور پھر اپنے گلے سے سونے کی نازک سی چین اتار کر اس کے گلے میں ڈال دی۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بھی ثانیہ کو اپنی بہو منتخب کر چکی ہیں۔

بچے تو اگرچہ ابھی کوئی واضح رائے دینے کے قابل نہ تھے۔ ان جوشیلے جذبات سے لبریز عورتوں نے اپنے اپنے شوہروں سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور جب اس فلمی طرز کی منگنی کی خبر مردانے میں پہنچی تو مردوں نے عورتوں کے حماقت بھرے جذباتی پن پر اپنا سر پیٹ لیا۔

وکیل صاحب اور تاج دین صاحب تو زیادہ متردد نہ ہوئے مگر سراج دین صاحب سخت کبیدہ خاطر تھے۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے علی حیدر کے لیے ثانیہ کا سوچے بیٹھے تھے اور کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہے تھے کہ بھاوج نے عجلت میں ان کی تمام منصوبہ بندی کو خاک میں ملا دیا۔

پھر جب انہوں نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو بھاوج کا میکے کی طرف فطری جھکاؤ دیکھ کر خود بھی خاموش ہو گئے اور رفعت آراء کو بھی سمجھا بجھا کر کسی بھی اعتراض سے باز رکھا۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ بچے کالج لیول سے یونیورسٹی اور پھر پریکٹیکل لائف میں آ گئے۔ علی حیدر نے ایم بی اے کرنے کے بعد ایک فرم جوائن کر لی۔ اس کی ایک برانچ اسلام آباد میں تھی یوں وہ اسلام آباد چلا گیا۔ وقار اسکالرشپ پر انگلینڈ چلا گیا۔ ذیشان نے اپنے ابا اور چچا جان کے ساتھ کاروبار میں شرکت کر لی۔ جبکہ عالیان اپنے باپ کی طرح وکالت کی پریکٹس کرنے لگا۔

ثانیہ نے ایم اے کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا جبکہ نیلم نے ایم اے انگلش کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

آج کل وقار انگلینڈ سے آیا ہوا تھا۔ اس لیے خاندان بھر میں خوب ہلا گلا رہتا تھا۔ تمام کزنز مل جل کر خوب گپ شپ لگاتے۔ کبھی پکنک کا پروگرام بن جاتا اور کبھی گھر پر ہی پارٹی رکھ لی جاتی۔ عالیہ جہاں کا ارادہ تھا کہ وہ وقار اور نیلم کے نکاح کی چھوٹی سی تقریب منعقد کر لیں اور پھر جب وقار تعلیم ختم ہونے کے بعد مستقل پاکستان آ جائے تو رخصتی کروا لیں۔

اس سلسلے میں وہ اس سے مشورہ کرنا چاہ رہی تھیں۔ جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ واش روم میں تھا۔ وہ اس کی بیڈ شیٹ ٹھیک کر رہی تھیں جب اس کا موبائل بجنے لگا۔ انہوں نے نظر

انداز کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بجنے لگا تو تنگ آ کر انہوں نے آن کر کے ہیلو کہا تو دوسری طرف باریک سی نسوانی آواز میں کوئی لڑکی انگریزی میں بات کر رہی تھی۔ اس کی گٹ مٹ تو ان کو قطعاً سمجھ نہ آئی۔

وہ مسلسل اپنے ٹوٹے پھوٹے تلفظ کے ساتھ وقار کا نام لے رہی تھی۔ انہوں نے فون بند کر دیا۔ جب وقار واش روم سے باہر آیا تو انہوں نے اس کو لڑکی کے فون کی بارے میں بتایا تو وہ بے اختیار چونک گیا۔ اس نے فوراً اپنا موبائل اٹھایا اور باہر گیلری میں جا کر آہستہ آواز میں بات کرنے لگا۔

عالیہ جہاں کی جہاں دیدہ نظروں سے اس کا یوں چونک جانا اور پھر پھیکا پڑ جانا چھپ نہ سکا۔ وہ سخت بے چین ہو گئیں۔ وہ تو پہلے ہی وہاں کے آزاد خیال ماحول سے خائف تھیں۔ پھر اس کے بعد بھی کئی دفعہ انہوں نے چپکے چپکے وقار کو ایک سرخ بالوں والی انگریز لڑکی سے لیپ ٹاپ پر محو گفتگو دیکھا تو مزید پریشان ہو گئیں۔

ویسے تو پاکستان میں بھی اس کی اپنی کئی کلاس فیلو لڑکیوں کے ساتھ ہیلو ہائے تھی۔ مگر اتنی راز داری اس نے کبھی نہ برتی تھی۔ یہاں ان کو دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔

انہوں نے سرسری سا استفسار کیا تو وہ ٹال مٹول سے کام لینے لگا۔ پھر انہوں نے علی حیدر سے مدد لی اور دوسرے دن ہی علی نے ان کو جو رپورٹ دی اس کو سن کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ دراصل وقار نے وہاں کسی انگریز لڑکی سے ''پیپر میرج'' کر رکھی تھی۔ یہ ایک طرح کی کاغذی شادی تھی جو معاہدہ ختم ہونے کے بعد ختم ہو جانی تھی۔ وہاں رہائش کے کچھ مسائل کی وجہ سے مجبوراً وقار نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

علی اس کی صفائی میں اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر عالیہ جہاں کا غصے سے برا حال تھا۔ شادی تو شادی ہوتی ہے۔ یہ آج کل کے بچوں نے شادی اور طلاق کو مذاق سمجھ رکھا ہے۔

ان کو نیلم اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ اور ایسی غیر یقینی صورت حال میں اس کا بندھن کسی ایسے لڑکے سے ہرگز نہیں باندھ سکتی تھیں جو پہلے سے شادی شدہ ہو (خواہ وہ اس کا اپنا لخت جگر ہی کیوں نہ ہو) اور یہ بات انہوں نے وقار کے سامنے بھی واضح کر دی۔

وقار چپ چاپ ماں کی سخت سست سنتا رہا۔ گھر میں شور سن کر تاج دین بھی وہاں آ گئے اور اصل قصہ سن کر ان کے پاؤں تلے سے بھی زمین نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی وقار کو زیر عتاب لاتے۔ وہاں موجود علی حیدر نے بامشکل سمجھا بجھا کر ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔

☆☆☆

خاندان میں اس طرح کی باتیں بھلا کب تک چھپی رہ سکتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ پول کھلے عالیہ جہاں نے اپنے ہمراہ تاج دین صاحب کو لیا اور بہن اور بھائی کو جا کر تمام قصہ کہہ دیا۔

وہ ان کو کسی اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ اپنی طرف سے تو انہوں نے نیکی کی تھی۔ مگر بعض اوقات نیکی بھی انسان کے گلے پڑ جاتی ہے۔ ان کی بہن سلیمہ تو صدمے سے گنگ ہو گئیں اور وکیل بھائی ہتھے سے اکھڑ گئے۔

انہوں نے دونوں میاں بیوی کو بے بھاؤ کی سنائیں کہ اگر ان کا بیٹا اتنا ہلکے کردار کا مالک تھا تو انہوں نے نیلم کے لیے ہاتھ ہی کیوں پھیلایا تھا۔

بات اس قدر بڑھی کہ نیلم اور وقار کی منگنی تو ختم ہونی ہی تھی ساتھ ساتھ عالیان اور ثانیہ کی نسبت بھی خطرے میں پڑ گئی۔ وکیل بھائی نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایسے بے اعتبار خاندان سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے۔

☆☆☆

دونوں میاں بیوی جب لٹے پٹے سے وکیل صاحب کے گھر سے واپس آئے تو سراج دین صاحب ان کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ پھر انہوں نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے اپنی دبی ہوئی خواہش کا اظہار بھی کر دیا کہ انہیں ثانیہ کے سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ تو کافی پہلے ہی سے ثانیہ کو اپنے علی حیدر کی دلہن بنانا چاہتے تھے۔ مگر بھاوج کا اپنے بھائی کی طرف جھکاؤ دیکھ کر خاموش ہو گئے تھے۔

ایک طرح سے انہوں نے بھی اسی تاریخی غلطی کا ارتکاب کیا جو چند سال پہلے عالیہ جہاں اور وکیل صاحب کی بیگم سے سرزد ہوئی تھی۔

اور اس پر سب سے زیادہ تنقید بھی انہوں نے ہی کی تھی۔ اور انہوں نے بھی جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے بیٹے کو اعتماد میں لیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ پل میں کر لیا۔

☆☆☆

نیلم کی یوں اچانک منگنی ٹوٹ جانے پر سلیمہ از حد پریشان تھیں۔ انہیں وقار سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔ پھر ان کے وکیل بھائی نے بھی اس خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا تھا۔ اگرچہ وہ شدید ذہنی اذیت کا شکار تھیں مگر پھر بھی اپنی بہن سے قطع تعلق نہ چاہتی تھیں۔ مگر کیا کرتیں وکیل بھائی سے متفق نہ ہونے کے باوجود مجبور تھیں۔

جب سے بیوہ ہوئی تھیں ان کے در پر پڑی تھیں ان کا اور ان کی بچی کا واحد سہارا وہی تھے۔ وہ ان کے مخالف کیسے جا سکتی تھیں۔

دوسری طرف نیلم کے لیے بھی ان کو کوئی دوسرا آسرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دراصل نیلم بچپن میں پولیو کا شکار ہو گئی تھی۔ اگرچہ بروقت علاج سے مرض پر قابو پا لیا گیا مگر اب بھی اس کی چال میں ہلکی سی لنگراہٹ باقی تھی۔

عالیہ جہاں نے تو خالہ ہونے کی وجہ سے اس معمولی خامی کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ اپنی بھانجی کو از حد چاہتی تھیں۔ مگر اب غیروں میں رشتہ ڈھونڈتے وقت نجانے ان کی بچی کو کن رویوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ لوگ تو اچھی خاصی صحت مند لڑکی میں نادیدہ نقص تلاش کر لیتے ہیں جبکہ ان کی بچی میں تو حقیقتاً ایک کمی موجود تھی۔

دوسری طرف ان کا اپنا بھتیجا عالیان بھی موجود تھا۔ اس کے بارے میں بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کیونکہ جب وہ صرف تین ماہ کا تھا تو ان کی بھاوج سخت بیمار ہو گئی تھیں۔ اس وقت نیلم ہی ان کی گود میں تھی تو اپنے بھائی کی درخواست پر انہوں نے عالیان کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ اس طرح سے وہ نیلم کا رضاعی بھائی تھا۔ ورنہ وقار سے بھی پہلے اس کے بھائی اپنے بیٹے کے بارے میں سوچتے۔

☆☆☆

اپنی ماں کی زبانی جب علی حیدر کو علم ہوا کہ ابا جان نے ثانیہ سے اس کی نسبت پکی کر دی ہے تو وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ وقار کو بچاتے بچاتے خود اسی بھنور میں ڈوب جائے گا۔ اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر جلاد صفت ابا جان کے آگے ایک نہ چلی۔

دوسری طرف عالیہ جہاں کا اپنے بہن بھائی سے قطعاً کوئی رابطہ نہ تھا حتیٰ کہ نیلم کو دیکھے ہوئے بھی کئی دن گزر چکے تھے۔ وہ بے حد رنجیدہ رہتی تھیں۔ اور اپنی اس دلی کیفیت کا اظہار اپنی جیٹھانی صاحبہ سے بھی کرتی رہتی تھیں۔

سراج دین صاحب بھی کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ ان کے دونوں بچوں کی شادی کے سلسلے میں اچھی خاصی بدمزگی ہو گئی تھی۔ پھر وہ وقار کے یوں خود سے بیاہ چا لینے پر بھی سخت کبیدہ خاطر تھے مگر کیا کرتے اب اکلوتے جوان بیٹے کے خلاف کر بھی کیا جا سکتے تھے۔

بھائی اور بھاوج کی اس جذباتی کیفیت سے متاثر ہو کر سراج علی حیدر کی ثانیہ سے جلد از جلد شادی کرنے کے چکر میں تھے۔ وہ علی حیدر پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ کچھ چھٹیاں لے کر گھر آئے تا کہ وہ اس کا بیاہ رچا سکیں۔ جبکہ علی حیدر مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ اس کے بقول اس کا کافی مسائل کا سامنا تھا۔ وہ معاشی طور پر اتنا مستحکم نہیں تھا کہ شادی

جیسی ذمہ داری اٹھا سکے پھر اس کو بھی اسلام آباد میں رہائش کا مسئلہ تھا۔

جبکہ سراج دین صاحب اب اس کی شادی میں زیادہ دیر نہیں چاہتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں خوف زدہ تھے کہ کہیں وہ بھی وقار کی طرح کوئی چاند نہ چڑھا دے۔ (اب ان کے فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے ایک چند چاند چڑھا چکا تھا)

پھر ایک دن انہوں نے اس کو اپنی بیماری کی اطلاع دے کر اچانک بلایا اور شام میں اس کے نکاح کی تقریب رکھ لی۔ گھر آ کر جب اسے اصل صورت حال معلوم ہوئی تو وہ حواس باختہ ہو کر واپس اسلام آباد بھاگ گیا۔

☆☆☆

ثانیہ اور شان کی شادی کے بعد سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ دونوں نے کسی نہ کسی حد تک سمجھوتا کر ہی لیا تھا۔ مگر رفعت آرا محسوس کر رہی تھیں کہ دونوں میاں بیوی میں بے تکلفی اور گرم جوشی کا فقدان ہے۔ ثانیہ چپ چاپ گھر کے کام نمٹائے جاتی اور شان بھی پہلے کی نسبت کافی سنجیدہ سا رہتا تھا۔ نہ کوئی شوخی نہ شرارت......

بچوں کی اس حالت پر ان کا دل کڑھ کر رہ جاتا۔ ایک دن وہ شان کے کمرے میں آئیں تو وہ اپنی شرٹ استری کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"بیٹا! ثانیہ سے کہہ دیتے، وہ استری کر دیتی۔"

"شاید کچن میں ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

"شان بیٹا! میں دیکھ رہی ہوں کہ تم پہلے سے بہت بدل گئے ہو۔ اتنے بجھے بجھے سے کیوں رہتے ہو......؟"

انہوں نے جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"نہیں امی جان یہ آپ کا وہم ہے۔" اس نے ماں کو زخمی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر اس کا لہجہ اس کے الفاظ کا ساتھ نہ دے پایا۔

رفعت آرا نے استری کا سوئچ آف کیا۔ پھر اس کو بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور خود اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے رسان سے بولیں۔

"دیکھو بیٹا! شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہوتی۔ یہ تو ایسا بندھن ہے جو تمام عمر نبھانا پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب کیا ثانیہ نے آپ سے کوئی شکایت کی ہے؟"

"نہیں بیٹا! وہ تو کوئی شکایت نہیں کرتی لیکن پہلے سے بہت گم سم ہو گئی ہے۔ بیٹا عورت تو پیار کی بھوکی ہوتی ہے۔ دو لفظ محبت سے اسیر ہو جاتی ہے۔ تم مرد ہو۔ اور عورت ہمیشہ مرد سے ہی پہلے اظہار کی توقع رکھتی ہے۔"

سیدھی سادی رفعت آرا آج اتنا گاڑھا فلسفہ بول رہی تھیں کہ شان حیرت زدہ رہ گیا۔

"امی جان!! پیار کا تو مجھے پتا نہیں۔ ہاں البتہ! وہ دہی بڑوں، سموسوں اور فروٹ چاٹ کی بڑی بھوکی ہے۔ وہ میں اکثر اس کو لا دیتا ہوں۔"

اس نے بات کو مزاح کا رنگ دے کر ماں کو ٹالنا چاہا۔ مگر حقیقت بھی یہی تھی وہ اور ثانیہ ابھی تک ذہنی طور پر ایک دوسرے کو قبول نہیں کر پائے تھے۔ اس نے پہلے ثانیہ کو عالیان کی منگیتر کے روپ میں دیکھا۔ پھر وہ کچھ عرصہ اس کے بڑے بھائی سے منسوب رہی اور اب اچانک اس کی جیون ساتھی بن بیٹھی۔

دونوں کو ان ذہنی جھٹکوں سے سنبھلنے کے لیے کچھ وقت تو چاہیے تھا۔

☆☆☆

آج سراج دین صاحب کے ایک جگری دوست نے دونوں خاندانوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ رفعت آرا نے ثانیہ کو تیار ہونے میں خصوصی ہدایات دیں۔ زیورات اور جوڑا خود نکال کر دیے۔ شان تیار ہو کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا خود پر پرفیوم چھڑک رہا تھا جب اسے شیشے میں کاسنی دوپٹے کی جھلک نظر آئی۔

"ذرا ایک سائیڈ پر ہٹیے۔ مجھے دراز سے اپنی

چوڑیاں نکالنی ہیں۔" ثانیہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ وہ پیچھے مڑا تو ساکت رہ گیا۔ کاسنی کامدار سوٹ میں بنی سنوری سی ثانیہ بہت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ ماں کی باتوں کا بھی اثر تھا کہ وہ اس کے خوشبوؤں سے مہکتے سراپے کو ایک ٹک دیکھتا رہا گیا تھا۔

اس کو یوں دیکھتا پا کر وہ شرم سے کچھ اور سمٹ گئی اور جلدی سے دراز کھول کر چوڑیاں نکالنے لگی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر دزدیدہ نظروں سے اسے تکتا رہا اسے یاد آیا کہ دلہن کے روپ میں وہ کتنی خوف ناک لگ رہی تھی۔ مگر آج اس دن کے مقابلے میں کتنی پیاری اور اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ شاید آج وہ اسے کسی اور نظر سے دیکھ رہا تھا۔

دعوت سے واپسی پر بھی گاڑی چلاتے ہوئے اس کے ذہن میں رفعت آرا کی باتیں چکراتی رہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسے پیار کے دو دو بول بولنے میں پہل کرنی چاہیے کیونکہ وہ مرد تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ پیار کے دو بول کہاں سے لے جائیں۔ اس کا ایسا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنی ایک کلاس فیلو کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا۔ مگر وہاں بھی ابھی اظہار و اقرار کی نوبت آئی بھی نہ تھی کہ وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔

رات کو جب ثانیہ سب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ تو اس نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور تمام رومانوی فلموں کے کلپس نکالے۔ ہر اس سین کو غور سے دیکھا جس میں ہیرو ہیروئن سے پیار بھرے ڈائیلاگ بول رہا تھا۔

بڑی مشکل سے اسے ایک فلم سے اپنے مطلب کی چیز مل گئی اور اس نے ایک کاغذ پر ہیرو کے تمام الفاظ ہو بہو نقل کر لیے کیونکہ وہ اسے کافی حد تک حقیقت سے قریب تر لگ رہے تھے۔

جوں ہی ثانیہ چائے لے کر آئی تو اس نے وہ صفحہ ایک کتاب میں چھپا دیا۔ ثانیہ کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر مڑی تو وہ بولا۔

"رکو جانو! ذرا سنو تو۔" ثانیہ نے اس کے طرز مخاطب پر حیرت سے اس کو دیکھا تو وہ ایک کتاب کھول کر اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا مگر مخاطب غالباً اس سے تھا۔

"جانم...... آج تم بہت حسین لگ رہی تھیں...... اتنی حسین جیسے پرستان کی پری ہو......"

ثانیہ منہ کھولے کھڑی دیکھتی رہی جبکہ وہ مسلسل کتاب میں منہ دیئے بولتا رہا۔

پرستان کی پری...... مجھے تم سے بہت پیار ہے...... تم بہت پیاری ہو۔ شبانہ (لفظ شبانہ پر ثانیہ کے منہ سے خوفناک چیخ برآمد ہوئی۔

"ہیں...... شبانہ کون......؟ کون ہے یہ شبانہ......؟؟"

وہ خوفناک تیوروں سے شان کو گھور رہی تھی۔ اس کے اندر کی سوتی ہوئی بیوی ایک دم سے جاگ گئی تھی۔

شان ایک دم گھبرا گیا اور اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر دور جا گری اور اس میں سے کاغذ نکل کر اڑتا ہوا ثانیہ کے قدموں میں آ گرا۔ شان نے بڑھ کر اٹھانا چاہا مگر اس سے پہلے ثانیہ اٹھا لیا۔ اور پڑھنے لگی۔

"وہ دراصل میں نے کسی فلم کا مکالمے لکھے تھے تو نادانستگی میں ہیروئن کا نام بھی لکھ لیا۔"

شان نے بوکھلا کر جلدی سے وضاحت کی تو ثانیہ ساختہ ہنس پڑی اور اس کی مدھر ہنسی کی جل ترنگ سارے کمرے میں پھیل گئی۔

☆☆☆

آج گھر بھر میں خوشیوں کی بارات اتری ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے شان اور ثانیہ کو اپنی رحمت سے نوازا تھا۔ ان کے ہاں ایک چاند سی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ سراج صاحب اور رفعت آرا خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کیونکہ ان کو بیٹی کی بہت چاہ تھی مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو تین بیٹوں سے نوازا تھا اور اب پوتی کی صورت میں ان کی دیرینہ خواہش بھی پوری کر دی تھی۔

سات دن بعد انہوں نے ننھی پری کا عقیقہ کرنا تھا اور اس سلسلے میں پورے خاندان کو دعوت نامے بھیجے جا چکے تھے۔ اس خوشی کے موقع پر ان کو علی حیدر بھی بے پناہ یاد آیا۔ اب ان کا تمام غصہ بھاپ بن کر اڑ چکا تھا۔ انہوں نے اس کو معاف کر دیا تھا اور عقیقے پر گھر آنے کی دعوت بھی دی تھی۔

دوسری طرف عالیہ جہاں بھی ثانیہ کو اپنے گھر میں خوش دیکھ کر بہت مطمئن تھیں۔ اور اب نواسی کی آمد نے اس سکون میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

وہ کہتے ہیں کہ خوشی اور غم دونوں صورتوں میں انسان کو اپنے خون کے رشتے یاد آتے ہیں۔

ان کے دل میں تو بہن بھائی سے جدائی کی کسک ہر وقت رہتی تھی مگر اس خوشی کے موقع پر ان دونوں کی یاد بے طرح ستا رہی تھی۔ حالانکہ کافی وقت گزر چکا تھا۔

سننے میں آیا تھا کہ نیلی کی بھی کہیں شادی ہو چکی تھی اور عالیان نے بھی اپنی کسی کولیگ سے شادی کروالی تھی۔ مگر ان لوگوں سے تعلقات ابھی تک بحال نہ ہو سکے تھے۔ دونوں طرف سے ایسی کوئی کوشش ہی نہ کی گئی تھی۔ ان کا جی تو کئی بار چاہا کہ وہ خود چل کر ان کے ہاں جائیں مگر پھر بھائی کے غصے سے خائف ہو کر ارادہ ترک کر دیتیں۔

دوسری طرف بھی مسلسل خاموش ہی رہی۔ شاید وہ سب ایک دوسرے سے پہل کی توقع کر رہے تھے۔ اور یہی جھجک انسانی رشتوں میں دراڑ کا سبب بنتی ہے۔ اگر خودساختہ انا کو پس پشت ڈال دیا جائے تو فاصلے بہت جلد سمٹ جاتے ہیں۔

سراج دین صاحب اپنی بھابھی صاحبہ کی گومگو کیفیت کو خوب سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک دعوت نامے وکیل صاحب کے گھر بھی بجھوادیا تھا۔ ذیشان نے نے اپنی بچی کی پیدائش کی اطلاع فوراً بیرون ملک وقار کو بھی دی تھی۔ وہ بھی اپنی ننھی بھانجی کی تصویر دیکھ کر بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے اماں ابا سے مسلسل رابطے میں رہتا تھا اور بظاہر تو ان دونوں نے بھی اس کی خطا کو معاف کر دیا تھا مگر وہ پہلے والی بے تکلفی اور مانوسیت کا فقدان تھا۔

وہ بے حد شرمندگی محسوس کرتا تھا۔ کئی بار معافی بھی مانگ چکا تھا۔ اور آخرکار کامیاب ہو گیا۔ آج تاج دین صاحب نے خود اسے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ بھی بچی کے عقیقے میں شرکت کرنے کے لیے پاکستان آئے۔ وہ تو پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ ابا کے فون پر جھٹ پٹ سامان باندھا اور تیار ہو گیا۔

☆☆☆

ذیشان آج پھر ایک بڑی دعوت کے انتظامات میں مصروف تھا۔ مگر آج اس کے جذبات اپنے نکاح والے دن سے قطعی مختلف تھے۔ اس کا دل محبت بھری شفقت سے لبریز تھا۔

نیا نویلا باپ بننے پر وہ عجیب سا جوش و خروش محسوس کر رہا تھا۔ انتہائی مصروفیت کے باوجود وہ کمبل میں لپٹی گلابی گلابی سی گڑیا کو کئی بار دیکھ آیا تھا۔ اس کا ہر خیال اور ہر فکر اس ننھی جان سے جڑی تھی۔ اب اسے صحیح معنوں میں اپنے والدین کے اپنے بارے میں جذبات و احساسات سمجھ میں آرہے تھے۔

ان کی ایسی فکر اور تشویش پر وہ چڑ جاتا تھا اور جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتا تھا۔ حالانکہ والدین کی یہ فکر انمول ہوتی ہے اور اولاد کو کسی اور رشتے سے نہیں ملتی۔ اسے بھی اب اس کی قدر محسوس ہو رہی تھی۔ اور اماں ابا سے متعلق ہر شکوہ اور ہر شکایت گویا ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

آنے والے مہمانوں میں سب سے پہلے علی حیدر آیا تھا۔ شرمندہ شرمندہ سا، شکستہ قدموں سے چلتا ہوا۔ اس کے چچا تاج دین صاحب نے آگے بڑھ کر فوراً اسے گلے سے لگا لیا پھر اسے شانوں سے تھامے تھامے سراج دین صاحب کے سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ پھر اپنی بانہیں وا کر دیں۔ وہ جھٹ ان کے سینے سے چمٹ گیا۔

پھر گاڑی میں وکیل صاحب، ان کی بیگم، عالیان اور اس کی بیوی، بہن سلیمہ اور نیلم تشریف لائے۔ عالیہ جہاں کافی دیر تک اپنے بھائی اور بہن سے لپٹی رہیں۔ سارے شکوے شکایتیں آنسوؤں کی برسات میں ڈھل گئے۔ کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ رہی۔

پھر ان کی نظر پیچھے کھڑی اداس اداس سے نیلم پر پڑی تو انہوں نے تڑپ کر اسے بھی گلے سے لگا لیا۔ اس کی شادی کی خبر محض ایک افواہ تھی۔ ہر دفعہ

کہیں نہ کہیں بات بنتے بنتے ٹوٹ جاتی تھی۔ سلیمہ رندھی ہوئی آواز میں عالیہ کو بتا رہی تھیں۔

اب سب کو وقار کا انتظار تھا۔ پھر گھر کے سامنے والی اور لال پیلے رنگ کی ایک ٹیکسی آکر رکی۔ پہلے اس میں سے وقار برآمد ہوا۔ پھر اس نے دوسری سائیڈ کا دروازہ کھولا تو سیاہ عبایا میں ملبوس ایک نازک اندام سی لڑکی باہر نکلی جو سج سج قدم بڑھاتی ہوئی وقار کے ساتھ ساتھ چلی آئی۔ عالیہ جہاں تو کسی سرخ بالوں والی انگریز حسینہ کی منتظر تھیں۔ اسے دیکھ کر اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

وقار لپک کر ماں باپ سے لپٹ گیا اور پھر اپنے پیچھے کھڑی لڑکی کا ہاتھ تھام کر ان کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

”اماں ابا اس سے ملیں یہ میری بیوی ہے۔ زینب نور۔“

☆☆☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب دو جذباتی ماؤں نے اپنے نوعمر بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسوب کر دیا تھا۔ بچے ایک ہی جگہ کھیل کود کر جوان ہو رہے تھے اور ایک دوسرے میں زیادہ فرق نہیں سمجھتے تھے۔ مگر یہ فرق ان کے دلوں میں خود ان کی ماؤں نے ہی پیدا کر دیا تھا۔

عالیان تو ایک لاابالی سا بچہ تھا۔ اس تقریب میں ماں کی بات کو اس نے کھیل تماشہ سمجھ کر بھلا دیا۔ ثانیہ کے ساتھ اس کا رویہ ہنوز سابقہ ہی رہا جبکہ وقار ایک بے حد حساس بچہ تھا۔ پہلے پہل تو وہ ثانیہ اور نیلم کو ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا مگر ماں کی باتوں نے اس پر گہرا اثر ڈالا۔

اب وہ نیلم کو اپنے سے منسوب فرد کی حیثیت سے دیکھنے لگا۔ وہ عمر کے ایسے دور میں تھا جب جنس مخالف میں ویسے ہی کشش محسوس ہوتی ہے مگر اب تو اس کے پاس ایک واضح سبب موجود تھا۔

وہ ہر معاملے میں نیلم کو پہلے سے زیادہ اہمیت دینے لگا۔ کبھی پھول لاکر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ کبھی کوئی کارڈ چپکے سے اس کے بیگ میں ڈال دیتا۔ وقار کے جذبات میں جتنی زیادہ شدت آتی جا رہی تھی نیلم کا رویہ اتنا ہی سرد اور لاتعلق سا تھا۔ آہستہ آہستہ وقار کو بھی اس کی بے نیازی کھٹکنے لگی۔ اس کے دیئے ہوئے تحائف کو وہ بے دلی سے قبول کرتی۔ کبھی کبھار تو وہ وقار کو یوں ہی ریپر میں لپٹے لپٹائے ادھر ادھر پڑے دکھائی دیے۔ وہ جہاں موجود ہوتا وہ وہاں سے ہٹ جاتی۔

وقار کو اپنی توہین محسوس ہوتی ایک وقت آیا کہ وہ اچھی طرح سے سمجھ گیا کہ یہ فطری شرم وحیا نہیں بلکہ بیزاری ہے۔ نیلی اس کے لیے ویسے جذبات ہرگز نہیں رکھتی جیسے اس کے لیے اس کے اپنے دل میں موجود ہیں۔ بلکہ ایک طرح سے تو وہ شاید اس کے لیے کوئی جذبات رکھتی ہی نہ تھی۔

جب کسی انسان کی چاہت کو ٹھکرایا جاتا ہے تو وہ وجہ کی کھوج میں لگ جاتا ہے۔ وقار کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے بھی نیلم کے رویے کے پیچھے چھپی وجہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ایسے ہی ایک اس کے ہاتھ نیلم کی ایک ڈائری لگی۔ تمام کے تمام اشعار کسی ایک انجان شخص کے نام۔

وہ ششدر رہ گیا۔ یقیناً وہ انجان شخص وہ خود تو ہرگز نہیں تھا۔ پھر وہ کون تھا......؟؟ اس کے اندر غصے کا جوار بھاٹا سا اٹھتا رہا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی کلاس فیلو یا پھر کوئی ددھیالی کزن۔

اگرچہ ان ماں بیٹی کا نیلم کے ابو کے خاندان سے تعلق برائے نام تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار کا ملنا جلنا تو تھا۔

ان ہی دنوں علی حیدر کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ ہوا۔ اس کو شدید چوٹیں آئیں تو پورا ایک ہفتہ اسپتال میں پڑا رہا۔ سارا خاندان بہت پریشان رہا مگر نیلم کی بے چینی اور حد سے زیادہ اضطراب پر وہ کھٹک گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس شخص کو وہ ساری دنیا میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا وہ اس کے اپنے گھر میں موجود تھا۔ کیونکہ اس نے تو دونوں کے رویوں میں آج تک کوئی نمایاں بات محسوس نہیں کی تھی۔ اور پھر علی کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کا اتنا جانتا ہے جتنا وہ خود کو بھی نہیں جانتا ہوگا۔

کچھ دن اس کو خود کو سنبھالنے میں لگے۔ پھر جب علی ٹھیک ہو گیا تو اس نے بغیر لگی لپٹی رکھے اس

سے دوٹوک بات کی۔ اس کی جھکی جھکی نگاہوں اور ہونٹوں کی لرزش نے اسے سب سمجھادیا کہ نیلم کے جذبات یک طرفہ نہیں تھے۔ علی نے بھی واضح کردیا کہ نہ تو اس نے نیلم کی کوئی حوصلہ افزائی کی ہے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی عہدو پیمان ہوتے ہیں۔ وقار کو اس سے اپنے دوست پر اتنا پیار آیا کہ وہ محض اس کی خاطر اپنی خاموش محبت کا گلا گھونٹنے پر تیار تھا۔

وقار کی مردانہ انا کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ دونوں کے بیچ مزید دیوار بنا رہے۔ نیلم کے بارے میں اپنے یک طرفہ جذبات کو اس نے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ اور دونوں کے لیے راہ ہموار کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ وقت تھا جب وہ دوبارہ لندن جانے کے لیے پرتول رہا تھا اور امی نیلم سے اس کا رشتہ مضبوط کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

وقار کی مشکل یہ تھی کہ اگر وہ براہ راست نیلم سے شادی کرنے سے انکار کرتا تو اماں ابا اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہ دیتے اور فوراً اس کا نکاح پڑھوا دیتے۔ اگر وہ نیلم اور علی حیدر کی محبت کو آشکار کرتا تو نہ صرف دونوں زیر عتاب آجاتے بلکہ علی کے شعلہ صفت ابا نہ جانے اس کا کیا حشر کرتے۔

اس لیے اس نے ایک تیسرا راستہ چنا اور خود کو برا بنالیا۔ اس نے انگریز لڑکی سے شادی کرنے کا ڈرامہ رچایا اور اس کی توقع کے عین مطابق اس کے وکیل ماموں نے خود بخود منگنی ختم کردی۔ مگر اسے اس وقت اندازہ نہ تھا کہ عالیان اور ثانیہ کا رشتہ بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

اصل قیامت تو اس وقت ٹوٹی جب ثانیہ کا رشتہ ختم ہونے پر اس کے تایا نے ثانیہ کے لیے علی حیدر کا پروپوزل پیش کردیا۔ جتنا وہ علی کو بچانا چاہ رہا تھا اتنا ہی وہ دلدل میں دھنستا جارہا تھا۔ اب اس نے نہ صرف علی اور نیلم کے لیے راہ ہموار کرنی تھی بلکہ عالیان اور ثانیہ کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اس کے لیے اسے براہ راست عالیان سے بات کرنی پڑی۔

وہ ایک صاف گو انسان تھا اس سے بات چیت کر کے اندازہ ہوا کہ وہ بھی اپنے والدین کی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار تھا۔ اگرچہ وہ نیلم کی طرح کسی اور کی محبت میں ڈوبا ہوا تو نہیں تھا مگر وہ شادی اپنے پروفیشن سے متعلقہ لڑکی سے ہی کرنا چاہتا تھا۔ اب یہ منگنی خود بخود ٹوٹ گئی تو وہ کیا کرسکتا تھا۔

وقار کے دل کی خلش کچھ کم ہوگئی کیونکہ اگر ثانیہ کے دل میں عالیان کے لیے کچھ تھا بھی تو وہ یک طرفہ تھا اور اس کا ختم ہوجانا ہی بہتر تھا کیونکہ وہ خود یک طرفہ محبت کا عذاب بھگت چکا تھا۔ مگر اصل مسئلہ اپنی جگہ موجود تھا کہ وہ علی کی جان کیسے چھڑائی جائے۔ فی الحال ماحول اور حالات سازگار نہیں تھے۔

خاندان کے تمام بڑے بہت غصے میں تھے۔ اور اس کی ایسی ویسی کوئی بھی کوشش بھس میں چنگاری ثابت ہوسکتی تھی۔ اسے حالات سازگار ہونے تک انتظار کرنا تھا وہ سب کچھ جوں کا توں چھوڑ کر لندن چلا آیا اور علی حیدر نے اسلام آباد میں پناہ لے لی۔

☆☆☆

پھر ایک دن سراج دین صاحب نے اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر علی حیدر کو بلویا اور جب اسے علم ہوا کہ شام میں اس کا نکاح ہے تو اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ وقار بھی یہاں نہیں تھا جو اس کی کچھ مدد کر پاتا۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو وہ منظر سے غائب ہوگیا۔ سراج دین صاحب نے جذباتی پن کی حدود کو پھلانگتے ہوئے ذیشان سے ثانیہ کا نکاح کروادیا۔

علی اور وقار کو جب علم ہوا تو دونوں اپنی اپنی جگہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئے مگر انہیں اطمینان تھا کہ ذیشان ثانیہ کے لیے بہترین انتخاب ثابت ہوگا۔ کیونکہ اس کے دل پر ابھی کسی کی بھی محبت کے واضح نقش ثبت نہ تھے۔

وقار کو البتہ کافی دیر تک یہ خلش ستاتی رہی کہ انجانے میں دونوں کے ساتھ کچھ زیادتی ہوئی مگر وقت نے ثابت کردیا کہ دو دلوں پر اگر کسی تیسرے فرد کی شراکت نہ ہو تو دونوں بہت جلد ایک ہوجاتے ہیں۔ اور پھر سمجھوتا کرنا بھی آسان ہوتا ہے۔ جبکہ نیلم اور علی کا معاملہ قطعی مختلف تھا۔ وہ ایک دوجے کی

چاہت میں بہت دور تک نکل گئے تھے۔

☆☆☆

وقار کا زینب نور سے شادی کا عجب قصہ تھا۔ اسے نہ زینب سے کوئی عشق ہوا تھا نہ محبت۔ رسمی سی ہیلو ہائے تھی اور دو چار ملاقاتیں جو حماد کی موجودگی میں ہی ہوئی تھیں۔

وہ بظاہر مضبوط نظر آنے والی لڑکی اس وقت بری طرح سے بکھر گئی جب اچانک اس کے باپ کا برین ہیمرج سے انتقال ہوگیا۔ بیمار اس کی ماں رہتی تھی اور مر اس کا باپ گیا۔ اس کی ماں نے اس کے باپ کے عشق میں ڈوب کر اپنا مذہب بدلا تھا مگر مذہب بدلنا آسان ہے اور اس پر قائم اپنا بہت مشکل۔ اس کے باپ کی زندگی تک تو سب ٹھیک مگر اس کے بعد کچھ بھی ٹھیک نہ رہا۔

اس کے نانا نانی اور ماموؤں کا دخل اس کے گھر میں بہت بڑھ گیا تھا۔ انڈیا میں اس کے دادی دادی بھی وفات پاچکے تھے اور باقی رشتہ دار اس کو منہ لگانے پر تیار نہ تھے کہ کہیں وہ اپنے باپ کی جائیداد میں حصہ نہ مانگ لے۔

اس کی ماں نے اس کے باپ کا گھر فروخت کردیا اور اپنے والدین کے گھر شفٹ ہوگئی۔ وہ بھی ایسا ہی کرتی اگر اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال انڈیا میں اپنے دادا دادی کے ساتھ نہ گزارے ہوتے جہاں انہوں نے اسلامی خطوط پر اس کی ایسی پرورش کی تھی کہ اندر بہت دور تک وہ اپنی جڑوں سمیت پکی مسلمان تھی۔ بغیر کسی کھوٹ اور ملاوٹ کے۔

وقار اس کے دوپٹہ پہننے کے اسٹائل کی بھی بے حد تعریف کرتا تھا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ ایسے دوپٹہ پہننا اس کی دادی نے ہی اسے سکھایا تھا۔ اگر اس کی ماں کبھی گھبرا کر اس کا دوپٹہ کھول بھی دیتی تو وہ فوراً ویسے ہی دوبارہ اوڑھ لیا کرتی تھی۔

مختصر یہ کہ زینب نور کو ایک مضبوط پناہ گاہ چاہیے تھی اور وقار کو پاکستان جانے سے پہلے ایک جیتی جاگتی بیوی جس کی خیر خیریت کے بارے میں اکثر اس کی ماں فون پر پوچھتی رہتی تھی اور وہ فرضی قصے سناسنا کر تنگ آچکا تھا۔ پھر اس میں حرج ہی کیا تھا۔ پسند کی شادی کا ٹھپہ تو وہ بہت پہلے ہی اپنے اوپر لگوا چکا تھا۔ اور خاندان بھر میں معتوب ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ پھر ایک نیکی کما لینے میں کیا ہرج تھا۔

اس کے علاوہ نور سے بہتر بیوی اسے کہاں مل سکتی تھی۔

☆☆☆

شب کے سیاہ آنچل پر ٹنگے سنہری تارے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ فضا میں موجود ہلکی سی خنکی فرحت بخش محسوس ہورہی تھی۔ وسیع وعریض لان کو رنگ برنگے برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ کھانے کی اشتہار انگیز خوشبو سارے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ وقار نے سر اٹھا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ خاندان کے تمام افراد اپنی اپنی جگہ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ثانیہ اور ذیشان ننھی پری کی سیلفیاں لے رہے تھے۔ اماں جان، تائی، خالہ، ممانی اور ثانیہ زینب نور کو گھیرے بیٹھی تھیں، ابا جان، تایا اور ماموں سیاست پر بحث کرر ہے تھے۔ عالیان اور اس کی بیوی ویڈیو بنا رہے تھے صرف دو نفوس ایسے تھے جو اس منظر کا حصہ معلوم نہیں ہورہے تھے۔

علی حیدر چپ چاپ سا گڈو کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا جبکہ نیلم گم صم سی عالیہ جہاں کے پہلو میں بیٹھی اپنے آنچل کے ایک پلو کو اضطرابی انداز میں اپنی انگلی پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔ کبھی کبھار اس کی جھکی نگاہیں اٹھتیں اور علی کو اپنی طرف دیکھتا پاکر فوراً پھر جھک جاتیں۔ دونوں کو دیکھ کر وقار کو بلیک اینڈ وائٹ فلموں کے ہیرو ہیروئن کی خاموش محبت یاد آجاتی اور ساتھ ہی اس کے دل میں یہ آوارہ سا خیال لہراتا کہ اگر آج وہ زینب نور کے ساتھ نہ آیا ہوتا تو شاید پھر اسے نیلم سے شادی پر مجبور کیا جاتا۔ مگر شکر تھا کہ اب حالات بہت حد تک سدھر گئے تھے اور اب اس نے پھر نئے سرے سے دونوں کے لیے راہ ہموار کرنی تھی، اس بار اس کو پکا یقین تھا کہ وہ اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہوجائے گا۔ موسم خزاں تمام ہوا چاہتا تھا اور جلد ہی ان دونوں کی زندگی میں بہار آنے کو دی تھی۔

☆☆

مونگ پھلی

سنعیہ عمیر

نام اس کا زاہدہ تھا اور اسے وہ تمام مشکلات درپیش تھیں جو کسی بھی درمیانی اولاد کو لاحق ہوتی ہیں۔ بڑی اولادوں پر ماں باپ فخر کرتے ہیں۔ چھوٹی اولاد لاڈ کی مستحق ٹھہرتی ہے جبکہ درمیانی اولاد کو توصیفی جملے حاصل کرنے کے لیے قلعے فتح کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ان کھاتے پیتے گھرانوں میں سے تھی جن میں پیسہ ہوتے ہوئے بھی سادہ زندگی گزارنے پر فخر کیا جاتا تھا۔ کفایت شعاری پر ان کی امی جی کو ناز تھا۔ جبکہ ابا قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے آئے تھے۔ تب سے ان کی مادی چیزوں سے دلچسپی اٹھ گئی تھی۔

سادہ زمانہ تھا۔ ان کے ابا کی بسیں چلتی تھیں پھر بھی وہ سب پیدل اسکول آتے جاتے تھے۔

زاہدہ کے سامنے والی گلی میں دو گھر چھوڑ کر اس کی پکی سہیلی شبانہ رہتی تھی۔ فاصلے تھوڑے تھے، رابطے کے لیے موبائل کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ چھت سے آواز دے کر زاہدہ پوچھ لیتی کہ شبانہ کیا کر رہی ہے۔ کبھی شبانہ نکڑ تک جاتے ہوئے کھلے دروازے سے جھانک کر زاہدہ کی خیر خبر لے لیتی۔ دونوں اکٹھے اسکول جاتیں اور امتحانوں میں بھی سر جوڑ کر پڑھتیں۔

☆☆☆

زاہدہ نے بال کس کر دو چٹیا بنائیں اور یونیفارم کا دوپٹا پھیلا لیا۔ بستہ اٹھا کر وہ سیدھا شبانہ کے دروازے پر گئی اور دستک دی۔ شبانہ کا چھوٹا بھائی صحن میں ہی بیٹھا تھا، اس نے وہیں سے آواز لگائی۔

''آپا! مونگ پھلی آپ کو لینے آئی ہے۔''

زاہدہ کا منہ اسی وقت ناگواری سے پھول گیا تھا۔ وہ دبلی پتلی تھی۔ اس لیے اسے سب مونگ پھلی کہہ کر چھیڑتے تھے۔ نین نقش حسین تھے مگر رنگ دبتا تھا، یہ نام اس کے بہن بھائیوں نے ہی ڈالا تھا جو اب اس کی ناگواری کی پروا کیے بغیر زبان زد عام ہو رہا تھا۔ وہ منہ سُجائے کھڑی تھی۔ شبانہ آئی تو اس کے بھی چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''خدا جانے کیا نتیجہ آئے؟'' شبانہ سر پر دوپٹا ٹکا کر زور زور سے دعائیں پڑھ رہی تھی۔

آج دونوں کا آٹھویں کلاس کا رزلٹ آنا تھا۔

''اچھا ہی آئے گا۔'' زاہدہ کو پوری امید تھی۔

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دونوں ہی اسکول پہنچیں۔ تو معلوم ہوا کہ دونوں ہی ریاضی میں فیل ہو چکی ہیں۔ ایک مضمون میں فیل ہونے کا مطلب پوری کلاس میں فیل۔ دونوں سہیلیاں منہ لٹکا کر واپس آئیں مگر گھر میں منہ چھپانے کو جگہ نہ ملی۔

☆☆☆

''بڑے اتفاق سے پڑھتی تھیں دونوں مگر اس اتفاق میں برکت نہیں پڑی۔''

بھائی نے مالٹے کی قاش منہ میں ڈال کر روتی بسورتی زاہدہ سے کہا۔

''اتنی ہی پکی دوستی تھی تو چار مضمون تم یاد کر لیتیں، چار مضمون شبانہ تیار کر لیتی۔ پاس تو ہو جاتیں۔'' باجی مبینہ بھی پیچھے نہ رہیں۔

''ان کی دوستی اتنی بے لوث اور بے حساب اسی لیے ہے کیونکہ دونوں کو ہی حساب نہیں آتا۔'' دوسرا

بھائی بھی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوا۔

امی جی تو کب کی صلواتیں سنا کر جا چکی تھیں مگر بہن بھائیوں نے اس کی خوب عدالت لگا رکھی تھی۔ اس کا صاف گندمی رنگ ایسی ہی باتیں سن سن کر سانولا ہو جاتا تھا۔

''انگلش میں دیکھو اتنے شان دار نمبر آئے ہیں۔ وہ تو میرا میتھ تھوڑا سا کمزور ہے۔'' زاہدہ نے سُڑ سُڑ کرتی ناک پونچھتے ہوئے کہا۔

''چلو کوئی نہیں۔ اگلے سال کی کتابوں کا خرچا بچ گیا۔'' بڑی آپی رقیہ نہایت ہی بھولی تھیں۔ اپنے تئیں انہوں نے حوصلہ دیا مگر بھائیوں کو پھر سے ہنسنے کا موقع مل گیا اور زاہدہ دوبارہ سے رونے لگی۔

''باجی! آپ ایسا کریں اگلی بار پرچے کے آخر میں ممتحن کو جذباتی نوٹ لکھ آنا کہ اگر آپ پاس نہ ہوئیں تو آپ کے والدین زبردستی آپ کی شادی آپ کے کسی نکھٹو کزن سے کر دیں گے۔ ترس کھا کر ضرور پاس کر دے گا۔ بلکہ آپ انگریزی میں لکھ آنا۔ انگریزی تو آپ کی اتنی اچھی ہے کہ سو بٹا سو دے گا۔''

بھائیوں کی بولتی ہی بند نہیں ہو رہی تھی۔

''کم بختوں چھوڑوں گی نہیں۔ تم سب سے گن گن کر بدلے لوں گی۔'' زاہدہ نے تکیہ اٹھا کر بھائی کو دے مارا۔

''باجی! یہ گن کر بدلا لینے کی دھمکیاں اس کو دیں جس نے آپ کی ریاضی کی مارک شیٹ نہیں دیکھی۔''

بھائی نے تکیہ کیچ کر کے فرش پر پھینکا اور باہر بھاگ گیا۔

☆☆☆

امی جی نے تپتے توے پر گھی میں انڈہ توڑا تو وہ پٹ پٹ پٹاخوں جیسی آوازیں نکالنے لگا۔ ان ہی آوازوں کے باعث وہ سب فرائی انڈے کو انڈا پٹاخہ کہتے تھے۔

''اب جانے دے، چل میری بچی ناشتا کر لے۔'' امی نے انڈہ پراٹھا زاہدہ کے سامنے رکھ کر پچکارا۔

زاہدہ بھی نوالے توڑنے لگی۔ رزق کا تعلق تعلیم سے ہو لازمی نہیں۔

چند دن ایسے ہی پھٹے دودھ پر ٹسوے بہاتے گزر گئے پھر ہمت کر کے سہیلی کے آنسو پونچھنے پہنچی۔

شبانہ پرات میں دال ڈال کر چُن رہی تھی۔

''کب تک ایسے دکھی ہوں گے۔ ہمت تو کرنی پڑے گی۔ کل سے دوبارہ اسکول چلتے ہیں۔'' زاہدہ نے کہا اور پرات سے دو کنکر چن کر ہتھیلی پر رکھے۔

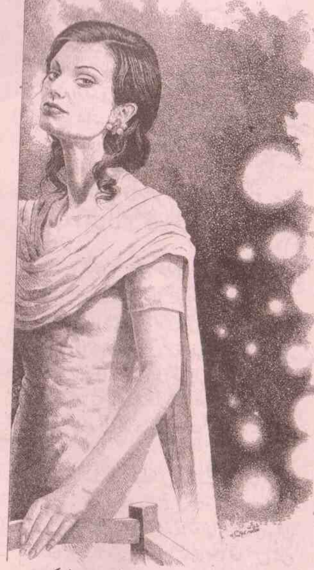

''نہ بابا! میں اب اسکول نہیں جاؤں گی۔ ساری لڑکیاں تو اگلی کلاس میں بیٹھیں گی۔ استانیوں کا دوبارہ سامنا کیسے کریں گے۔ پڑھا ہوا سبق مجھ سے روز روز نہیں پڑھا جائے گا۔''

شبانہ نے دال چن کر ڈھکن والے ڈبے میں ڈالی۔ ماں نے بھی اسے خوب گھر کے کاموں میں لگا دیا تھا۔

''تو کیا تمام عمر آٹھویں فیل رہنا ہے؟'' زاہدہ کو سہیلی کی کم ہمتی پر فیل ہونے سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔

''لوگوں نے تو اسکولوں کی شکل تک نہیں دیکھی ہوتی۔ ہم نے تو آٹھ جماعتیں پڑھی ہیں۔''

کہتی شبانہ بھی ٹھیک تھی۔ چند نمبروں سے انسان کی پہچان نہیں بنتی مگر زاہدہ ذہین اور محنتی تھی۔ اسے پڑھائی کا شوق بھی تھا یوں ہارے ہوؤں کی طرح گھر بیٹھنا اسے قبول نہیں ہوا مگر دوبارہ اسکول جا کر شرمندگی اٹھانے کی ہمت بھی اس میں نہیں تھی۔

شبانہ کی ماں نے اس کے لیے بر دیکھنا شروع کر دیا۔ جبکہ زاہدہ نے نویں دسویں جماعت کی کتابیں منگوائیں اور گھر بیٹھ کر خود ہی پڑھنے لگی۔ ان دنوں صرف دسویں کا بورڈ امتحان ہوتا تھا جس میں میتھ لازمی نہیں تھا۔

شبانہ کا رشتہ طے ہوا، زاہدہ نے خود تیاری کر کے دسویں کے پرائیوٹ پرچے دیے اور میٹرک کر لیا۔ شبانہ کی ڈولی اٹھی، وہ ازدواجی زندگی میں مگن ہو گئی۔

زاہدہ نے کالج جا کر پہلے ایف اے پھر بی اے بھی کر لیا۔ تمام عمر وہ جسے مونگ پھلی کہتے تھے آٹھویں فیل اور بی اے پاس رہی۔ اسکولوں میں ٹاپ کرنے والیاں بھی اس کے لیول کو نہ پہنچ سکیں۔

☆☆☆

خدا نے زاہدہ بنایا تھا مگر دنیا اسے مونگ پھلی ثابت کرنے پر بضد تھی۔ درمیانی اولاد موازنے کی بھینٹ ہی چڑھی رہتی ہے۔ ہر آنے جانے والا کہتا تھا بڑی بہنیں زیادہ سوہنی (حسین) ہیں۔ تو زاہدہ کو بھی اپنا آپ کوجھا (بدصورت) لگنے لگتا۔

ان دنوں دبلا پتلا ہونا بھی خلاف فیشن تھا تو یہ صفت بھی اس کے حق میں نہیں جاتی تھی۔ باقی سلیقہ اور طریقہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس کے بڑے بہنوئی ہاشم الدین کا کزن نجم باٹنی میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ تعلیمی سفر کا آخر پہنچا تو نجم کی ماں بھی ملتان سے آ گئی اور اپنے ہونہار سپوت کے لیے رشتہ ڈھونڈنے لگیں چونکہ زاہدہ کی امی جی ممتاز کا بڑا ملنا جلنا تھا اس لیے ان سے بھی ذکر کیا ـــ ممتاز نے انہیں ملنے ملانے والی چند لڑکیاں دکھائیں چونکہ بیٹی کی سسرال کا معاملہ تھا اس لیے ایک روز اپنی بس پر سیر بھی کروائی۔

وہ لوگ ممتاز کے مزاج سے بھی متاثر تھے اور ذہانت کے بھی قائل تھے۔ اس لیے ملتان جانے سے ایک روز پہلے نجم کی امی اور ایک عزیزہ ان کے گھر آ گئے تا کہ تسلی سے مشورہ کر کے حتمی فیصلہ کر لیں۔ اتفاق سے ـــ ممتاز گھر پر نہیں تھیں اور زاہدہ دوپٹا کمر پر باندھے کباب بنا رہی تھی۔

مہمان خواتین کو دیکھ کر اس نے پھرتی سے چائے بنائی اور وہی کباب تل کر سامنے رکھ دیے۔ اس روز ان کی ـــ ممتاز سے ملاقات نہ ہو سکی اور وہ ایسے ہی ملتان واپس چلی گئیں۔

☆☆☆

''امی فون آ رہا ہے۔''

فون کی گھنٹی بجتے ہی سارے فون کے اردگرد جمع ہو جاتے تھے مگر ان دنوں صرف ضروری باتوں کا فون آیا کرتا تھا۔ اس لیے بچے خود سے اٹھا کر دوسرے کا وقت اور پیسہ برباد نہیں کرتے تھے۔ وہ فون بھی ـــ ممتاز نے خود ہی اٹھایا تھا اور کچھ سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

''کس کا فون تھا؟'' فون بند ہونے پر سب نے پوچھا۔

''نجم کی امی کا تھا۔''

ممتاز بس اتنا کہہ کر آگے پیچھے ہو گئیں۔ رات کو ابا جی گھر آئے تو بھید کھلا۔ نجم کی امی نے خاندان کی باقی لڑکیاں چھوڑ کر زاہدہ کا ہی ہاتھ مانگ لیا تھا۔

زاہدہ سمیت کسی کو یقین نہ آیا۔ وہ تو خود کو دنیا کی نظر سے دیکھ کر مونگ پھلی ہی سمجھتی تھی۔ نجم کو ایک بار اس نے رقیہ آپی کے گھر ہی دیکھا تھا۔ ہونہار، خوش شکل، دراز قد وہ تو ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ اس کے خاندان میں لڑکوں کی کمی تھی جبکہ لڑکیاں بھری ہوئی تھیں۔

زاہدہ رہ رہ کر ان گول مٹول گوری چٹی لڑکیوں کو یاد کر رہی تھی۔ اس نے دنیا کی باتیں ذہن سے نکال کر غیر جانب دار ہو کر آئینہ دیکھا۔ کسی بھی لحاظ سے وہ کسی سے بھی کم نہیں تھی۔

پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔

☆☆☆

''آپ آملیٹ لیں گی یا فرائی انڈہ؟'' وہ نئی نویلی دلہن تھی، اس کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔

آملیٹ تو ہزار دفعہ کھایا ہوا تھا۔ زاہدہ نے فرائی انڈہ کہہ دیا کہ دیکھوں تو کیا اسپیشل چیز ہے۔ سورج نما زردی والا انڈہ پلیٹ میں آیا۔

''اوئے یہ تو انڈہ پٹاخہ ہے۔'' زاہدہ بے خیالی میں زور سے بول اٹھی۔

''آپ کو پسند ہے؟'' نجم نے پوچھا۔ وہ اپنی نئی معصوم دلہن کی پسند ناپسند کا خوب خیال رکھ رہا تھا۔

''جی جی بہت زیادہ۔'' زاہدہ نے اپنے پڑھے لکھے شوہر سے اپنی خود ساختہ حیرت چھپاتے ہوئے کہا۔

پندرہ دن بعد وہ ماں سے ملنے میکے آئی تو باجی مبینہ سمیت سب اسے دیکھ کر حیران ہی رہ گئے۔ اس پر اتنا روپ آیا ہوا تھا کہ پہچان میں نہیں آ رہی تھی۔

ملائی سا سفید چہرہ اور سرخ اناری بھرے بھرے گال بے حد حسین لگ رہے تھے۔ نازک کمر تو اس کی پہلے ہی تھی، اب کندھوں پر پھیلا مقیش کا دوپٹا کمر سے ڈھلکتا نیچے آ رہا تھا تو اس کا سراپا مزید دلکش لگ رہا تھا۔

''تمہیں تو لگتا ہے وہاں کا پانی زیادہ ہی راس آ گیا۔'' باجی نے فرط جذبات میں اس کا گال ہی چوم لیا۔

''باجی! سب بہت اچھے ہیں اور یہ تو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ نہ پوچھیں۔ روز رات کو کبھی دہی بھلے سموسے تو کبھی میری پسند کی مٹھائی لانا ان کا معمول ہے۔''

زاہدہ نے بتاتے ہوئے شرما کر نظریں نیچے کر لیں پھر تو گھر والوں کی ساری عمر زاہدہ کی بلائیں اتارتے گزری۔

زاہدہ پر ایک بار جو روپ آیا تھا تمام عمر کی لیے حسین کر گیا۔ سالوں بعد بھانجی کی شادی پر ایک خاتون اپنی بیٹی کو لے کر آئیں۔

''میں نے اسے کہا تھا آج فنکشن پر وہ آنٹی دکھاؤں گی جن کی ہنسی جوہی چاؤلہ سے ملتی ہے۔''

زاہدہ یہ سن کر خوب ہنسی اور خاتون کا کہا ثبوت سمیت ثابت ہو گیا۔ خدا نے اسے محبت کرنے والا افسر شوہر دیا تھا۔ نوکر چاکر بھی تھے۔ ڈاکٹر گھر آ کر دیکھتے تھے۔ بچے ہونے کے بعد بھی میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے وقت نکالتے اور اکٹھے فلم دیکھنے جاتے، تفریح کرتے۔ زاہدہ انگریزی کتابوں سے ڈیزائن دیکھ دیکھ کر نجم کے سوئیٹر بناتی اور تمام عمر فخر سے کہتی رہی۔

''میں کوجھی تھی، میرے شوہر نے مجھے سوہنا کر دیا۔''

☆☆

ناولٹ

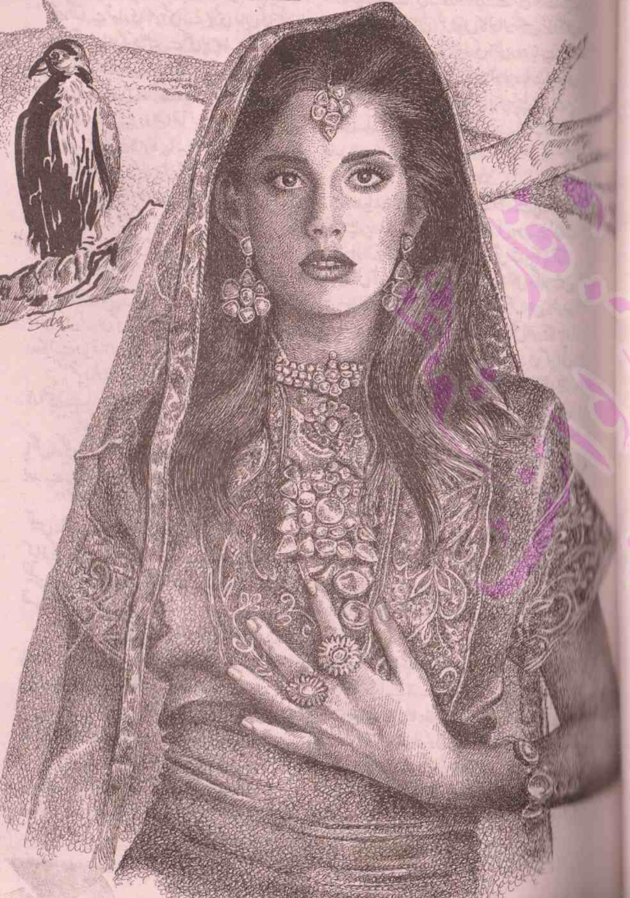

فرح بخاری

وہ نازنین

عبدالواسع کوئٹہ میں وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اپنے باغ کے حصول نے واسع کو وکالت کی طرف مائل کیا ہے۔ واسع کی بہن رباب پھوپھی زاد نصیر سے محبت کرتی ہے، لیکن گلشن پھپھو دونوں کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ان کے ہاں بنا وٹے سٹے کے شادیاں نہیں کی جاتی تھیں۔ سیف اور نغمہ کی شادی کو چھ برس بیت چکے ہیں لیکن ان کی کبھی ایک دوسرے سے نہیں بنی۔ پشمینہ سیف کی بہن ہے، وہ رئیس کی بچپن کی منگ تھی لیکن چھ برس پہلے ایک واقعے نے ان کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیے تھے۔ نازنین کوئٹہ شہر میں اپنے بابا کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بابا کسی بیوہ عورت سے چوری چھپے شادی کر چکے ہیں اور اس کا رشتہ اپنے ایک رنڈوے دوست کے ساتھ طے کر دیتے ہیں۔

نازنین عین نکاح کے وقت شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دلہا والے دلہن کو زبردستی اٹھا لے جاتے ہیں۔

ادھر واسع کوئٹہ سے گھر واپس جا رہا ہے۔ بس میں ایک مسافر لڑکی تمام راستہ روتی ہوئی ملی، واسع کو شبہ گزرا کے اس کی ساتھی عورت اسے اغوا کر کے لے جا رہی ہے لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر پایا۔

اگلے روز اسے اپنے کمرے میں اچانک سامنے پا کر واسع کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ معلوم ہوا وہ لڑکی اس کے چچازاد سیف اللہ کی سالی نازنین ہے اور اب یہیں رہنے والی ہے۔ نازنین کو اس کی بہن نغمہ نے مصیبت سے نکالا تھا اب آگے پڑھیے۔

ساتویں قسط

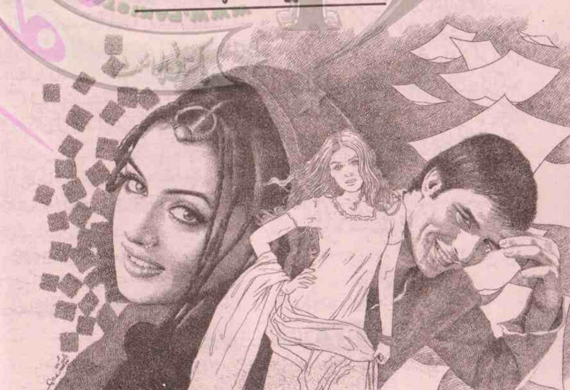

"بس بھی کرو رباب۔ بات کچھ اور ہوگی۔"
جمیلہ کے لیے اس پاگل کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔
"مجھے لگتا ہے تمہاری پھوپھی نے یونہی اماں کی تسلی کے لیے کہہ دیا ہوگا کہ نصیر سے بھی پوچھا ہے۔"

"تو نصیر کا رویہ اماں؟" رباب نے روئی سرخ آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "نہ وہ بات کرتا ہے اب، نہ یہاں آتا ہے۔ پہلے وہ ایسا تھا کیا؟ لالہ کا ساتھ بھی نہیں دیا۔ ضروری کام کا بہانہ بنا کر وہیں بیٹھ گیا۔ پوچھو ذرا لالہ سے۔ اکیلا جو مل آیا ہے جبار چاچا سے تو کیا فون پر بھی حال احوال پوچھا نصیر نے۔ نہیں نا۔" وہ پھر سے رونے لگی۔

"میں بات کروں نصیر سے؟"
"کیا کہیں گی...... کہ نیلم کا رشتہ کیوں لے گئے تمہارے ماں باپ۔" وہ اپنی ناک رگڑتے مسلسل سوں سوں کر رہی تھی۔ نصیر کے اس آخری عمل نے جو دھکا اسے دیا تھا اس سے وہ بری طرح ٹوٹ گئی تھی۔

"تم دونوں کا کوئی جھگڑا ہوا تھا رباب۔ کوئی ناراضی ہے یا......؟"
"کچھ بھی نہیں اماں۔ میں تو خود سوچ سوچ کر پاگل ہوگئی ہوں۔ بس اتنا پتا ہے کہ شبنم کی شادی کے بعد سے کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"شبنم کی شادی۔" جمیلہ زیرلب دہرانے لگیں۔ "اس میں تو واسع اور ذکی کا جھگڑا ہوا تھا، تو کیا ذکی نے اس کو ہماری طرف سے بدگمان کر دیا۔ لیکن ستارہ تو صاف سب کو بتا گئی تھی کہ واسع کا کوئی قصور نہیں پھر......"

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی اماں۔ لیکن کوئی بات تو ضرور ہے نصیر بتاتا نہیں لیکن صاف سمجھ آتی ہے کہ پریشان ہے کسی بات سے۔"
"تو...... کس سے پوچھیں؟" جمیلہ نے مایوسی بھری آہ بھری۔
"آپ لالہ کو بتائیں ناں کہ تمہاری وجہ سے ہم لیٹ ہوگئے، وہ اس وقت ہاں کہہ دیتا تو پہلے ہم زمرد کا رشتہ مانگ لیتے۔"

"وہ اپنے دھندوں میں کم پریشان ہے۔ کیسا دھوکا دیا جبار نے بھی۔ خود اولاد رکھتے بھی لوگ کیسے بے حس ہو جاتے ہیں، غریبوں کا نوالہ چھین کر انہیں نیند بھی کیسے آ جاتی ہے۔" جمیلہ کی ذہنی رو رباب سے پلٹ کر باغ کی جانب نکل گئی۔ ادھر رباب سوچتی نظروں سے ماں کو دیکھتے ابھی بھی اُسی پہلے مدعے پر ٹکی تھی۔ اُسے شاید اپنے لیے اب آپ ہی کچھ سوچنا تھا۔

☆☆☆

دریائے ژوب کے پتھریلے کنارے پر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، آج وہ نرم معتدل ہوا سے لطف اندوز ہونے نہیں بلکہ تنہائی کی تلاش میں آیا تھا۔ آفس میں آنے جانے والوں کی گہما گہمی، گھر میں دیگر معاملات کی انجام دہی، ذہن یکسو کرنا ہی دشوار ہوگیا تھا۔ جبکہ وہ پچھلے کچھ دنوں سے مسلسل اور لگاتار چند سیدھے سیدھے جملوں کے مفہوم ان کی گہرائی ناپنے میں غرق تھا لیکن یہ استغراق بھی کوئی معنی خیز نتیجہ دینے میں ناکام ہی رہا تھا۔ جبار چاچا نے اُس سے کیس دائر کرنے کی بات کیوں کی اور محض بات ہی نہیں کی، انداز صاف اُکسانے والا تھا۔ وہ اسے کیس دائر کرنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ اس نے تو مصالحت کی راہ اپناتے بنا کسی جھگڑے میں پڑے اپنے بابا اور چاچا کے معاہدے کی حقیقت جاننا چاہی تھی۔ باغ مانگنے کی تو ایک بار بھی اس نے بات نہیں کی تھی، پھر چاچا کا اصرار۔ اور۔ واسع نے رک کر سوچا۔ میں نے تو جواباً جرگے کی بات کی، وہ بھی گاؤں برادری کا نہیں، صرف اپنے خاندان والوں کا چھوٹا سا جرگہ۔ لیکن چاچا نے اس سے بھی گریز کیا تھا۔

تو آخر کیا ہے جرگے اور کیس کا فرق۔ نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کا مفاد کس میں ہے۔ بلکہ اس کی ہار بھی، کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ چاچا اسے شکست دینا چاہتے تھے۔ باغ پر وہ ڈھٹائی سے قابض تھے اور قابض ہی رہنا چاہتے تھے، نہ کچھ خوف خدا تھا نہ خاندان برادری میں اپنے وقار کی کچھ پرواہ۔ ان کے

لیے پیسہ اہم تھا اور واسع کے لیے اپنے بابا کا سچ۔ تو اس سچ کو سامنے لانے کے لیے اسے اب کیا کرنا تھا، اور کچھ کیے بنا تو اب چارہ ہی نہیں تھا۔ باغ سے تو اب اسی صورت میں دست بردار ہونا تھا جب چچا کا جھوٹ اور اس کے بابا کا سچ دنیا پر کھل نہیں جاتا۔

اس دوپہر دریائے ژوب کے کنارے لگاتار اس ایک مسئلے کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے اس نے دو گھنٹے صرف کر دیے تھے اور اب دامن جھاڑ کر وہاں سے اٹھتے عبدالوسع کے لبوں پر بڑی آسودہ مسکراہٹ تھی۔ بظاہر بہت سامنے کی بات اسے بڑی دیر سے سمجھ میں آئی تھی۔

"یہ قصور بھی آپ کی ناتجربے کاری کا ہے وکیل صاحب۔" اس نے آپ اپنا مضحکہ اڑایا کہ حقیقی معنوں میں جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے اس میدان میں قدم رکھے۔ تو اتنی ذہنی تھکان تو جائز تھی۔ گھر جانے کی راہ میں اب الجھی سوچوں کی بھاری زنجیریں ساتھ نہیں بندھی تھیں۔ گتھی کا سلجھ جانا ہی مسائل حل کرنے کا پہلا سرا ہوتا ہے۔ واپسی کے قدموں میں اب ایک پھرتی اور توانائی نظر آتی تھی۔ چچا نے اسے کیس کرنے پر یونہی نہیں اُکسایا تھا۔ واسع کے لیے اب ان کا مفاد اور اپنا نقصان سمجھنا آسان ہوگیا تھا اور الجھن ختم ہونے پر یہ فیصلہ کرنا بھی آسان ہوگیا کہ کیس اسے کرنا ہی نہیں ہے، اسے تو بس جرگہ بلانا ہے وہ بھی جلد از جلد۔

اور یہ بلاوا اس پہلے بلاوے جیسا نہ تھا جب وہ اپنوں کا ساتھ چاہ رہا تھا۔ یہ خاندانی جرگہ کسی بھی اہم مسئلے پر بات کرنے کے لیے کبھی بھی کوئی بھی اکٹھا کر سکتا تھا۔ اس میں خاندان کے تمام بڑوں کی موجودگی لازمی ہوتی تھی، ایسے جرگوں میں سبھی فریقین غیر جانبدار ہو کر معاملے کو دیکھتے اور اس پر اپنا فیصلہ دیتے ہیں۔ ثبوت اور گواہ یہاں بھی ہوتے ہیں البتہ حتمی فیصلہ نہ ہو سکنے کی صورت میں قرآن کو گواہ بنایا جاتا ہے۔

☆☆☆

پشمینہ اور نازنین چھت سے اتریں تو سیف لالہ اور نغمہ بھابی برآمدے میں کھڑے دکھائی دیے۔ نغمہ اسے ٹوپی، رومال، واسکٹ وغیرہ دے رہی تھی، وہ شاید باغ جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ پشمینہ کو تو ان دونوں کا ساتھ کھڑے ہونا کبھی خطرے سے خالی نہیں لگا، کسی بھی وقت لفظوں کی گولہ باری شروع ہو سکتی تھی۔ اس لیے چپکے سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ نازنین بھی پیچھے پیچھے تھی۔ یہاں اماں ناشتہ بنا رہی تھیں۔ دونوں چوکیاں گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئیں۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی اس لیے نغمہ بھابی کی آواز صاف کچن تک آ رہی تھی۔ وہ سیف سے نازنین کے کوئٹہ جانے سے متعلق بات کر رہی تھیں۔ اس کی ڈیٹ شیٹ اور رول نمبر آ گیا تھا۔

"کب جانا ہے؟" سیف نے جوتے کے بکل بند کیے۔
"بس پانچ دنوں تک۔"
"تو ٹھیک ہے میں چھوڑ آؤں گا۔"
"سیف وہ، اصل میں مجھے بھی کتنا عرصہ ہوگیا ہے کوئٹہ گئے۔ نازنین کے ساتھ چلی جاؤں؟"
"تم......؟" سیف نے چونک کر دہرایا تو کچن میں بیٹھی ان تینوں خواتین کا ایک ساتھ سانس رُکا۔ مطلب جھگڑا شروع۔
"ہاں نا، خالہ سے بھی مل آؤں گی۔" نغمہ ڈرتے ڈرتے مدعے پر آئی۔ "بس دو دنوں کے لیے جاؤں گی۔ نازنین کو خالہ کے پاس ہی چھوڑنا ہے۔ امتحانوں کے دوران یہ وہیں رہے گی، میں بس تیسرے دن واپس آ جاؤں گی۔"
"اور تمہارے بابا؟" سیف نے جاننا چاہا۔
"اُن سے اس بار تو نہیں ملنا چاہتے کیونکہ نازنین کے امتحانوں کا معاملہ ہے، اگر کوئی بدمزگی ہوگئی تو یہ ڈسٹرب ہوگی۔"
"ہوں۔" سیف نے سوچنے کے لیے وقت لیا
"تو...... چلی جاؤں؟" نغمہ نے اُمید بھری نظروں سے شوہر کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

"ہاں چلی جاؤ۔ لیکن واپسی بس تیسرے دن۔"
"ہاں ہاں بالکل۔" نغمہ نے جلدی سے اسے بٹوہ تھمایا اور اس کے نکلنے کے بعد وہ کچن میں آئی تو پہلی مسکراہٹ ساس کی جانب سے موصول ہونے پر بری طرح شرما گئی۔
"دیکھ لو نازنین۔ پہلے یہ مجھے اپنا وکیل مقرر کرتی تھی۔ میری پیٹھ کے پیچھے چھپ کر اپنی باتیں منواتی تھی۔ اب اپنے کیس اسے آپ لڑنا آ گئے ہیں۔"
"بس کرو اماں۔" وہ شرم سے دہری ہونے لگی۔ نازنین اور پشمینہ بھی اس پر ہنس رہی تھیں۔
"نازنین کا لحاظ کرنے لگا ہے شاید۔" شمیم خالہ نے اپنا اندازہ ظاہر کیا اور نغمہ نے بے ساختہ بہن کی طرف دیکھا۔ سیف نے تو معلوم نہیں اس کی بہن کی آمد کا خیال رکھا تھا کہ نہیں۔ اس نے البتہ بہن کی نصیحتوں پر ضرور کان دھرے تھے۔ ہمیشہ اگلے کی پہل کے انتظار میں تو نرا وقت ہی ضائع ہوا ہے۔ بجائے اس کے کبھی خود پہل کر کے دیکھ لینی چاہیے۔ پہل کا قدم بھلے پہاڑ جیسا بھاری ہے لیکن لطف و کرم کے چشمے بھی اسی سے پھوٹتے ہیں۔
اللہ پاک گھر کے ماحول کو ہنستا بستا رکھے، بزرگ یونہی تو نہیں کہہ گئے کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ملے گا۔ لہجہ نرم رکھنے میں ہی بندے کی بھلائی ہے۔ زبان کی دھار تیز ہو گی تو رشتے نرے قطع ہی ہوں گے۔
"میرا تو دل چاہ رہا تھا پشمینہ کو بھی ساتھ لے چلتے۔" نغمہ نے پشمینہ کو دیکھا جو کسی خیال سے چونکی تھی۔
"نہیں بھائی آپ ہو آئیں۔"
"آپ بتائیں اماں۔ دو ہی دن کی تو بات ہے۔" نغمہ نے ساس کو دیکھا۔
"نہیں بھائی۔ اماں اکیلی ہو جائیں گی۔ میرے جانے کا پروگرام پھر کبھی بنا لیں گے۔" پشمینہ نے ماں کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ زور دے کر سنا دیا۔
اور پشمینہ کی عدم دلچسپی دیکھ کر شمیم بھی خاموش رہیں۔
بعد میں نازنین نے بھی بہت اصرار کیا لیکن اس کی ناں ہاں میں تبدیل نہیں ہوئی۔ گزرے کچھ دنوں میں خیالات ایک بار پھر درہم برہم سے ہونے لگے تھے۔ رئیس سے چھت پر ہوئی وہ آخری گفتگو اسے بھلائے نہ بھولتی تھی۔ وہ اپنا ذہن بٹانے کی ہر ممکن کوشش کر چکی تھی لیکن سب اپنے ہاتھوں بے کار ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی اس کی خاطر خود کو تباہ حال کر رہا تھا، یہ بات ذہن سے ہٹائے نہ ہٹتی تھی۔ بلکہ اب تو وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی لیکن ظاہر ہے اس طرح چھت پر آتے جاتے رکنا ایک تو انتہائی خطرناک تھا دوسرے ان کی چھت بھی ایک گھر چھوڑ کر تھی۔ کبھی تھک ہار کر سوچتی نازنین کو لیے دوبارہ نیچے چلی جائے۔ نہ رئیس سے کبھی آمنا سامنا ہو نہ اس کا دل جلے کڑھے۔ لیکن بات صرف چھتوں کی کہاں تھی۔ اس روز کیسے وہ رباب لوگوں کے ہاں اتفاقاً مل گیا تھا۔ اب وہ گاؤں واپس آ چکا تھا تو ایسے اتفاقات بھی معمول کی بات ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس رات والی ملاقات کے بعد تو وہ اور بھی سنجیدگی سے اسے سوچنے لگی تھی۔ سگریٹ پی پی کر وہ اپنی جان جلا رہا تھا۔ لوگوں کے طعنوں سے ایک بار پھر اپنا سینہ چھلنی ہوتے دیکھ رہا تھا۔ نجانے وہ اتنا حساس کیوں تھا۔ کبھی کبھی ڈھیٹ بن کر جی لینے میں کیا حرج ہے۔ ہر طرف سے کان لپیٹ لینا بھی کتنا آسان حل ہے لیکن رئیس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔
پشمینہ نے تھک ہار کر سوچا اور سوچتے سوچتے اسے ایک راہ سوجھی تھی۔ بڑے دنوں سے وہ سائیڈ ٹیبل پہ بے کار پڑے نازنین کے موبائل کو سوچتی نظروں سے دیکھتے اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ رئیس کو سمجھانے کے لیے اسے فون کا سہارا لینا چاہیے۔ لیکن اسے رئیس کا نمبر معلوم نہیں تھا اور موقع پا کر بابا اور سیف لالہ کے موبائلز چیک کرنے پر بھی نمبر اسے نہیں ملا کیونکہ ظاہر ہے ان لوگوں سے تعلقات نہیں تھے تو نمبر بھی کسی کے پاس نہیں تھا۔ بہت سوچنے پر رباب کا خیال آیا۔ اور اس سے سلائی کڑھائی سیکھنے کے دوران پشمینہ نے ایک دن خود ہی موبائل سے نمبر بھی نکال لیا۔

"میں تمہارا موبائل استعمال کر لوں نازنین۔" ...نے اجازت طلب نظروں سے نازنین کو دیکھا ...ہنس پڑی۔
"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے پاگل۔ لے لیا کرو۔"
"اچھا؟" پشمینہ نے گھبراہٹ سے تھوک نگلا۔
"ہاں بھئی، میرے اب کس کام کا۔ اصل میں ...تھا ہی امی کا۔ ان کے بعد میرے پاس آ گیا تو بس ...یا کبھی کبھار خالہ سے بات کرنے کے لیے ...ستعمال کر لیتی تھی۔ اور اب تو باجی کے پاس ہوں ...اں۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی۔" وہ کتاب میں انگلی ...ے کر نرمی اور فرصت سے وضاحت دینے لگی۔ اور ...تو پشمینہ بھی دیکھ چکی تھی کہ نازنین کبھی اپنے موبائل ...مصروف نظر نہیں آتی تھی۔ سارا سارا دن وہ چھت ...بیکار پڑا رہتا۔ پشمینہ نے ہی باری کو پیسے دے کر ...اس میں رقم ڈلوائی۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں ...ے رئیس کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے اُس شام چھت ...کے برآمدے میں بیٹھے اس نے پہلی بار کال ملائی۔ ...نازنین اندر کمرے میں پڑھنے میں مصروف تھی۔
"ہیلو۔" رئیس نے ہیلو کہا تو پشمینہ نے ڈر کے ...مارے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ جانے انجانے میں وہ ...ایک بہت بڑا قدم اٹھا چکی تھی اور اب پیچھے ہٹنا شاید ...ممکن نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے سانس درست کر کے ...ہمت پیدا کی۔
"میں پشمینہ۔"
"پ......" وہ بے ساختہ کہتے کہتے رُکا۔ معلوم ...نہیں پاس کون تھا، کچھ دیر کے لیے مکمل خاموشی چھا ...گئی اور ذرا دیر کے وقفے کے بعد رئیس کی آواز ...دوبارہ سنائی دی۔
"پشمینہ...... تم...... مجھے یقین نہیں آ رہا۔" وہ ...سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آیا، آرام سے بات کرنے ...کے لیے یہ مناسب جگہ تھی۔ اس نے بیٹھنے کے لیے کرسی ...کھینچی۔ ادھر پشمینہ برآمدے کے ستون سے ٹیک ...لگائے خود بھی پرسکون ماحول میں بیٹھی تھی۔ یہاں سے ایک دوسرے کی چھتیں دکھائی نہ دیتی تھیں۔
"اب یہ نہ کہنا ایک کام سے فون کیا ہے۔" رئیس نے گویا التجا کی اور پشمینہ کو ہنسی آ گئی۔
"اور کیوں نہ کہوں۔"
"بھئی کچھ دیر تو خوش ہو لینے دو۔" وہ بھی مسکرایا۔
"تو پھر وہ کام......؟" پشمینہ نے چھیڑا۔
"پھر کبھی کہہ لینا۔"
"اور تمہیں تو یہ بھی پتا ہو گا کہ میرا وہ کام کیا ہے۔" پشمینہ اپنی کال کو نارمل لیے جانے پر اب جیسے خود بھی کچھ سکون کی حالت میں آئی تھی۔
"سگریٹ پینا چھوڑ دوں تاکہ تمہاری پتلی گردن قیامت میں کسی نہ جائے۔" وہ بڑے دل سے بہت اندر سے ہنس رہا تھا۔ پشمینہ کی پلکیں خوشی سے بھیگ گئیں۔ وہ اب کہاں ہنستا تھا۔
"نہیں۔ لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ تم یہ مرنے ورنے کی باتیں چھوڑ دو۔"
"کوئی زندگی کی طرف لے تو آئے۔" اُس نے یک لخت ایک سنجیدہ آہ بھری۔
"میں کچھ کہوں رئیس؟"
"ہوں کہو۔ تمہیں ہی سن رہا ہوں۔"
"تم کہیں جاب وغیرہ کی کوشش کرو، خود کو مصروف رکھو۔"
"تو یہ تھا وہ ضروری کام؟"
"ہاں یہی تھا۔ تو اب تم بگڑو گے اس بات پر؟" وہ خفا ہونے لگی۔
"نہیں۔" وہ کچھ دیر کے لیے مکمل خاموش ہو گیا۔ "تم سے سچ مچ کوئی گلہ نہیں۔ تمہاری باتیں بھی صحیح ہیں۔ دل چاہتا ہے میں بھی تم جیسا بن جاؤں حقیقت پسند، سمجھ دار۔"
"میرے سمجھانے کا اثر ہوتا ہے تم پر؟" وہ یقین چاہ رہی تھی۔
"ہاں چھت پر تمہاری راہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ سگریٹ تم نے منع نہیں کی تھی اس لیے اگلے دن

دوسری ڈبیا خرید لی۔"

"اچھا تو اگر منع کروں تب چھوڑ دو گے؟" وہ مسکرادی تھی اس کی بات پر۔

"پتا نہیں۔ اب تک تو چھوڑ کر دیکھی نہیں۔"

"کتنے سگریٹ پیتے ہو دن میں؟" پشمینہ ایک دم سنجیدہ ہوئی۔ ذہنی رو مکمل ادھر پلٹ گئی۔

"یہ بھی کبھی نہیں گنا۔" اس نے کندھے اُچکائے، وہ واقعی نہیں جانتا تھا۔

"اچھا تو کل صبح سے رات تک گن کر حساب رکھنا، میں کل دوبارہ پوچھوں گی۔"

"تو پھر...... اس سے کیا ہوگا؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"آہستہ آہستہ تعداد کم کریں گے۔"

"ہاہاہا۔" اس نے سمجھ کر لطف لیا۔ "بڑی سیانی ہو، یعنی میری ایڈکشن کا بھی احساس ہے۔"

"زبردستی کسی کام میں اچھی نہیں ہوتی، سختی اور پابندی زیادہ اس جانب کھینچتی ہے۔"

"ہوں۔ صحیح۔" وہ بھی قائل ہوا۔

"اچھا ابھی بند کرتی ہوں رئیس۔ کل ان شاء اللہ پھر کال کروں گی۔" پشمینہ اجازت لیتے فوراً وہاں سے اُٹھ گئی۔

"میں انتظار کروں گا۔"

"ہوں۔" اس نے بات لمبی نہ کرتے موبائل بند کر دیا۔ ستون سے ہٹ کر اندر آئی تو نازنین آنکھوں کے سامنے کتاب لگائے جمائیاں لے رہی تھی۔

"اتنی نیند آرہی ہے تو سو کیوں نہیں جاتیں۔" پشمینہ نے مسکراتے ہوئے موبائل میز پر رکھ دیا۔ "لائٹ آف کردوں؟"

"نہیں، کچھ دیر اور پڑھوں گی۔"

"اچھا چلو، پھر میں بھی ناول پورا کرلوں، دوپہر کو شروع کیا تھا۔" اس نے ڈائجسٹ اٹھالیا اور نازنین نے ایک خاموش سنجیدہ نظر پشمینہ پر ڈال کر کچھ سوچا پھر توجہ کتاب کی طرف مبذول کرلی۔

دراصل پشمینہ کی طبیعت اور مزاج سے واقفیت کی بنا پر اس کا یہی اندازہ تھا کہ وہ دروازے سے ہی اس کال کی باتیں بتاتی ہوئی آئے گی لیکن چپکے سے موبائل رکھ کر بالکل الگ موضوع پر بات کر کے اس کا گریز صاف ظاہر ہوا تھا اور "گریز" بلاوجہ نہیں ہوا کرتے۔ لیکن نازنین یہ بات محض سوچ کر رہ گئی، سوال کر کے بلاوجہ پرسنل ہونا نامناسب تھا اس لیے بغیر کچھ جتائے پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

دن بہت مصروف اور تھکا دینے والا گزرا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے اللہ کا کرم کچھ ایسا ہوا تھا کہ اُسے روز کے حساب سے باقاعدہ کیسز ملنے لگے تھے۔ دن مختلف لوگوں سے ملنے ملانے، کیس کو اسٹڈی کر کے اس کے حل پر کام کرنے میں گزر جاتا۔ آج البتہ اس نے اکا جان کے ڈیرے پہ جا کر جرگہ بلانے کی بات کرلی تھی۔ خاندان میں اس وقت اکا جان ہی سب سے بڑے تھے اور خاندانی جرگے کے مشیر بھی اور اب باقیوں کو مطلع کر کے واسع کو دن اور وقت سے آگاہ کرنا بھی ان ہی کی ذمہ داری تھی۔

جمیلہ نے کھانا اس کے سامنے رکھا اور خود بھی فرصت سے پاس بیٹھ گئیں۔ واسع نے انہیں اکا جان سے ملنے اور جرگہ طلب کرنے کے بارے میں بتا کر دعا مانگنے کا کہا۔

"اللہ پاک سب اچھا کرے گا واسع۔ وہ اوپر والا تمہاری محنت اور جذبہ دیکھ رہا ہے ناں۔ بس اگر تمہارے بابا نے کوئی لکھا پڑھی بھی کرلی ہوتی تو......"

"نہیں اماں۔" واسع نے فوراً سرنفی میں ہلایا۔

"مجھے بابا سے کبھی یہ شکوہ نہیں رہا، جسے آپ اُن کی غلطی سمجھ رہی ہیں، حساب کتاب کی آنکھ سے شاید غلطی ہو لیکن بابا کی سادگی ان کی نیک نیتی اور خلوص کو دنیا کے کسی ترازو میں تولا نہیں جاسکتا، وہ مخلص بھی تھے، فیاض اور بامروت بھی، وہ پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ سگے بھائی سے ثبوت لکھوا کر خون کے رشتے کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جانتے وہ بھی تھے کہ دستاویز کتنی

اہم ہوا کرتی ہے لیکن ان کے لیے اس مشکل گھڑی میں بھائی محسن تھا اور وہ محسن سے ثبوت طلب کر کے خود اپنی نظروں میں نادم ہوجاتے، کوئی چاہے کچھ بھی کہے میں جانتا ہوں بابا صحیح تھے۔"

"تم قانون پڑھ کر بھی سچے جذبے اور خلوص کو ثبوت پر اہمیت دے رہے ہو، اپنی کامیابی کے لیے یقین رہنا میرے بچے۔" جمیلہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"مجھے بھی یقین ہے اماں کیونکہ میں اپنا حق لینے کی نہیں بلکہ جھوٹ اور سچ کا چہرا دنیا پر عیاں کرنے کی راہ پر ہوں۔"

"تو کب بلایا ہے جرگہ؟"

"یہ تو نہیں بتایا۔ کہہ رہے تھے اسی جمعرات جمعہ تک ممکن ہے۔"

"اصل میں مجھے تم سے ایک اور بات بھی کہنی تھی۔ پہلے ہی مجھے لگتا ہے ہم نے دیر کردی، اس دن تم سے بات شروع کی تو تم نئے دفتر اور چاچا سے بات کرنے کے معاملے میں الجھے ہوئے تھے۔ اور اب دیکھ لو۔ مصروفیت اور کام تو بندے کا ساتھ چھوڑتے ہی نہیں۔ آج ماشاء اللہ وکیل بن چکے ہو تو اور معاملات نکلتے چلے آرہے ہیں۔"

"کس معاملے میں بات کی تھی؟" واسع کو ان کی لمبی چوڑی تمہید سے کچھ بھی اخذ کرنا مشکل تھا، شاید اس کا دماغ ابھی بھی پہلے معاملے میں الجھا تھا۔

"تمہیں بتایا تھا واسع کہ میں زمرد کے لیے تمہاری پھوپھی کی طرف جانا چاہتی ہوں۔"

"اور...... زمرد ہی کیوں؟" واسع نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"کیا مطلب زمرد ہی کیوں؟" جمیلہ تنگ کر اُلٹا غصہ کھاگئیں۔ "اچھی لگتی ہے مجھے۔"

"تو مطلب میری پسند کی کوئی اہمیت نہیں۔" واسع کو لگا اماں تو کسی وقت منہ اٹھائے چل بھی دیں گی۔ آج کم از کم وہ کھل کر بات ہی کرلے، کل کو کہیں گی مجھے کہاں پتا تھا وغیرہ وغیرہ۔"

"تمہاری پسند۔" جمیلہ کا حلق خشک ہوا۔ واسع تو اُن سے کھل کر کچھ بات کرنے لگا تھا۔

"زمرد میں کیا برائی ہے واسع، کتنی سیدھی اور نیک بچی ہے، پیاری بھی بہت ہے۔ ایک بار سوچ تو لو۔"

"میں بھی زمرد کے بارے میں یہی خیالات رکھتا ہوں اماں۔ بلاشک وشبہ وہ بہت اچھی ہے، لیکن آپ ذرا حقیقت پسندی سے کیوں نہیں سوچ لیتیں، صرف آپ کے زمرد کو پسند کرلینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ ذرا پھوپھی کے رویے پر بھی غور کریں۔ کیا کسی بھی زاویے سے بھی آپ کو لگا کہ وہ ہمارے ہاں رشتے کرنے میں ذرا سی بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ مجھے تو صاف یہی نظر آتا ہے کہ آپ رشتہ مانگنے جائیں گی اور وہاں سے یک لفظی انکار ہوگا۔"

"لیکن کوشش......" جمیلہ کو اپنے الفاظ گم ہوتے دکھائی دیئے۔ پڑھی لکھی سمجھ دار اولاد سے بات کرنا بھی کتنا مشکل ہوا کرتا ہے۔

"کوشش......" اگلوں کے ہاتھوں شرمندہ ہونے کی؟" وہ ازحد سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ "بہرحال آپ ماں ہیں، میں منع نہیں کرسکتا۔ جائیں اپنی مرضی کر کے دیکھ لیں۔ لیکن ایک بات پھر آپ کو میری بھی ماننا ہوگی، کہ اگر وہاں سے انکار ہوگیا تو آپ وہاں جائیں گی جہاں میں چاہتا ہوں۔"

"تم......" جمیلہ بیچ میں ہی اٹک گئیں، وہ صاف الفاظ میں اپنی پسند بتانا چاہ رہا تھا اور وہ سننے تک کو تیار نہ تھیں۔ لیکن یہ معاملہ اب شاید چاہنے نہ چاہنے کا نہ تھا۔ واسع کی بات سننا تو جیسے ناگزیر ہوگیا تھا۔ "تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"مجھے نازنین پسند ہے۔" واسع نے بنا رُکے اور جھجکے اعتماد سے اظہار کردیا کہ نازنین سے بھی اس کا یہی عہد تھا کہ اگلی بات اب سیدھی سامنے کی راہ سے ہوگی اور اس کے لیے ظاہر ہے بات کو بڑوں کے سامنے رکھنا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے وہاں آپ کو انکار بھی نہیں ہوگا۔" واسع نے مزید کہا اور رباب جو کھانے کے بعد

واسع کے لیے پانی لے کر اندر آرہی تھی، دروازے کے باہر ہی ساکت ہوئی، جمیلہ بھی واسع کے صاف واضح اقرار پر کچھ دیر تو چپ کی چپ بیٹھی رہیں پھر اندر کی کھولن جلے کٹے سوال کی صورت باہر نکالی۔

"کیوں کچھ طے کیا ہے آپس میں؟"

"نہیں۔" ماں کے الفاظ پر واسع کی نگاہوں میں واضح ناراضی جھلکی۔ "ایسی لگتی ہے وہ آپ کو؟ میں تو گلشن پھوپھی سے ان لوگوں کے مزاج کا موازنہ کر کے آپ کو بتارہا ہوں۔ انکار یہاں بھی ہوسکتا ہے لیکن جس صاف کورے جواب کا آپ کو شوق ہورہا ہے وہ صرف پھوپھی ہی آپ کو دے سکتی ہے، کیونکہ انہیں "دینے" کے لیے ہمارے گھر میں کچھ نہیں ہے۔" وہ جوتے پاؤں میں پھنساتے اپنی علاقائی ٹوپی سر پر رکھتے باہر نکل گیا۔ اور جمیلہ کی نظریں باہر جاتے واسع اور اندر آتی رباب پر جمی تھیں۔

"اماں۔ یہ نازنین کب سے؟" رباب ہلدی چھڑا لیے ماں کے پہلو میں آئی۔

"مجھے کیا پتا مڑے۔" جمیلہ کے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ مایوسی کا غلبہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین چکا تھا۔

"اب وہ لالہ کو کہاں پسند آگئی۔" رباب کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ پیلی پڑتی رنگت میں مستقبل کے اندیشے گھلے تھے۔

"نازنین سے پہلے تم اپنی پھوپھی اور نصیر کا سوچو۔" جمیلہ نے ناراض نگاہوں سے رباب کو دیکھا۔ "واسع کی بات نہیں سنی تم نے، اسے تو پورا یقین ہے کہ وہاں سے انکار ہوجائے گا۔ اور ابھی تو اسے یہ نہیں پتا کہ تمہاری پھوپھی جبار بھائی کے ہاں رشتہ لے کر جاچکی ہے۔ یہ بات معلوم ہوتی اس کو تو مجھے اجازت نہ دیتا وہاں جانے کی۔ کیونکہ یہ تو صاف صاف اگلے کے رشتے میں رخنہ ڈالنے والی بات ہوجاتی ہے اور ایک وہ نصیر ہے۔ یہی تھا تمہارا اس پر بھروسا۔" جمیلہ بھی اب اپنا غصہ اس پر نکال رہی تھیں۔

"میں نے پوچھا تھا اس سے۔" رباب آہستہ سے منمنائی۔

"اچھا۔" جمیلہ نے چونک کر رباب کو دیکھا۔ "کیا بات ہوئی، کیا کہہ رہا تھا۔"

"وہ کہہ رہا تھا مجھے رشتے کا نہیں پتا۔"

"تو...... پھر وہ بات کرے گا اپنی اماں سے، آئے گا کب؟" جمیلہ کی ٹوٹتی آس پھر سے سر اٹھانے لگی۔

"زیادہ بات نہیں ہوئی، کہہ رہا تھا، جلد آئے گا۔"

"اللہ تیرا شکر، کوئی تو اچھی خبر سنی۔" جمیلہ نے ہاتھ اٹھا کر اوپر دیکھا اور رباب خاموشی سے اٹھ گئی۔ نصیر کے ان دو جملوں نے تسلی تو اسے بھی دی تھی، پر یہ محبت کی تیسری آنکھ، نجانے کیوں مسلسل کسی خدشے کے تحت پھڑک رہی تھی۔ ہوسکتا ہے ماں سے رشتے کا اس نے نہ کہا ہو لیکن پھر اس کا بدلا رویہ۔

☆☆☆

"نازنین سارا سامان ایک بار پھر چیک کرلو، اور یہ معیزہ کے سامان کا چھوٹا تھیلا تم اپنے بیگ میں رکھ لو۔" نغمہ بولائی ہوئی سی چہار جانب دوڑ رہی تھی۔

"یہاں سے تو سب اٹھالیا، ایک چکر چھت کا لگا آتی ہوں۔ وہاں کچھ رہ نہ گیا ہو۔" نازنین نے سوچتے انداز میں کہہ کر پاس کھڑی پشمینہ سے تائید چاہی لیکن وہ بنا جواب دیئے خالی خالی نظروں سے دیکھے گئی۔ یہی تو وہ نہیں چاہتی تھی کہ نازنین دوبارہ اوپر جائے۔ نازنین اپنا موبائل چھت پر ہی چھوڑ آئی تھی اور پشمینہ نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کیے رکھی تاکہ موبائل یہیں رہ جائے لیکن اب تو وہ دوبارہ چھت پر جارہی تھی۔ پشمینہ بھی تھکے مایوس قدموں سے پیچھے آگئی۔ نازنین گھوم پھر کر ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی۔

"یہ نوٹس بھی کام کے ہیں۔" اس نے کاغذوں کا پلندہ اٹھایا اور مڑی۔

"ارے موبائل بھی یہیں رکھا ہے۔" اس نے ہنس کر موبائل اٹھایا اور کمرے سے نکلنے لگی۔

"چلو لالہ آنہ گئے ہوں۔" اس نے مڑ کر پشمینہ کو متوجہ کیا۔ سیف لالہ بابا کو ڈیرہ تک چھوڑنے گئے پھر ان ہی نے ان کو بس میں بٹھا کر آنا تھا۔

"ہوں۔" پشمینہ نے بجھے دل سے سر جھکایا اور قدم آگے بڑھائے، چہرے پر ایک دم مایوسی اور پژمردگی چھائی تھی۔

"کیا ہوا۔" نازنین پلٹ کر واپس ہوئی۔

"کچھ نہیں۔ چلو۔" پشمینہ زبردستی مسکرائی۔

"بتاؤ نا کیا بات ہے؟" اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے اونچا کرتے نازنین نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بھی پھیکا سا مسکرادی۔ "مجھے لگا تم موبائل یہیں رکھ جاؤ گی۔ وہ تم نے کہا تھا نا، تمہارے کسی کام کا نہیں ہے۔" وہ آخر میں سر جھکا کر دل کی بات کہہ ہی بیٹھی اور نازنین فوری طور پر کچھ بول نہیں پائی۔ پچھلے ہفتے پشمینہ نے پہلی مرتبہ اس سے موبائل مانگا تھا اور پھر ہر شام وہ کچھ دیر باہر برآمدے میں ٹہل کر کسی سے باتیں کرتی اور اندر آکر بنا کوئی تبصرہ کیے موبائل رکھ دیتی۔

"پشمینہ تم رئیس سے بات کرتی ہو؟" نازنین نے دھیمی آواز میں بالآخر اپنا اندازہ اس پر ظاہر کرہی دیا۔ پشمینہ بھی جواباً سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

"کیا تم صحیح کررہی ہو؟"

"سوری میں آئندہ تمہارا موبائل نہیں مانگوں گی۔"

"پلیز پشمینہ۔" نازنین نے دبا دبا احتجاج کیا۔ "میں اپنے موبائل کی وجہ سے نہیں کہہ رہی، میں تمہارے حالات کی وجہ سے کہہ رہی ہوں، اور ٹھیک ہے کہ تم نے اپنا معاملہ مجھ سے شیئر نہیں کیا، مداخلت مجھے زیب نہیں دیتی لیکن کیا دوست ہونے کے ناطے بھی میرا کوئی حق نہیں؟"

"وہ اپنے ساتھ بہت غلط کررہا تھا نازنین۔ اپنی صحت، زندگی، فیوچر اسے کسی بات کی پرواہ نہیں رہی تھی پر اب وہ بدل رہا ہے، تم شاید یقین نہ کرو لیکن وہ میرا کہنا مانتے ہوئے اب سگریٹ بھی چھوڑ رہا ہے۔"

"اس کے حالات سدھارتے کہیں تم اپنا نقصان نہ کر بیٹھو۔ اللہ نہ کرے۔" نازنین بے ساختہ کہہ بیٹھی اور پشمینہ سے بھی کچھ بولا نہیں گیا۔

نازنین نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی جانب موڑا۔

"غلطی کا دفاع نہیں کرتے پشمینہ، اسے تسلیم کرتے ہیں۔ تم لوگوں سے ان کی فیملی کے تعلقات نہیں ہیں۔ تم اب اس کی منگیتر نہیں ہو، اور اس تعلق کی نوعیت تمہاری نظر میں جو بھی ہو، تم اسے دنیا سے بہرحال چھپانا چاہتی ہو۔ تو بس یہی اس رشتے کی سچائی ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"ہوں۔" پشمینہ نے معلوم نہیں اس کی بات سے کیا اخذ کیا کہ ہاتھ چھڑا کر چارپائی پہ رکھا موبائل اٹھا کر نازنین کے ہاتھ پر دھرا اور باہر نکل گئی۔ نازنین نے حیرت سے اس کے عمل کو دیکھا، دل ایک دم دکھ سے بھر گیا۔ پشمینہ بجائے سمجھنے کے اس سے خفا ہوکر گئی تھی۔ نازنین نے ایک نظر دور جاتی پشمینہ کو دیکھا، دوسری نظر موبائل پر ڈالی اور اسے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

انسان کے لیے سب سے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جب وہ کسی کے زیر بار ہو، آپ اپنے دشمن سے بحث کرسکتے ہیں اپنے محسن سے نہیں۔ وہ ان لوگوں کی بلاشک وشبہ ممنون احسان مند تھی جنہوں نے مشکل حالات میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ بلکہ سب سے زیادہ جذباتی سپورٹ بھی پشمینہ کی طرف سے ملی تھی۔ جس نے ایک بہن ایک سہیلی کی طرح اسے اپنے قریب کیا تھا۔ اور آج پشمینہ ایک ایسے معاملے میں اس کا ساتھ چاہ رہی تھی جس میں دونوں کا صرف نقصان تھا اور فی الوقت نازنین ایسے دوراہے پر کھڑی تھی کہ ماننا یا روکنا دونوں اس کے حق میں نہیں تھے۔ سچ ہے کہ کبھی کبھار آپ اپنوں کے ہاتھوں بھی بہت بری طرح بلیک میل ہوجاتے ہیں۔ اس دنیا کی محبت جس شکل میں بھی ہو خراج ضرور مانگتی ہے۔ نازنین بھی اس جذباتی لمحے میں پشمینہ سے شکست کھا گئی۔ موبائل اس نے وہیں رہنے دیا، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ پاک پشمینہ کے ساتھ کچھ برا نہ ہونے دے۔

☆☆☆

کھودینے کا ڈر، پالینے کی ضد ان دنوں دھن بن کر رباب کے ذہن و دل پر سوار ہوچکی تھی۔

نگار چاچی کی چادروں کا کام اس نے دن رات ایک کر کے دو ہی دن میں پورا کر کے آج اُن کے گھر جانے کی ٹھانی تھی۔ اسے نیلم سے یہ جاننے کی شدید خواہش ہو رہی تھی کہ نصیر کے رشتے پر اُن کے گھر میں کیا سوچا جا رہا ہے۔ پچھلی شام بھی ایسا ہی کچھ جان لینے کی کوشش اسے ساتھ والے گھر لے گئی تھی۔ واسع کی پسند جاننے کے بعد وہ نازنین کی طرف بھاگی تھی، حالانکہ جانتی خود بھی تھی کہ وہاں جا کر بھلا نازنین سے کیا کہے گی، لیکن مجبور تھی نہ دل کو قرار تھا نہ پیروں کو آرام۔ البتہ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نازنین تو امتحان دینے کوئٹہ چلی گئی ہے اور قریب دو ہفتوں بعد اس کی واپسی ہو گی۔ تب رباب کے دل میں نیلم سے ملنے کی بے تابی بڑھی۔ یہ جاننا بھی تو بہت اہم تھا کہ آخر وہ لوگ کیا سوچ رہے تھے۔ کیا معلوم کوئی خوشی کی خبر وہاں اس کی منتظر ہو۔

''میں کچھ مدد کرواؤں؟'' وہ نگار چاچی کو اندر چادریں دے کر نیلم کے پاس کچن میں آ گئی۔ چاچی کا بلڈ پریشر کچھ زیادہ تھا اس لیے آرام کر رہی تھیں۔

''نہ مڑے۔ بس اُلٹا سیدھا کسی نہ کسی طرح کر ہی لیتی ہوں۔'' نیلم ہنس پڑی۔

''پہلے شاید شبنم کرتی تھی؟''

''ہاں کوکنگ وہ سنبھالتی تھی اور میں گھر کی صفائیاں وغیرہ۔''

''تو اب۔'' رباب نے معنی خیزی سے مسکرا کر نیلم کو دیکھا۔ ''جب تم چلی جاؤ گی تو چاچی کے لیے بڑی مشکل نہیں ہو جائے گی؟''

''میں نے کہاں جانا ہے۔'' وہ بری طرح جھینپ گئی اور رباب تو آئی ہی اسی موضوع پر بات کرنے تھی، موقع ضائع کیے بغیر فوراً ہی بات چھیڑ دی۔

''میں نے سنا ہے گلشن پھوپھی رشتہ لائی ہیں؟''

''ہوں۔ بات تو کی ہے۔'' نیلم نے مختصر جواب کا سہارا لیا۔

''تو......؟'' رباب نے ذرا کی ذرا نیلم کو دیکھا۔ ''کیا سوچا ہے پھر؟''

''پتا نہیں۔ اماں بابا نے آپس میں بات کی ہو شاید۔ مجھے کہاں بتائیں گے۔''

''وہ...... اصل میں......'' رباب نے جھجک کر کہنا شروع کیا تو نیلم کام روک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ہمیں زمرد پسند ہے ناں واسع کے لیے تو اماں پریشان ہو رہی تھیں، تم تو دوست ہو میری، میں نے سوچا پوچھ لوں۔''

''واسع اور زمرد۔ یا رباب اور نصیر؟'' نیلم نے مسکراتے ہوئے اس کا چہرا اوپر کیا تو رباب بری طرح چونکی۔

''تت...... تمہیں......''

''اندازہ ہے میرا۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ''پوری بات تم خود بتا دو۔ پوچھنے کی وجہ یہی ہے نا؟'' نیلم مسکراتے ہوئے تصدیق چاہ رہی تھی اور رباب بجائے جواب دینے کے ہاتھوں میں چہرا دے کر رونے لگی تھی۔

''میری مدد کرو نیلم۔ خدا کے لیے۔''

''ارے رونے کیوں لگیں۔ رباب۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لگاتے ایک دم پریشان ہو گئی۔ ''پلیز رباب آرام سے بتاؤ۔'' وہ اپنے دوپٹے سے اس کی آنکھیں صاف کرنے لگی۔ اور رباب نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے اسے اپنے اور نصیر کی محبت کے بارے میں صاف صاف بتا دیا۔

''تو نصیر نے پھوپھی کو رشتہ کیوں لانے دیا۔ اسے تو اسٹینڈ لینا چاہیے تھا، یہی تو موقع ہے۔''

''وہ کہتا ہے اماں اپنی مرضی سے گئی ہیں۔ اب تم ہی مجھے بتاؤ نیلم۔ یہاں سب کیا سوچ رہے ہیں۔'' رباب نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''سچ کہہ رہی ہوں رباب۔ مجھے واقعی کچھ نہیں پتا۔ لیکن تم پریشان مت ہو اگر نصیر تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہے تو ضرور معاملات اپنے حق میں کر لے گا، پھر ہماری طرف سے جواب بھی شاید ابھی نہیں گیا، اُمید ہے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہو گا۔''

''ہاں بس واسع۔'' رباب جیسے کچھ سوچتے

بے ساختہ بڑبڑائی تھی۔

''واسع۔'' نیلم چونکی۔ ''اُس کی طرف سے کیا ہے، کیا بدلئی کے حوالے سے؟'' اُس نے جیسے اندازہ لگایا۔

''ہاں کنا۔'' رباب نے سخت مایوسی سے منہ بنایا۔ ''اُسے زمرد جو نہیں پسند۔''

''اچھا۔'' نیلم بھی متعجب ہوئی۔ ''تو پھر۔ کوئی......'' دل ایک خیال سے بے اختیار رُک سا گیا، اس نے تو اپنے آپ پر بھی اپنے دل کا حال بڑی مشکل میں عیاں کیا تھا، کیا قدرت کوئی کرشمہ کرنے والی تھی۔ وجود ساکن ہوا۔

''ہاں وہ کسی اور سے......'' موبائل فون کی اونچی آواز عین جیسے سر پر بجی، دونوں نے بیک وقت پلٹ کر آواز کے تعاقب میں دیکھا۔ ذکی دروازے کی اوٹ میں جانے کب سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ لیکن اُس کے اپنے سیل نے کام بگاڑ دیا وہ بھی عین ایسے وقت پر جب وہ سانس تک روکے اپنے دشمن کی زندگی کے اہم ترین راز سے واقف ہونے والا تھا۔

''کیا باتیں کر رہی ہو تم دونوں؟'' اس نے شکیں نظروں سے باری باری نیلم اور رباب کو دیکھا، جو ایک دم ہی بری طرح سہم گئی تھیں۔

''یہ سب تمہارے کرنے کی باتیں ہیں کیا۔ اب تم لوگ رشتوں پر بولو گی۔'' وہ اپنے پکڑے جانے کی خفت ان دونوں پر برس کر اُتار رہا تھا۔

''تم اندر جاؤ نیلم۔ ابھی......'' اس نے بہن کو ڈپٹ کر کہا تو وہ بنا لمحہ ضائع کیے بھاگی، ادھر رباب نے بھی اس کے پیچھے کھسکنے کی کوشش کی۔

''تم رُکو رباب۔'' اس نے بگڑے لہجے میں رباب کو روکا۔ اور پلٹ کر کمرے سے باہر جاتی نیلم کو دیکھا بلکہ اس کے غائب ہونے تک دیکھتا ہی رہا، پھر مڑ کر رباب کی طرف متوجہ ہوا اور پہلی نرم مسکراہٹ سے نوازا۔

''گھبراؤ نہیں۔'' نیلم کے سامنے غصہ کر رہا تھا۔ ''بھئی تم تو بہن ہو میری، بتاؤ کیا پریشانی ہے۔''

''کچھ نہیں ذکی! مجھے واقعی نیلم سے ایسی باتیں نہیں پوچھنی چاہیے تھیں۔ معافی چاہتی ہوں۔''

''تم سمجھیں نہیں پاگل۔ ادھر دیکھو۔'' وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔ رباب نے شکی نظروں سے دیکھا۔ ذکی کا میٹھا لہجہ کچھ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

''تم جس سے مدد مانگ رہی تھیں وہ تو تمہارے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ ہمارے ہاں فیصلے مرد ہی کرتے ہیں۔ اس گھر میں تمہارے کام اگر کوئی آ سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں۔''

''لیکن تم میری مدد کیوں کرو گے؟'' رباب نے دھڑکتا دل لیے صاف گوئی سے پوچھ لیا۔

''ایک بار کہہ کر تو دیکھو، پتا نہیں تم کس کے کہنے پر مجھ سے اتنی بدگمان ہو، میں تو تمہیں نیلم اور شبنم کی طرح اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں۔''

''لیکن تم میری مدد کیسے کر سکتے ہو؟'' رباب بری طرح بے یقین تھی، البتہ اندر ہی اندر ایک خیال پنپنے لگا کہ ذکی کا اس کی اور نیلم کی باتیں سن لینا کہیں قدرت کی کوئی مدد نہ ہو۔

''بالکل کر سکتا ہوں، لیکن پہلے مجھے پوری بات تو پتا ہو۔''

''بس یہی ہے پوری بات۔ جو نیلم کو بتائی۔'' وہ اب اس کے سامنے اپنا اور نصیر کا نام تو نہیں لے سکتی تھی۔ ذکی نے ایک نظر غور سے اسے دیکھتے کچھ سوچا۔

''اور واسع کی پسند؟ اسے تو اس سارے معاملے میں بس اسی ایک بات سے دلچسپی تھی۔'' لیکن وہ رباب پر ظاہر نہیں کر سکتا تھا اس لیے انداز سرسری رکھا۔ ذہن البتہ مسلسل کچھ سوچنے میں لگا تھا۔

''وہ اسے زمرد نہیں پسند، بس اتنا پتا ہے۔'' رباب کو دل میں سخت پشیمانی ہوئی کہ یہ موضوع اس نے نیلم سے چھیڑا ہی کیوں۔

''لیکن تم کچھ اور کہہ رہی تھیں۔''

''مجھے زیادہ نہیں پتا۔'' رباب بنا اس کی طرف دیکھے تیزی سے سائیڈ سے نکل گئی۔ اور ذکی نے اس کی عجلت کو سخت غصے سے چپ چاپ دیکھا۔

''بھاگ کر دیکھ لو رباب بی بی۔ کام تو دوبارہ تمہیں ذکی سے ہی پڑنا ہے۔ وہ بھی بہت جلد۔''

☆☆☆

اکا جان نے جمعہ کی نماز کے بعد سہ پہر کو اپنے ڈیرے پر ہی جرگہ بلالیا تھا۔ واسع نے سب کی موجودگی میں اطلاع دینے کے انداز میں جبار چاچا کو بتادیا کہ وہ اپنے بابا کے ان سے کیے گئے معاہدے کی تفصیل جاننا چاہتا ہے اور کسی عدالتی کارروائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ ایک باغ کی خاطر وہ آپس کے مضبوط رشتوں میں کسی قسم کی دُوری اور دراڑ نہیں چاہتا۔ سب کی موجودگی میں سیدھے سبھاؤ اپنا موقف واضح کرنا قبیلوں کی روایات میں شامل تھا۔ اس طریقے سے باہمی تنازعات کو فہم و فراست اور خاندان علاقے کی روایات کو مدنظر رکھتے حل کرنا آسان ہوجاتا۔ واسع نے یہاں اپنی اور جبار چاچا کی پچھلی ملاقات کا کوئی ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ ملاقات جبار چاچا کے خیالات جاننے کی ایک کوشش تھی، کل کو تاکہ وہ یہ نہ کہیں کہ تم تو میرے پاس باغ مانگنے آئے ہی نہیں تھے تو میں کیسے دیتا۔

اور اب جبار چاچا کی باری تھی واسع کا موقف سن کر اپنی بات کرنے کی۔ اور وہ یقیناً اب جرگے میں وہی پیپر دکھانے والے تھے جس کے متعلق وہ گزشتہ ملاقات میں بتاچکے تھے۔

واسع کے ذہن میں یہی تھا کہ چچا نے ضرور کوئی جعلی دستاویز تیار کروالی تھی۔ عدالت میں ایسے نقلی ثبوت کا آنا معمول کی بات تھی۔ زیادہ تر تو ایسے جعلی پیپرز عدالت میں غلط ثابت ہوجانے پر جھٹلا دیئے جاتے تھے۔ اور بات پھر جرمانوں اور سزاؤں پر آجاتی۔ لیکن جرگوں کے طور طریقے عدالت سے قدرے مختلف تھے۔ یہاں اگر کوئی معاملہ متنازعہ ہوجاتا یا پھر گواہوں اور ثبوتوں کی عدم دستیابی یا اُن میں شکوک پائے جانے کی صورت میں معاملے کے سچ اور جھوٹ کی کسوٹی پر پرکھنا ہوتا تو اس کے لیے باوضو ہوکر کلام پاک پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی جاتی اور وہ بھی یہ کہہ کر کہ اگر قسم جھوٹی ہو تو اس کا اپنی بیوی سے نکاح باقی نہ رہے۔ زیادہ تر بڑے اور سنجیدہ نوعیت کے معاملات اسی طریقے سے حل کیے جاتے اور زیادہ تر خوش اسلوبی سے حق سچ کے ساتھ انجام کو پہنچ جاتے۔

واسع کو یقین تھا کہ چاچا جب جعلی کاغذ دکھائیں گے تو وہ اپنی اہلیت کو کام میں لاتے ہوئے فوراً اس کاغذ کی خامیوں اور کجیوں کو پالے گا۔ اور ان کی نشاندہی بھی جرگے میں سب کے سامنے کردے گا۔ تب جرگے کے ممبران کا فرض بن جائے گا کہ وہ جھوٹ سچ کو پرکھنے کے لیے جبار چاچا سے قسم اٹھواتے اور یہ تو تقریباً ناممکن تھا کہ قرآن پاک پہ ہاتھ رکھ کر وہ جھوٹی قسم کھاتے۔ یوں فیصلہ بڑی آسانی سے طے پاجاتا اور ایسی صورت میں تو ظاہر ہے کہ جبار چاچا کے لیے بھی یہ ماننے بغیر چارہ نہیں تھا کہ دستاویز جعلی ہے۔ دوسری وجہ اس خاندانی جرگے کو بلانے کی یہ تھی کہ وہ گاؤں برادری کے بڑے جرگے میں اپنے چچا کی پگڑی اُچھالنے ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا۔ چاہے انہوں نے ان سب سے جیسا بھی سلوک روا رکھا، بہرحال واسع کے لیے وہ اس کے باپ کی جگہ پر تھے۔ بھرے پُرے مجمع میں وہ ان کی سبکی کا باعث نہیں بننا چاہتا تھا۔ اپنے خاندانی جرگہ کی بات البتہ الگ تھی۔ یہاں تو پہلے ہی سب کو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ کون کس کے ساتھ کیا زیادتی کررہا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس جرگے کے لانے کی نوبت بھی جبار چاچا کی وجہ سے آئی تھی کیونکہ واسع سے اپنی تنہائی کی ملاقات کو وہ کسی خاطر میں نہیں لائے تھے۔

''آپ کچھ بولے کیوں نہیں لالہ؟'' اسفند، رئیس اور وہ جرگہ ختم ہونے کے بعد ڈیرے سے نکل کر پیدل گھروں کے قریب آئے تو دروازے کے باہر رُک گئے۔ واسع تب سے ہی بالکل خاموش تھا۔

''میرا تو سر چکرا گیا جبار چاچا کی بات سن کر۔'' رئیس نے حقیقتاً ایک جھرجھری لی تو واسع نے چونک کر رئیس کو دیکھا۔ رئیس کے لبوں پر عین اس کے دل کی ترجمانی تھی۔ وہ بھی صحیح معنوں میں چاچا کی بات سن کر چکرا سا گیا تھا۔ چاچا کی آج کی بات کو شاید وہ یوٹرن کا نام دے سکتا تھا۔ لیکن نہیں۔ واسع نے خود اپنی ہی سوچ پر سرنفی میں جھٹکا۔ چاچا نے اس کے ساتھ آج جرگے میں جو کیا وہ یوٹرن سے کہیں بہت آگے کی بات تھی۔

''آپ نے ہمیں بولنے بھی نہیں دیا لالہ۔ ہم دونوں گواہ ہیں انہوں نے عدالتی کاغذ کی بات کی تھی۔ لیکن اب......'' رئیس نے لب چباتے تاسف سے آج کی اُن باتوں کو سوچنے لگا، جو بڑی دیر ہوئی واسع کا سارا چین وسکون چھین کر لے گئی تھیں۔ جرگہ تو بڑی دیر ہوئی برخاست ہوچکا تھا لیکن وہاں ہوئی باتیں ابھی تک واسع کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ جبار چاچا سے اس کی پچھلی ملاقات کو محض پانچ دن گزرے تھے۔ اور انہی پانچ دنوں کے دوران جونہی انہیں واسع کے جرگہ طلب کرنے کی بات پتا چلی تو انہوں نے معاملے کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ واسع صرف چکرایا ہی نہیں تھا بلکہ انتہا درجے کا مایوس اور ناامید بھی ہوگیا تھا۔ آج اپنے حق کی بات کرنے پر اسے کیا کہا گیا تھا۔

''اگر واسع کا کہنا یہ ہے کہ حبیب الرحمٰن اور میرے بیچ تین سال کے پھل کی بات ہوئی تھی تو واسع میرے اور اپنے بابا کے اُس معاہدے کا کوئی گواہ پیش کردے، میں باغ دینے کو تیار ہوجاتا ہوں۔'' جبار احمد نے بڑے تحمل اور بردباری سے اس کی بات سن کر یہ جواب دیا اور واسع نے بے یقینی سے جبار چاچا کو دیکھ کر بے ساختہ اسفند اور رئیس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ دونوں بھی ہکا بکا تھے۔ واسع نے بڑی مشکل سے خود کو اس جھٹکے سے سنبھال کر دوبارہ چاچا کی طرف دیکھا۔

''اور آپ کا کہنا یہ ہے کہ میرے بابا کے ساتھ آپ کی تین سال کی فصل پر بات نہیں ہوئی تھی، صحیح ہے مان لیا۔ تو ہم آپ سے پوچھتے ہیں چاچا جی، آپ تو خود فریق ہیں اس معاہدے کے، آپ ہی ہمیں بتائیں کہ بابا سے آپ کا ایسا کیا معاہدہ ہوا تھا کہ باوجود دس سال گزر جانے کے باغ آپ کے تصرف میں ہے۔''

''سچ تو یہ ہے کہ حبیب الرحمٰن نے پندرہ لاکھ کے عوض باغ کا وہ اُجاڑ ویران ٹکڑا مجھے فروخت کردیا تھا، جس میں سیب خوبانی کے چند ایک درختوں کے سوا کچھ نہ تھا۔''

''پندرہ یا پانچ؟'' واسع نے تصحیح کرنے کی کوشش کی۔

''پورے پندرہ لاکھ میرے بچے۔'' جبار استہزائیہ ہنسے۔

''تو اس کا کوئی ثبوت؟''

''ہاں بالکل ہے۔'' انہوں نے جیب سے ایک پیلا رول کیا ہوا کاغذ نکالا اور اکا جان کے حوالے کردیا۔ اکا جان نے اس کاغذ کو کھول کر ایک نظر پڑھتے واسع کی طرف بڑھادیا۔ واسع کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ کوئی عدالتی پیپر نہ تھا بلکہ سادہ کاغذ پہ لکھی ایک عام سی مختصر تحریر تھی کہ ''میں حبیب الرحمٰن ۱۵ لاکھ کے عوض اپنا باغ عبدالجبار کو دے رہا ہوں۔'' نیچے عبدالجبار اور حبیب الرحمٰن کے دستخط تھے۔ واسع نے تحریر کو دھیان سے پڑھا، کہیں کہیں کٹنگز تھیں اور ایک واضح کٹنگ ''اپنا باغ اور عبدالجبار کے درمیان کچھ ڈیڑھ انچ جتنی جگہ پر لگی ہوئی تھی۔ واسع نے اس لائن کو پورے دھیان سے بار بار پڑھا اور پھر انگلی رکھ کر جبار چاچا کی طرف دیکھا۔

''اپنا باغ تین سال کے لیے عبدالجبار کے حوالے کررہا ہوں؟''

''ایسا نہیں لکھا۔'' جبار نے پہلو بدل کر باقیوں کی طرف دیکھا۔ ''میں قرآن پاک کی گواہی دینے کو تیار ہوں کہ یہ کاغذ، یہ دستخط سب بالکل اصلی ہیں۔ اور نہ ہی میں نے کوئی کٹنگ کی ہے۔ واسع گواہ لاسکتا ہے تو لائے ورنہ اسی تحریر کو ٹھیک مانا جائے۔''

''لیکن جبار تمہیں خرید و فرخت کا کام پکے

پیپر پہ کروانا چاہیے تھا، ایسے سادہ کاغذ پہ کیوں؟'' اکا جان نے اپنی موٹی عینک کے پیچھے سے جبار کو دیکھا۔

''کیونکہ لالہ یہ لین دین ہم دو سگے بھائیوں کے بیچ ہو رہا تھا تو ہم عدالت وغیرہ کے چکروں میں نہیں پڑے۔ اور حبیب الرحمن کی طبیعت تو آپ بھی جانتے تھے، وہ تو اتنے پر بھی راضی نہیں تھا، میں نے ہی زبردستی وہیں بیٹھے بیٹھے تحریر لکھ لی کہ احتیاط اچھی چیز ہے۔''

''اور اس تحریر کے وقت وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔'' اکا جان نے یہ سوال بھی جبار چاچا کی طرف دیکھ کر کیا۔

''جی بس ہم دونوں تھے۔'' جبار چاچا نے اُسی اطمینان سے جواب دیا تو کھلے کو اکا جان بھی سوچ میں پڑ گئے۔ اگرچہ واسع کا ساتھ دینے کو اس روز وہ تیار نہیں ہوئے تھے لیکن باغ کے معاملے میں وہ دل سے واسع ہی کے ساتھ تھے۔ جبار کے اعتماد نے ان کے اندر بھی مایوسی بھر دی کہ واسع بالآخر باغ سے محروم ہونے کے قریب تھا۔ انہوں نے سخت بھاری دل کے ساتھ واسع کو دیکھا۔

''کیا کہتے ہو واسع۔ اس کاغذ کے سچے یا جھوٹے ہونے پر قسمیں طے کر لی جائیں؟''

''میں نہیں چاہتا اکا جان کہ قسموں وغیرہ کی نوبت آئے اور میں اپنے بابا جان کے دستخط پہچانتا ہوں، یہ پیپر بھی غلط نہیں ہے۔ لیکن میری درخواست ہے کہ فیصلہ ابھی نہ سنایا جائے۔ مجھے کچھ وقت چاہیے سوچنے کے لیے۔''

''کیوں واسع۔ بھئی جب تم خود مان رہے ہو کہ پیپر اصلی ہے، دستخط اصلی ہیں تو پھر فیصلہ بھی ہو جانے دو، جبار بھائی کے سچ سے انکاری ہو کر تم اپنے سفید سر والے چاچا کی توہین کرنا چاہتے ہو۔'' خلیل پھوپھا قدرے جوش سے اُٹھ کھڑے ہوئے تو اکا جان نے سخت ناراضی سے خلیل کو گھورا۔

''وقت مانگنے سے جبار کی کوئی توہین نہیں ہو جاتی، سوچنے کے لیے وقت مانگنا واسع کا حق ہے۔ تم آرام سے سوچ بچار کرو واسع، ہم فیصلہ اگلی مرتبہ میں کریں گے۔'' آخر میں انہوں نے واسع کو مخاطب کرتے بات سمیٹ لی اور جبار احمد طنزیہ مسکراتے اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کہتے ہوں۔

''لے لو اتنا وقت بھی۔ دیکھتے ہیں کیا تیر مار لو گے۔''

''کیا واقعی کاغذ اصلی تھا لالہ؟'' اسفند نے سوالیہ نظروں سے واسع کو دیکھا۔

''ہاں۔ کاغذ صحیح ہے۔'' واسع نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''ویسے بھی جرگے میں چاچا صرف وہی چیز دکھائیں گے، کل کو جس کے سچا ہونے کی قسم کھا سکیں۔''

''لیکن یہ پیپر مستند اور سرکاری نہیں تھا۔'' رئیس نے جیسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

''جرگوں میں جھوٹ اور سچ اہم ہوتے ہیں۔ کاغذ جیسا بھی ہو دستخط اگر بابا کے ہیں تو جرگے کی نظر میں یہی مستند ہے۔'' واسع آج خود کو بھی تسلی دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''لیکن وہ کینگو؟ وہ تو صاف ہیرا پھیری ہے لالہ۔'' اسفند بھی سخت بھنایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

''چاچا نے وہ لکھائی بھی کسی اور سے کٹوائی ہو گی تبھی کہہ رہے تھے قرآن پہ ہاتھ رکھنے کو تیار ہوں۔ وہ ہر بات پہلے سے سوچ بیٹھے ہیں، مجھ سے کہیں زیادہ تیار ہیں وہ لوگ۔'' واسع نے لب بھینچے۔

''تو حبیب چاچا نے کبھی کاغذ کا ذکر کیا تھا گھر پہ؟''

''نہیں۔ کیونکہ تم نے سنا نا جبار چاچا خود ہی بتا رہے تھے کہ حبیب الرحمن اسے بھی ضروری نہیں سمجھ رہا تھا۔ اور وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں کیونکہ میرے بابا بڑے وضع دار تھے کچھ معاملوں میں، ان کے لیے یہ سوچ ہی بڑی ندامت کا باعث بنی ہو گی کہ وہ اپنے بھائی سے کوئی ثبوت مانگیں۔''

''اور گواہ لالہ؟'' اسفند نے یاد دلایا تو واسع نے سر نفی میں ہلایا۔

''گواہ تو کوئی نہیں ہے۔''

''تو پھر؟'' رئیس نے دکھ سے واسع کو دیکھا۔

''تو پھر یہ کہ ہم نے ٹائم کیوں مانگا؟'' واسع نے ہنس کر جملہ پورا کیا لیکن اسفند اور رئیس سنجیدہ ہی رہے۔

''بھئی ہار ہی ماننی ہے تو ذہنی طور پر کچھ تیار تو ہو کر مانیں۔ آج میں مینٹلی بالکل ریڈی نہیں تھا۔'' وہ دستور خود پر ہنس رہا تھا جبکہ اس کی بے بسی پر اسفند اور رئیس کا بری طرح دل کٹ رہا تھا۔

''مایوس نہ ہوں لالہ، اللہ پاک کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیں گے۔ آپ نے ٹائم مانگ کر اچھا ہی کیا۔'' اسفند نے حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی اور واسع مسکراتا ہوا گھر کی طرف بڑھ گیا۔ ذہن آگے کے متعلق بالکل خالی تھا۔ اب کسی ''راستے'' کا کم از کم اسے تو کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

''کچھ دیر تو بیٹھ بھی جاؤ ذکی۔ مجھے بھی جرگے کی کوئی تفصیل بتاؤ، تمہارے بابا کو تو دن رات مہمانوں سے ہی فرصت نہیں۔'' نگار ناشتے سے فراغت پا کر کمرے میں واپس آئیں تو ذکی بھی جانے کے لیے تیار ہوتا نظر آیا۔ اور ماں کی بات سن کر ذکی جانے کس خیال سے ایک دم کھل کر مسکرا دیا۔

''خوش لگ رہے ہو۔'' نگار بھی مسکرا دی۔

''لگتا ہے بات کچھ اپنے حق میں ہوئی ہے۔''

''ایسی ویسی۔'' ذکا خوش گوار موڈ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''اُس وکیل کے بچے کو تو چاروں شانے چت کر دیا ہے۔''

''پھر تو حیرانی کی بات ہے، ہم تو سمجھ رہے تھے، وکالت پڑھ رہا ہے، قانونی طریقے سے واپس مانگے گا۔'' نگار سوچنے لگیں۔

''اِسے کہتے ہیں گیدڑ کی شامت آنا۔'' ذکی نے قہقہہ لگایا۔ ''ویسے تو ہم نے قانونی کاغذ بھی تیار رکھے تھے جو ہم عدالت میں ہی دکھاتے لیکن اس بے وقوف کو اس کی دور کی سوچ لے ڈوبی، بابا تو کل تک سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک سادہ کاغذ ان کے کتنے کام آنے والا ہے۔'' ذکی نے مسکراتے ہوئے مزے لے لے کر ماں کو جرگے کی تفصیل سنا دی۔

''چلو۔ اب گواہ ڈھونڈتا پھرے گا۔'' نگار نے بھی قہقہہ لگایا۔ ''واسع تو اپنے بچھائے جال میں آپ ہی پھنس گیا سمجھو۔''

''سب ہماری محنت کا پھل ہے اماں۔ کتنا پیسہ لگایا ہم نے اس اتنے سے ٹکڑے پر۔ اور یہ لوگ پکے پکائے کو بس لپک کر ہضم کر لینے کی نیت پر تھے، میرے بابا کی محنت تھی جس نے بے کار پڑی زمین کو سونا بنا دیا۔ اور انہیں دیکھیں، رقم لے کر بہنوں کی شادیوں پہ اڑا کر پھر سے حقدار بننے آ گئے۔ حد ہے ڈھٹائی کی اور کیا۔'' ذکی کے لیے واسع کا باغ، واسع کا ڈیرا اب مدت ہوئی اپنا باغ، اپنا ڈیرہ بن چکے تھے، تبھی اس حقیقت سے بھی برسوں ہوئے وہ نظریں پھیر چکا تھا کہ حقدار کون ہے اور غاصب کون۔

''یوں سمجھو، اس کا جرگے کے راستے سے آنا ہمارے لیے اللہ کی مدد تھا۔ میرے بچوں کی چیز انہی کے پاس رہ گئی۔ میرے اللہ تیرا لاکھ شکر ہے۔'' نگار ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کرنے لگی، تبھی دروازہ کھول کر کمرے میں نیلم داخل ہوئی۔

''شبنم کی کال ہے۔'' اس نے موبائل والا ہاتھ آگے کیا۔

''آں۔ بسم اللہ۔'' نگار کا چہرا شبنم کا نام سنتے ہی کھِل اٹھا۔

''سنگے بچے۔ ٹھیک ہو؟''

''ہاں بس فارغ ہی بیٹھی تھی۔ تم سناؤ، آج تو اتنی صبح صبح۔''

''اچھا؟'' نگار کا حیرت اور خوشی سے منہ کھلا۔ وہ بغور شبنم کی بات سن رہی تھیں۔ کچھ دیر اسے آرام اور احتیاط کی ہدایت کرتے پھر مسکرا کر کال کاٹ دی۔

''کیا ہوا۔ سب خیریت؟'' ذکی کو لگا بات تو

کچھ خاص ہی تھی پر اماں چھپا رہی تھیں۔

’’ہاں ہاں سب خیریت ہے۔ یوں سمجھو ہر طرف سے خوشی کی خبریں مل رہی ہیں۔ آج تو مٹھائی بانٹنی چاہیے۔‘‘

’’جرگے کی خوشی تو ابھی ذرا قابو میں ہی رکھیں۔‘‘ ذکی مسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ’’اگلے جرگے میں ذرا اس واسع کو بنا گواہوں کے آ لینے دیں۔ یہ بھی مشران کے منہ سے ذرا اپنی ہار کا باقاعدہ اعلان سن لے پھر مناتے ہیں کھل کر خوشی۔ اسی کے باغ میں گاؤں بھر کی دعوت نہ کی تو ذکی نام نہیں۔‘‘

’’ابھی اور جرگہ باقی ہے؟‘‘ نگار کچھ بدمزہ ہوئیں

’’ہاں نا، وقت مانگا ہے اس مہاسیانے نے۔‘‘ ذکی مضحکہ اُڑاتا باہر نکل گیا اور نیلم نے نہایت دکھ سے اس کی پشت کو گھورا۔

’’شبنم کے ہاں ماشاء اللہ سے خوش خبری ہے۔‘‘ نگار نے مزید صبر نہ کر سکتے فوراً ہی نیلم کو بتا دیا جو اس وقت کچھ چپ چپ اور اُداس سی نظر آ رہی تھی۔ ماں کی بات سنی تو ہلکا سا مسکرا دی۔

’’اللہ جب بندے پر مہربان ہونا۔ سب سیدھے سیدھے ہوتا چلا جاتا ہے۔‘‘ نگار نے بھرپور اعتماد اور غرور سے نیلم کو دیکھا اور وہ بے اختیار ہنس دی۔

’’مہربانی یا ڈھیل؟‘‘

’’کیا بکتی ہو منحوس۔ کبھی تو کچھ اچھا پھوٹ لیا کرو اِس منہ سے۔‘‘ نگار نے تیوری چڑھا کر سخت غصے سے اپنی منہ پھٹ اولاد کو دیکھا جو تاسف سے نفی میں سر ہلاتے بالکل قائل نہ ہوتے وہاں سے اُٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

امتحانوں سے فراغت کے بعد نازنین نے بصد اصرار ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی تھی۔ یہ اسکول گھر سے بس کچھ ہی فاصلے پر تھا، معظمہ بھی یہیں پڑھتی تھی۔ نازنین کے ذہن میں یہاں جاب کرنے کا آئیڈیا پہلے سے تھا لیکن وہ اپنے امتحانوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ گاؤں کے اس چھوٹے اور سادہ سے اسکول میں اس کا جی بھی جلد ہی لگ گیا۔ اب وہ اور معظمہ صبح ایک ساتھ نکلتیں اور واپسی بھی ساتھ ہوتی۔ نغمہ سے اجازت ملنے میں تو کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی کیونکہ وہ بھی اس کی فراغت دیکھتے خوش تھی۔ البتہ سیف اللہ کو بڑی مشکل سے منانا پڑا تھا۔ بہر حال اچھا ہوا کہ آخر وہ مان ہی گیا۔

نازنین کے لیے یہ نوکری اہم بھی بہت تھی۔ شادی شدہ بہن کے گھر نامعلوم مدت تک کے لیے رہنا، اپنی ذات پر ایک بوجھ سہنے کے مترادف تھا۔ معمولی تنخواہ کی نوکری اگرچہ اس کا کوئی بڑا بوجھ نہیں بٹا سکتی تھی لیکن اسے اپنے محسنوں کو ان کے احسان کی قیمت نہیں چکانی تھی۔ بلکہ اپنی محنت کی کمائی سے گاہے بہ گاہے اُن سب کو تحائف وغیرہ دینا اس کے اپنے دلی سکون کا باعث تھا۔ وقت بھی مصروف گزر رہا تھا اور پڑھا لکھا گاؤں کے معصوم بچوں بچیوں کے کام آ رہا تھا۔ یہ بھی کسی خدمت سے کم تو نہیں تھا۔ وہ اِن دنوں بہت خوش اور مطمئن تھی۔

پشمینہ سے اس کے تعلقات واپس آ کر جوں کے توں تھے۔ نازنین نے اس سے اپنے رویے میں کسی قسم کی سرد مہری نہیں آنے دی تھی۔ واپس آ کر وہ یوں ہو گئی جیسے جانے سے پہلے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ موبائل اول روز کی طرح آج بھی چھت پہ رکھا رہتا۔ پشمینہ یوں تو اب کافی محتاط ہو گئی تھی لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ڈیڑھ دو روز کے وقفے سے بالآخر اُٹھا ہی لیتی۔ نازنین نے ٹوکنا اور منع کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر مہینوں سے ان کے ہاں رہتے اس پر بھی کبھی کسی نے روک ٹوک نہیں لگائی تھی۔ بھلے اس نے بھی اس کا موقع نہیں دیا، ہر بات کا کسی کے کہنے سمجھانے سے پہلے خود ہی خیال رکھا۔ نہ کسی سے بلا سوچے سمجھے زیادہ میل جول بڑھایا۔ جتنا یہاں ان لوگوں کا سب سے تھا اس نے کچھ کم ہی رکھا۔ لیکن اس سب کے باوجود بہت سوچنے اور غور کرنے پر بھی

سمجھ آیا کہ ’’یہاں‘‘ اس نے سمجھنا، سننا اور ماننا تو ضرور ہے لیکن سمجھانا، سنانا اور منوانا ہر لحاظ سے غیر اخلاقی ہے کیونکہ وہ ان کی مہمان تھی اور ان کی ممنون احسان بھی۔ بہت چاہنے پر بھی وہ ان کے گھر کی فرد نہیں بن سکتی تھی۔

☆☆☆

گرما کے وسط سے موسم تھوڑا اور آگے کھسک گیا تھا۔ ساون کی بارشیں بس ابھی ابھی گزری تھیں۔ واسع مطمئن تھا اِن دنوں، وکالت نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ گاؤں والوں کا رجحان بھی اپنے مسائل کے لیے عدالتوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کے راستے سے جانے پر اس کی اپنی کامیابی بھی یقینی تھی، لیکن اس راستے میں اپنا پن کہیں بہت پیچھے چھوڑ کر آنا پڑتا ہے، غیریت کا احساس اس کا دل ڈرانے لگتا اور اسے لگتا بابا کی روح شاید اس سے ناخوش ہو جائے، تبھی خاندانی جرگے کے مختصر ترین اجماع میں مصالحت کے راستے سے آنا ہی اس کے دل کی حقیقی تشفی کا باعث تھا۔ اس کے دماغ میں باغ کا حصول بھوت بن کر سوار ہوا ہوتا تو وہ بھی خود غرض اور مطلبی بن کر سوچتا، یہ اور بات کہ انسان کی نیت کو دیکھنے اور سمجھنے والے یہاں بہت کم کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔

عدالت سے واپسی پر وہ پھر پتھریلے رستے سے پیدل آیا تھا، موٹر سائیکل آج بھی ایک خواب تھا اور جس کا پورا ہونا فی الحال مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ اکا جان کے ڈیرے کے باہر سیف لالہ سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے ساتھ لیے اندر ڈیرے میں آ گئے۔ کچھ سنجیدہ سے لگ رہے تھے، واسع کو صاف لگا کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے خود کچھ کہنے کے بجائے اسے اکا جان کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اور وہ بھی واسع کی طرف دیکھتے کچھ متفکر دکھائی دیے جیسے بولنے کے لیے کچھ مناسب سوچ رہے ہوں۔

’’سب خیریت ہے اکا جان؟‘‘

’’ہاں۔ وہ بیٹھو۔‘‘ وہ عجب مخمصے میں لگ رہے تھے۔ واسع کو پریشانی ہونے لگی، خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

’’جی؟‘‘

’’واسع وہ جرگے کا معاملہ۔ باغ کے لیے۔‘‘

’’جی جی......‘‘

’’تم نے وقت مانگا تھا سوچنے کے لیے۔ تو......؟‘‘ وہ کہتے کہتے جھجک کر رُک گئے۔

’’وہ تو جوں کا توں ہے، سوچنے پر بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔‘‘ واسع کے اعصاب بھی ایک دم ڈھیلے ہوئے، جس موضوع پر وہ اب سوچنے سے بھی گریز کیا کرتا تھا، پھر سے چھیڑ دیا گیا تھا۔

’’جبار نے کہا ہے کہ جرگے کو دوبارہ اکٹھا کریں، واسع گواہ پیش نہیں کر سکتا تو جلد از جلد معاملے کو نمٹائیں۔‘‘

’’دراصل اس نے اسی جمعرات کو جرگہ بلایا ہے۔‘‘ اکا جان نے مزید واضح کیا، واسع نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

’’چاچا جی جیسا کہہ رہے ہیں آپ کیجیے۔‘‘ وہ جواب دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سوچنے کو واقعی کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ یعنی اب تین روز بعد بلایا جانے والا جرگہ دس برسوں سے گومگو میں لٹکے ایک اہم ترین معاملے کو بالآخر ایک تکلیف دہ انجام سے دوچار کرتے ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے چھین لے جانے والا تھا۔ باغ اب سدا کے لیے جبار چاچا کا ہو جائے گا، جس کے بعد اس کے لیے دوبارہ اسے پانے کی ہر راہ بند ہو جائے گی۔ اب شاید عمر بھر اسے خود اپنے گھر والوں سے بھی طعنے سنتے گزار دینی تھی کہ پھر کیا ہوا اس کی زندگی کا وہ مقصد، کیا ہوئی اس کی وکالت کی ڈگری۔ اور کیا خاک وہ اپنی پڑھائی سے کسی اور کو فائدہ دے پائے گا جو اس سے خود کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔

☆☆☆

رباب نے بڑے دنوں بعد ایک طرح سے

آج اپنی انا مار کر نصیر سے یونہی حال احوال کا میسج کیا تھا۔ موبائل رابطے کے معاملے میں وہ واقعی انتہا کا سست نکلا تھا۔ اور اب تو کچھ اس کا بدلا رویہ بھی۔ لیکن رباب پر ایک بات ضرور واضح ہو گئی کہ وہ دن رات صبح شام کے مسلسل رابطوں سے فطرتاً تنگ اور بے زار ہے اور پھر اس نے ہی یہ سوچ کر مصلحتاً سمجھوتہ کرلیا کہ بجائے لڑنے جھگڑنے کے وہ ہی اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرلے۔ اور یوں تو ان کے تعلق کو ہی بڑی بری نظر لگ چکی تھی، اب نہ وہ باتیں رہی تھیں نہ وہ بے تابی، رباب کا دل گہرائی میں سوچتے چلے جانے پر ڈوبنے سا لگتا، اور اسے محسوس ہوتا اگر کچھ دیر مزید وہ اسی طرح سوچتی رہی تو اس کا دم گھٹنے لگے گا۔ بمشکل خود کو پرانی یادوں اور پرانے دنوں کے اثر سے نکال کر موجودہ حالات سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ کرتی۔

موبائل کی آواز پر وہ چونک کے خیالات سے باہر آئی۔ نصیر کو میسج بھیجے کچھ دس بارہ منٹ ہو چکے تھے، غالباً اسی کا جواب آیا تھا۔ رباب نے موبائل ہاتھ میں لیا، نصیر نے لکھا تھا کہ وہ ایک دو روز میں گھر کا چکر لگائے گا۔ رباب کو حیرت ہوئی کہ ویک اینڈ تو ابھی دور ہے اور نصیر ایک دو روز میں آنے کی بات کر رہا ہے، اسے یاد آیا کہ دو روز بعد تو جرگہ بلایا جانا ہے۔ شاید وہ اسی سلسلے میں آرہا ہو، اس نے میسج لکھ کر نصیر سے پوچھ بھی لیا اور اس کا میسج پڑھتے ہی نصیر کی جواباً کال آگئی۔

"کون سا جرگہ رباب۔ کس معاملے پر؟" وہ واقعی بے خبر تھا شاید اس کے گھر والوں نے جان بوجھ کر اسے بے خبر رکھا تھا۔

"جبار چاچا سے لالہ نے وقت مانگا تھا نا۔ تو جبار چاچا اب کہہ رہے ہیں کہ اگر گواہ اور ثبوت کوئی نہیں ہے تو فیصلہ کریں۔"

"اوہ اچھا۔ تو پھر؟"

"ہم بہت پریشان ہیں نصیر۔ لالہ کہتے ہیں دو روز بعد باغ ہمیشہ کے لیے ان کا ہو جائے گا، بس ابھی سے ذہن بنالو۔" رباب کی دُکھی پریشان آواز سے نصیر کے دل کو بری طرح چوٹ پہنچی، وہ لوگ یقیناً ان دنوں بڑی مشکل صورت حال سے گزر رہے تھے، اور بظاہر تو اس مسئلے کا نہ کوئی حل تھا نہ بہتری کی کوئی اُمید۔ دل اُس لمحے اپنی بے خبری اور بے حسی پر بری طرح نادم ہوا۔

"واسع کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں، کہیں باہر گئے ہیں۔"

"میں نے آنا تو جمعے کو تھا لیکن جرگے کی وجہ سے جمعرات کو چلا آتا ہوں۔" نصیر نے کچھ دیر سوچ کر اپنا فیصلہ سنایا تو رباب کا دل ایک جذب سے دھڑکا، نصیر کے لہجے سے سے پرانے دنوں والی اپنائیت کا جھلکنا بے یقینی کا باعث بنا تھا۔

"سچ نصیر۔ تم آؤ گے لالہ کے لیے؟" رباب کی بے ساختہ پلکیں نم ہوئیں، وہ دن یاد آنے لگے جب نصیر ہی اس کے بھائی کا سب سے بھروسے مند مضبوط سہارا ہوا کرتا تھا۔ نصیر کے دل پر چند ہی جملوں سے پڑنے والی یہ ہلکی سی دستک اس کے لیے بہت بڑا جذباتی سہارا تھی۔

"ہاں بھئی آؤں گا۔ کہہ تو رہا ہوں۔"

"شکریہ نصیر! تم آجاؤ تو لالہ کو بہت حوصلہ ملے گا۔" اس نے اپنے گلوگیر لہجے کی نمی پر قابو پاتے بمشکل کہا۔

"شکریہ کیسا پاگل لڑکی۔" وہ بے ساختہ بڑی محبت سے بول تو گیا لیکن "پاگل لڑکی" کہتے نجانے کیوں زبان اٹک سی گئی تھی۔ دل پر بڑی شدت کی چوٹ پڑی۔ نصیر نے لب بھینچ کر سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ وقت کتنا بدل گیا تھا، دھیان کو زبردستی بدلنے کی کوشش کی تھی اور اب الفاظ بھی ساتھ دینے سے انکاری ہو گئے تھے۔ رباب اس کے لیے کیا تھی اور اُس نے ذاتی کوشش سے آج خود کو کہاں لا کھڑا کیا تھا۔ آج واسع کی پریشانی کا سن کر رہ نہیں پایا تو لگا سب کچھ تو آج بھی وہیں اپنی جگہ پر ہے اور سختی کا یہ خول بس ایک پھونک سے چٹخ کر ٹوٹنے کو بے تاب

ہے۔ مدت ہوئی وہ تو رباب کی آواز سننے سے بھی خود کو باز رکھنے لگا تھا۔

"کاش میں اس کے لیے کچھ کر بھی پاتا۔" وہ آہستہ سے بس یہی کہہ پایا۔

"کوئی بات نہیں نصیر۔ دولت کا لالچ تو بابا نے ہماری گھٹی میں ڈالا ہی نہیں تھا، ہمیں جو حاصل ہے ہم نے ہمیشہ اسی کو اپنا کل جہان سمجھا۔ بھوک صرف محبت کی ہے، وہ خوراک نہ ملے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"اچھا میں جمعرات کو آتا ہوں۔" نصیر سے اب ایک بھی لفظ مزید سننا محال تھا۔ رباب کی دھیمی آواز سارے عہد توڑنے پر مجبور کر رہی تھی اور اسے بہت کچھ یاد رکھنا تھا جو نہایت چپکے سے ان کے بیچ آچکا تھا۔ کچھ ایسا جس کے متعلق وہ رباب سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک گہرا سانس لیتے اس نے کال آف کر دی اور رباب حسرت سے اُن آدھی ادھوری باتوں کو سوچتی رہ گئی۔ نصیر اپنے اور اُس کے موضوع پر بات کرنے سے آج بھی کنی کترا گیا تھا۔

☆☆☆

"تم سچ کہہ رہے ہو رئیس؟" پشمینہ کو سن کر یقین ہی نہیں ہوا، اتنے ہفتوں کی محنت کیا واقعی رنگ لے آئی تھی، پشمینہ کی مارے خوشی کے پلکیں نم ہو گئیں۔ رئیس نے بات شروع کرتے ہی اسے خوش خبری سنائی تھی کہ پچھلے دو روز میں اس نے ایک بھی سگریٹ نہیں پیا تھا، اور یہ وہی رئیس تھا جو چوبیس گھنٹوں کے دوران دس سے بارہ سگریٹ لازمی پیتا تھا۔ لیکن پشمینہ روزانہ کے معمول میں ایک ایک کر کے کمی لاتے اب تین سگریٹ تک لے آئی تھی، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ آج اُلٹا وہ اسے بتا رہا تھا کہ دو روز سے اس نے سگریٹ بالکل ہی ترک کر دی تھی۔

"اور یہ ہوا کیسے۔ مجھے سچی یقین نہیں آرہا رئیس۔"

"ہاں بھئی تم بھی اپنی جگہ صحیح ہو۔" وہ ہنس رہا تھا۔ "تو سنو۔ ہوا یہ کہ پرسوں رات کو سگریٹ کی ڈبیا ختم ہو گئی۔ اگلی صبح نئی لینا تھی لیکن جب اگلی صبح دس بجے کے قریب گھر سے نکلا تو بٹوہ گھر ہی بھول گیا۔ دوپہر کو واپسی ہوئی تو بابا نے ڈیرے پر بلا لیا، کچھ مہمان آئے تھے۔ اُن کی خاطر داری میں شام ہو گئی، اندر سے بے چینی تو کچھ کچھ لگی ہوئی تھی لیکن سوچا رات کو نکلوں گا۔ اور رات آئی تو یونہی رُک کر سوچا کہ جہاں اتنا لمبا دن گزر گیا ہے تو یہ ایک رات بھی یونہی گزار لوں، سچ تو یہ ہے کہ اپنا اسٹیمنا چیک کرنے کو دل چاہا، تو بس جیسے تیسے سو گیا اور آج کا دن تو جان بوجھ کر خود کو مصروف رکھا۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" پشمینہ نے بے ساختہ کلمہ شکر ادا کیا۔ "پتا ہے رئیس، میں نے بھی اب سے پہلے اس لیے وعدہ نہیں لیا کہ کسی کو مجبور کرنے سے عجیب سا ڈر لگتا ہے، میں چاہتی تھی یہ خواہش تمہارے اندر سے جاگے اور آج یہ ہماری پہلی کامیابی ہے۔ تو اس خوشی میں وعدہ کرو کہ خود کو اب روکے ہی رکھو گے۔"

"اور...... ہماری دوسری کامیابی کیا ہو گی؟"

رئیس کی سوچیں جیسے اس ایک جملے پہ رُکی تھیں۔ پشمینہ نے خود بھی اسی وقت اپنے جملے پر غور کیا، وہ واقعی بے خیالی میں ایسا بول گئی تھی۔ لب بھینچ کر خود کو جواب دینے سے باز رکھا۔

"میں بتاؤں؟" رئیس نے مسکرا کر اجازت چاہی

"مطلب؟" وہ کچھ نروس سی ہو گئی۔

"بتاتا ہوں، لیکن تم بھی پرامس کرو کہ پھر ہماری تیسری اور اصل کامیابی کی دعا بھی تم ضرور کرو گی۔"

"پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو۔" وہ واقعی ناسمجھی کی کیفیت میں تھی۔

"کوئٹہ میں ایک جگہ نوکری کی امید پیدا ہوئی ہے، اگلے ہفتے جانا ہے، بلکہ یوں سمجھو جوائن کرنا ہے۔ کیونکہ سی وی انہیں پسند آئی ہے، اب بس ملنا چاہتے ہیں۔"

"جاب کیا ہے؟"

پائی، تو ذکی کے پاس ابھی کوئی حل موجود تھا۔

”کیا؟“

”اگر تم مجھے یہ بتادو کہ واسع کو کون پسند ہے تو میرے لیے آگے بڑھنا ذرا آسان ہو جائے گا۔ یوں تو یاد رکھو کہ جب بھی اس موضوع پر ہماری بات ہوتی۔ یہیں اسی مقام پہ آکر رُک جائے گی اور ایک دن میرے بابا بنا میری مرضی کا لحاظ کیے پھوپھی کو حامی بھی بھر لیں گے۔“

”تو اِس سے کیا ہوگا؟“ رباب ایک بار پھر الجھ گئی، بلکہ کسی حد تک ذکی طرف سے مشکوک اور بدگمان بھی۔

”واسع کی پسند جان کر میرے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا، ہوسکتا ہے کوئی اور راستہ نکل آئے، جیسے ممکن ہے جسے وہ پسند کرتا ہے، وہ اسے نہ چاہتی ہو اور......“

”ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔“ رباب نے فوراً بات کاٹی۔ ”وہ تو بہت کم کبھی ہمارے گھر آتی ہے۔“

”کون؟“ ذکی چونکا۔

”وہ......وہ......“ رباب نے تھوک نگلتے بس لحظے کو سوچا کہ شاید اسے ذکی کو یہ بات نہیں بتانی چاہیے لیکن اگلے ہی پل کوئی راہ نہ پاتے بتانے کا فیصلہ بھی کرلیا۔ ”نن......نازنین......“

”نازنین۔“ ذکی کی چھٹی حِس اسی دن سے کچھ ایسے ہی اشارے دے رہی تھی کہ اگر واسع کو زمرد نہیں پسند تو بھلا پھر کون۔ اور رہ رہ کر اسے اس روز باغ کے باہر والی بات یاد آجاتی۔ پھر ان کے گھروں کا ایک دوسرے کے اتنا قریب ہونا، حتیٰ کہ درمیانی راستے بھی۔ تو مطلب وہ بالکل صحیح سوچ رہا تھا۔ آنکھیں چھوٹی کر کے اس نے رباب کو ٹریپ میں لینے کے لیے جملے ترتیب دیے۔ اگرچہ اپنی دلی کیفیت اس لمحے آندھی طوفانوں سے ٹکرا چکی تھی لیکن اسے اپنے حواسوں میں رہ کر بات آگے بڑھانا تھی۔

”نازنین......وہ نغمہ بھابی کی بہن۔ اوہ۔ لیکن اس کے متعلق تو......“ ذکی نے جان بوجھ کر جملہ روکا جیسے بے ساختہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا ہو۔

”اس کے متعلق۔ کیا؟“

”تم یقین نہیں کروگی رباب۔“ ذکی نے لہجہ سنجیدہ کیا۔ ”دراصل شبنم کی شادی میں مجھے وہ بہت اچھی لگی تو میں نے اماں سے اس کے رشتے کی بات کی۔“

”تمہیں نازنین۔“ رباب حیران ہی نہیں دنگ رہ گئی تھی۔ ذہن ایک ساتھ کئی اطراف میں دوڑا۔ ذکی کا بیان کوئی سازش نہ ہو، واسع کے خلاف کوئی چال۔

”ذکی تم کہیں واسع کی ضد میں تو نہیں۔“ رباب کی آنکھیں خوف سے پھیلنے لگیں۔

”واللہ بخدا۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ کوئی بھی الزام لگا لو رباب لیکن مجھے اتنا نیچ مت سمجھو۔“ ذکی تڑپ ہی اُٹھا۔ ”اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں تمہارے ساتھ اپنا یہ راز شیئر ہی نہ کرتا۔ معاملہ صرف اور صرف میری محبت کا ہے۔“

”سوری ذکی، بس میں ذرا زیادہ پریشان ہوگئی۔“ رباب کو اپنی صاف گوئی پر شرمندگی سی ہوئی۔ دماغ ہی بالکل ماؤف ہونے لگا تھا۔ نجانے یہ معاملہ کہاں جانے والا تھا۔ اُسے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

”ابھی تم نے کہا رباب کہ نازنین کو واسع میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ ذکی کے لیے اصل بات جان کر آگے بڑھنا اب واقعی آسان ہوگیا تھا۔ اور وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ رباب کی عقل ہرگز اس موقع پر کام نہیں کررہی۔ اس لیے بہت سوچ سمجھ کر اب اسے ہی معاملہ اپنے حق میں کرنا تھا۔

”ہاں مجھے تو کبھی ایسا نہیں لگا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ لالہ نے اماں سے رشتہ مانگنے کو کہا ہے۔

”ہوں۔ ذکی نے ایک مصنوعی آہ بھری۔

”مطلب پھوپھی کو انکار کرنے کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہمارے انکار کے بعد نصیرا اگر آپ

لوگوں کی طرف بدلئی کی بات کرے تو واسع ہی نہیں مانے گا۔“

”اماں اس سے بات کرلیں گی۔“ رباب کا لہجہ شکست خوردہ سا تھا کہ بات تو ذکی ٹھیک کررہا تھا۔

”اور وہ پھر بھی نہ مانا رباب تو......اسے تو تمہارے اور نصیر کے متعلق پتا بھی نہیں ہوگا۔ ہے نا؟“

”ہوں۔“ رباب کا اقرار بھی ہار ماننے جیسا تھا۔

”لیکن میں تو جانتا ہوں نا رباب اور میں بھی تمہارا بھائی ہی ہوں۔ اگر تم چاہو تو میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے اور یہ ایسا پلان ہے کہ اگر پورا ہوگیا تو تمہاری اور نصیر کی شادی یقینی ہے۔ ذکی نے اس مرتبہ پورے اعتماد سے محبت بھرے لہجے میں رباب کو یقین دلایا اور ذکی کی بات سن کر جس کا دل پورا ڈوب کر اُبھرا تھا۔ جواباً وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔

”اگر میں کسی طرح ایک بار نازنین سے مل پاؤں تو اُس سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا اور اس کے خیالات جان کر رشتہ بھی مانگ لوں گا۔ ایک بار میرا نازنین سے رشتہ ہوگیا تو واسع کے لیے سوائے زمرد سے شادی کرنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہے گا۔“

”لیکن......“ رباب کا گلا کانٹوں سے پُر ہوگیا۔ یہ ذکی کیا کہہ رہا تھا۔ یہ کوئی پرفریب خواب تھا یا کوئی کڑوی کسیلی حقیقت۔ وہ واسع کے دل پہ پاؤں رکھ کر نصیر سے شادی۔ رباب کا سر شرمساری سے نفی میں ہلنے لگا۔ بھلا وہ اپنے لالہ کے ساتھ ایسا دھوکا۔

”اگر تم ہاں کردو رباب تو میں آج ہی گلشن پھوپھی کو انکار کردیتا ہوں۔ پھر تم خود دیکھو گی کہ حالات کیسے ہر گزرتے دن کے ساتھ تمہارے حق میں ہوتے جائیں گے۔ خود ہی سوچو بھلا تمہاری اور نصیر کی برسوں پرانی محبت کا واسع کی یک طرفہ پسندیدگی سے کیا مقابلہ ہے۔“

”چپ ہو جاؤ ذکی، خدا کے لیے۔“ رباب چیخ ہی پڑی۔ ”میں اپنے لالہ کو دھوکا نہیں دے سکتی، بس کرو تم۔“ اس نے اپنی درد بھری سسکی کا گلا گھونٹتے موبائل بند کر کے دور پٹخا۔ سر درد سے پھٹا جارہا تھا۔ بال ہاتھوں میں جکڑے وہ وہیں بیٹھ گئی، اس کے لیے اب ذکی کا ایک بھی جملہ برداشت کرنا محال تھا۔ لیکن یہ اس کی بھول تھی کہ موبائل دور پھینک دینے سے وہ ذکی اور اس کے ارادوں کی حد سے پرے ہوگئی تھی۔ انجانے میں وہ واسع کے جس راز کو ذکی کے حوالے کر بیٹھی تھی، وہ اب بھاگنے کی ہر راہ کو اس پر مسدود کرنے والا تھا۔ رباب نہیں جانتی تھی اُسے لوٹ کر ایک مرتبہ پھر یہیں آنا ہے۔

☆☆☆

وہ لوگ اذانوں کے وقت کوئٹہ پہنچے تھے۔ فوری طور چاچی کو ایمرجنسی ہی لے گئے، وہاں کچھ گھنٹہ بھر کی ٹریٹ منٹ کے بعد انہیں فارغ کردیا گیا اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے نو بجے او پی ڈی پر ایک دوسرے ڈاکٹر سے چیک اپ کرانے کا کہا اور یہ وہی ڈاکٹر تھے جس کے متعلق مجیب چاچا کے دوست نے بتایا تھا۔ چھ بجے واسع ان سب کو اپنے ایک دوست کے ہاں لے آیا۔ یہاں انہوں نے کچھ دیر ریسٹ بھی کیا اور ناشتہ بھی۔ چاچی کے درد میں بھی اب افاقہ تھا۔ واسع نے اپنے دوست کو پہلے ہی اپنی آمد کے متعلق بتا دیا تھا۔

نو بجے وہ رئیس اور ڈرائیور کے ساتھ دوبارہ چاچی کو ہاسپٹل لے آیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب شام کو اپنے پرائیویٹ کلینک میں بھی بیٹھتے تھے۔ امکان یہی تھا کہ دن کے چیک اپ کے بعد باقی کا وقت ٹیسٹ وغیرہ میں گزر جائے گا اور شام کو ٹیسٹ کی رپورٹ انہیں کلینک میں دکھا کر چاچی کی دوائی وغیرہ لے کر مسلم باغ کے لیے واپس نکل جائیں گے۔

پرچی بنوا کر وہ تینوں ڈاکٹر کے کمرے کے باہر آئے تو یہاں کافی رش لگا تھا۔ نجانے ہسپتالوں میں ایسی بے ہنگم صورت حال سے نمٹنے کا کوئی حل کیوں نہیں نکالا جاتا تھا۔ او پی ڈی پر ایسی افراتفری کا

ریحانہ چودھری

راضی برضا

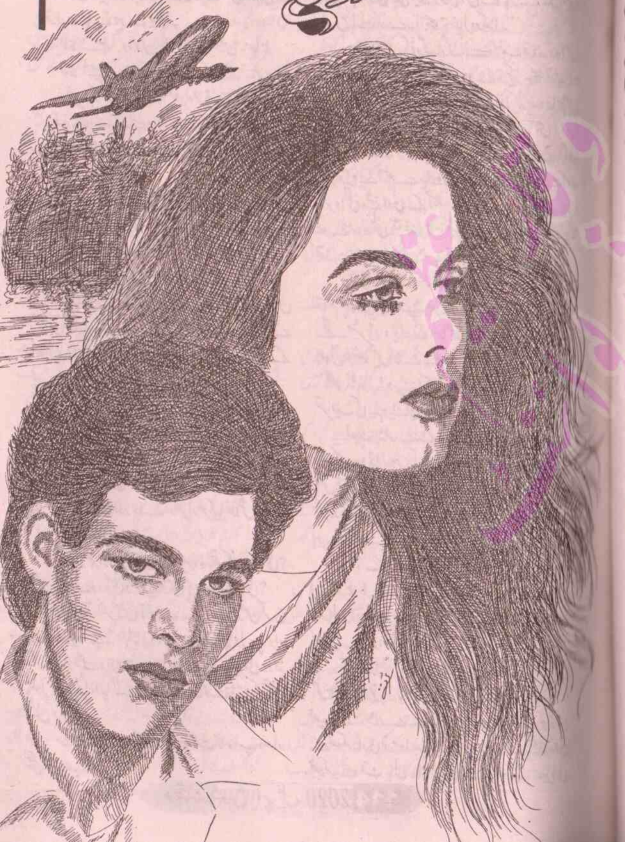

عالم اب تو جیسے معمول بن چکا تھا۔ ایک تھکا دینے والے انتظار کے بعد اب وہ دروازے کے نزدیک آچکے تھے اور اگلی باری ان ہی کی تھی۔

"لالہ آپ پیچھے نکل جائیں۔ اماں کو میں خود اندر لے جاؤں گا۔ زیادہ لوگوں کو شاید جانے نہ دیں۔" رئیس نے مڑ کر واسع سے کہا تو وہ سر ہلاتے پیچھے ہٹنے لگا۔ بہت سے قدم اُلٹے چلتے اب وہ رش سے تقریباً باہر نکل آیا تھا۔ پلٹ کر سیدھا ہوتے ایک گہری سانس لی، بازوؤں کو کھول کر ڈھیلا کیا لیکن بے دھیانی میں ہاتھ کسی سے ٹکرا گیا

"اوہ سوری۔" وہ معذرت کرتے فوراً کچھ فاصلے پر ہوا، انجانے میں اس کا ہاتھ کسی خاتون سے ٹچ ہوا تھا۔ اس احساس سے واسع کا افسوس دوچند ہوا۔ وہ ایک برقع پوش عورت تھی۔ سفید ٹوپی والے برقع میں آنکھوں والی جگہ پر کروشیے کی جالی بنی تھی۔ جالی سے جھانکتی دو روشن آنکھوں نے واسع کو دیکھا اور دیکھنے کے بعد وہ عورت ایسی حواس باختہ ہوئی کہ منہ پہ ہاتھ رکھ کے فوراً وہاں سے بھاگی، انداز ایسا تھا جیسے کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہو اور بھاگتے ہوئے بھی پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتے وہ طوفانی انداز میں لوگوں کی بھیڑ کو چیرتی باہر نکل رہی تھی۔ واسع کچھ نہ سمجھتے ہوئے تعجب سے اس عورت کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ دماغ اس مختصر مدت میں زیادہ تو نہیں سوچ پایا البتہ اُسے یہ خدشہ گزرا کہ عورت کسی مذموم ارادے سے وہاں موجود تھی اور اس سے ٹکرانے کی وجہ سے بال بال کسی خطرے سے بچی تھی۔ کہیں وہ کوئی دہشت گرد تو نہیں تھی۔ اور اس نے اپنے جسم کے ساتھ کچھ باندھ تو نہیں رکھا تھا؟ اور اس کا اندھا دھند بھاگنا۔ واسع نے اس کو ہسپتال کے مین ڈور سے باہر نکلتے دیکھا تو اس بار خود بھی سرپٹ اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اب وہ اس مشکوک عورت کو یونہی ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا تھا۔ دروازے سے باہر آکر واسع نے دیکھا، سفید برقعے والی عورت نے آتشی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے جو اس کی کلائیوں اور پائنچوں سے جھلکتے تھے۔ دور بھاگتی عورت کو آتشی جھلک سے پہچان کر وہ اور تیزی سے ادھر کو لپکا۔ عورت ابھی بھی گھبرا کر بھاگ رہی تھی۔ اب اس کا رُخ پارکنگ ایریا کی طرف تھا۔ اور جب تک واسع وہاں تک پہنچا وہ ایک آدمی کو بازو سے کھینچے ہاسپٹل کی عمارت سے باہر نکل چکی تھی۔ آدمی کی چونکہ واسع کی طرف پشت تھی اسے بس علاقائی ٹوپی والا اونچا لمبا مرد سمجھ میں آیا۔ شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہاسپٹل سے نکل کر وہ دونوں ایک ویران سڑک پر دوڑ رہے تھے۔

"رُک جاؤ۔" واسع نے اونچی آواز میں پکارا۔ ان کا آپس کا فاصلہ قریب پینتیس چالیس فٹ ابھی بھی تھا۔ واسع چند قدم دوڑ کر آگے آیا تبھی سائیڈ والے روڈ سے تین چار آدمی نکل کر اس سڑک پر آئے۔

"اے۔ ان دونوں کو پکڑو۔" واسع نے ہاتھ لہرا کر ان آدمیوں سے مدد مانگی تو انہوں نے بھی بلا سوچے سمجھے اس مرد کو دبوچ لیا۔ عورت نے زور سے چیخ ماری۔ کچھ دیر رُک کر پریشانی سے کچھ سوچا، پھر پلٹ کر پیچھے کو آئی

"واسع۔ خدا کے لیے روکو انہیں۔"

"کون؟" واسع اپنا نام سُن کر بری طرح چونکا۔ عورت اس کا نام لے رہی تھی۔ یعنی وہ اسے جانتی تھی اور شاید اسی لیے بھاگ رہی تھی۔ وہ پہچاننے کی کوشش میں تھا جب وہ آدمی اس مرد کو پکڑ کر قریب لے آئے۔ ایک آدمی نے چیک والا رومال اس کی ناک سے ہٹایا اور اب اس کا چہرہ مکمل واسع کے سامنے تھا اور جسے دیکھتے ہی واسع بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا اور اسی تعجب بھری نگاہ سے اس نے اب کی بار اس عورت کو دیکھا۔

"تت تم......"

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

”ویسے اک گل تے منی پے گی بشارے! تیری بیوی ہے تو بانجھ، مگر اس کا ہاتھ بہت ہی ہلکا ہے۔“

خالہ ایمنہ، گھر کے صحن میں بنی ہوئی کیاری سے ٹماٹر توڑتی نصیبہ کو دیکھتے ہوئے بہت عقل مندی کے تاثرات سجاتے ہوئے بولی۔

لفظ کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا
لفظ سہنے والے کمال کرتے ہیں

نصیبہ کو کبھی پڑھا ہوا شعر، حرف حرف اب سمجھ میں آ رہا تھا ــــ کہنے والی نصیبہ کی سگی خالہ تھی۔ اس نے تنقید کی تھی یا تعریف۔ اسے یہ تو سمجھ میں نہیں آیا مگر......!

اسے محسوس ہوا کہ گویا فضا میں سے آکسیجن یک لخت ختم ہو گئی ہو؟

فضا زہر آلود ہو گئی ہو۔

تاریکی! ایک گہری تاریکی یکا یک۔

کیاری میں لگے پودوں سے ٹماٹر توڑتی۔ اس گندمی لیکن صاف رنگت، دلکش کھڑے کھڑے نقوش، غلافی آنکھوں والی۔ خوب صورت لڑکی کے چہرے پہ اپنا آنچل ڈال چکی تھی۔

پرندے اڑانیں بھول کر کشادہ صحن میں لگے پیڑوں پہ گویا گر سے گئے۔

تتلیاں اڑتے ہوئے پھولوں پہ ڈھیر ہو گئیں۔ سرما کی ٹھنڈی، میٹھی، سنہری دھوپ کے مزے لیتی مانو بلی ہڑبڑا کے اٹھی اور جانے ادھر ادھر کیا تلاش کرنے لگی؟

نصیبہ شہزادی تو نہیں تھی، پھر وہ پتھر کیوں ہو گئی؟ ابھی ہر طرف روپہلی دھوپ پھیلی تھی، وہ کہاں گئی؟ بادل تو نظر نہیں آ رہے۔ مگر ان کی گھن گرج بہت شدید ہے۔ بجلیاں اس کے خرمن دل پہ وار کرنے کو لپک رہی ہیں۔ اس کی پشت پہ لہراتی دراز بالوں کی چٹیا، اچانک ناگن بن کے اسے ڈس کر نیل و نیل کر گئی تھی۔

ساری کائنات ایک منتظر ساعت کا روپ دھار چکی تھی جب!

”خالہ! میری بیوی اول تو بانجھ نہیں ہے۔ یہ بات ذہن نشین کر لو اور پھر وہ جیسی بھی ہے میرے دل اور میرے گھر کی ملکہ ہے اور مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اس کی راجدھانی میں بیٹھ کر کوئی اس کے بارے میں اس طرح بات کرے۔ آئندہ خیال رکھنا۔“

بشارا! اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ اس کا ٹھٹکا ہوا ہاتھ اور اسے پتھر ہوئے دیکھ چکا تھا۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ عام سی شکل و صورت کا درمیانے درجے کا کسان ہی، اس ایک جملے کے زہریلے جادو سے پتھر ہونے والی شہزادی کے جسم سے جادو کی سوئیاں نکال سکتا ہے اور پھر واقعی، شہزادی کے جسم میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے، وہ پلٹی، تو فضا میں تتلیوں کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ پرندے اڑانیں بھرنے لگے۔

شمالی دیوار کے ساتھ بنی کیاری میں لگے ہوئے تمام پودوں کے پتے سرشاری سے تالیاں بجانے لگے۔ مشرقی دیوار کے ساتھ بنی کیاری میں لگے، پھول خوشبوئیں لٹانے لگے۔

”خالہ! ویسے ایک بات تو بتا، تو نے میری تعریف کی ہے یا برائی؟“

نصیبہ بشارے کے ایک جملے سے ہی سرشار ہو چکی تھی وہ ٹماٹروں کی ٹوکری لے کر خالہ ایمنہ کے پاس آتے ہوئے بولی۔ مگر خالہ نے اسے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور بشارے کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔

”آئے ہائے! میں نے کوئی غلط گل تو نہیں کی اب دیکھ! تیرے ویاں (شادی) کو دس ورے (سال) ہو چکے پر نہ دھی نہ پتر نہ ہوئے نہ کوئی آس تو پھر نصیبہ بانجھ ہوئی کہ نہ ہوئی۔“

”خالہ! تو ہو گئی ہے بڈھی تیرا دماغ کام نہیں کرتا اور پھر تو بار بار بانجھ کہہ کس کو رہی ہے مجھے یا نصیبہ کو؟“ بشارے نے پاس پڑے موڑھے کو زور سے ٹھوکر ماری تو موڑھا غصے کی شدت سے لگنے والی ٹھوکر سے فٹ بال بنا ثریا بی بی جو گھر کے بیرونی

دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی اس کی ٹانگ پہ پورے زور سے لگا تو وہ اس ناگہانی افتاد سے دہل کر شور مچانے لگی۔

”ہائے ہائے بشارے! تیرا ککھ نہ جائے (کچھ نہ بگڑے) مار دتہ ای مینوں وے ظالما!“

وہ وہیں ٹانگ پکڑ کر یا جانے سر پکڑ کر بیٹھی، کیونکہ بیٹھتے وقت تو ہاتھ ٹانگ پر تھا مگر جب بیٹھ گئی تو دونوں ہاتھ سر پر پہنچ چکے تھے اور دہائیاں دے رہی تھی۔

”او، اماں! تجھے بھی اسی وقت آنا تھا؟“ بشارا بوکھلا گیا۔

”بشارے! تیرا کیا مطلب ہے؟ کیا تو نے اپنی ماں کے آنے جانے کا ٹیم ٹیبل بنایا ہوا ہے۔“

نازو بشارے کی بھابھی ارم کے ساتھ اماں کے پیچھے ہی گھر میں داخل ہوتے ہوئے مصنوعی حیرانی سے بولی تو بشارا گویا چیخ ہی پڑا۔

”تم سے مطلب، میری اماں اور میرا معاملہ ہے۔ تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی۔“

”ارے واہ بشارے! تم بھول گئے ہو، تمہاری اماں میری سگی خالہ ہے۔ میں اس پر یہ ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔“ نازو ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔

”آئی وڈی خالہ کی بھانجی، اپنے کم سے کم رکھ (کام سے کام)۔“ وہ اپنی اماں کو اٹھاتے ہوئے بولا۔

”ہائے بشارے! اتنا ظالم تو تو کبھی نہیں تھا یہ ضرور نصیبہ نے تجھے تعویذ پلائے ہیں۔ جو تو خالہ کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے۔“ نازو اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

بشارے نے اماں کو پکڑ کر خالہ ایمنہ کے پاس دھوپ میں پڑی ہوئی چارپائی پہ بٹھایا اور سیدھا ہو کے نازو کی طرف منہ کر بولا۔

”نازو! تجھے نہیں پتا، نصیبہ تو میرے نصیب کا وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ جس کے میری زندگی میں آنے سے میری دنیا کے تمام اندھیرے مٹ گئے ہیں۔ جھلیے! اسے تعویذ کرنے یا پلانے کی کیا ضرورت؟ میں تو اس کا ویسے ہی غلام ہوں غلام......“ وہ ایک جذب کے عالم میں بول رہا تھا اور نازو تو اپنا کھلا منہ بند کرنا بھی بھول گئی۔

”اب منہ تو بند کر لو نازو، کہیں مکھی ہی نہ منہ میں چلی جائے۔“ نصیبہ مسکرا کے بولی تو نازو کو تو گویا آگ ہی لگ گئی۔

”دیکھ اماں! اور خالہ! تو بھی دیکھ، ان لیلیٰ مجنوں کو کسی آئے گئے کی بھی کچھ خبر نہیں۔ اس کے گن گا رہا ہے جس میں ایک بھی گن نہیں۔“

”ارے نازو! مخول کر رہے ہیں۔ تو بھی برا نہ منا اور نصیبہ جا ان کے لیے کوئی چائے پانی کا بندوبست کر۔“

ثریا نے پہلے نازو کو دلاسا دیا اور پھر نصیبہ سے چائے لانے کو کہا تو وہ بھی سب پہ ایک سلگتی ہوئی نظر ڈال کر کچن میں چلی گئی۔

”ثریا! بہت چھوٹ دے رکھی ہے تو نے نصیبہ کو، نہ آئے گئے کی تمیز نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ عقل نہ شکل، ہونہہ......“ ایمنہ بی بی نے دل کی بھڑاس نکالی۔

”آپا اب ایسے تو نہ کہو۔ نصیبہ تو شہزادی ہے شہزادی۔“ ثریا بی بی میٹھی نظروں سے کچن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو نازو اور ایمنہ کے ساتھ ساتھ ارم (ثریا کی چھوٹی بہو) بھی جل کر کباب ہو گئی۔ کچن کے اندر مٹی کے بنے چولہے میں اپلوں اور لکڑیوں کی آگ جلاتی نصیبہ کا تن من شاد ہی ہو گیا۔

”چاچی! پہلے مجھے پراٹھا بنا دو۔ بہت بھوک لگی ہے۔“ ارم کا پانچ سالہ نعمان دروازے سے داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”ارے منے میری جان، میرے شہزادے کو اس کی ماں نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کروایا۔“

نصیبہ نے دیا سلائی جلا کر لکڑیوں اور اپلوں کے درمیان رکھے پرانے کاغذوں کے درمیان رکھی۔ جس سے لکڑیوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی، بس اب تھوڑی ہی دیر میں آگ اچھی طرح جل اٹھتی نصیبہ نے منے کو پاس بلا کر گود میں لے کر پیار کرنے اور گدگدانے لگی۔

"ہائے ہائے نصیبو! کم عقلے، تمہیں عقل کب آئے گی۔ بوڑھی ہوگئی پر عقل نہ آئی۔ کم بخت میرے منے کو آگ میں پھینکے گی۔ پاس آگ جل رہی ہے اور تم ہو کے میرے معصوم کو گود میں لے کر گدگدا رہی ہو اگر خدانخواستہ اچھل کر چولہے میں گر گیا تو تمہارا کیا جائے گا۔ ادھر آ کم بخت۔"

ارم زور، زور سے بولتے ہوئے منے کو کھینچنے لگی مگر وہ تو الٹا اس کے ساتھ چمٹتا جا رہا تھا۔

ارم نے جب باورچی خانے میں نصیبہ کی گود میں منے کو کھلاتے دیکھا تو اس کے کلیجے میں گویا آگ بھڑک اٹھی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ نصیبہ اس کے دونوں بچوں کو اس سے بڑھ کر پیار کرتی ہے۔

"اماں! میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ چاچی سے پراٹھا پکوا کے کھانا ہے۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"
منا نصیبہ کی گود میں چھپتے ہوئے بولا۔ تو وہ کھسیا کر بولی۔

"میں گھر جانے ہی لگی تھی۔ ابھی ارسلان کو بھی ناشتہ کروانا ہے۔ تم بھی چلو۔" اس نے ایک سرسری سا اصرار منا سے بھی کیا۔

"ارم! ایسا کرو اگر تم گھر جانے ہی لگی ہو تو ارسلان کو بھی ادھر ہی بلا لو۔ اب دس بجے تم کیا ناشتہ بناؤ گی ان کا؟ میں تم سب کے لیے آلو والے پراٹھے بنا دیتی ہوں تم بھی ادھر ہی ناشتہ کر لینا۔"

مصروف سی نصیبہ نے ایک چھوٹے سے اسٹول پہ منے کو بٹھاتے ہوئے کہا تو ارم کے گویا من کی مراد بھر آئی۔

"ہائے بھابھی! (جو کچھ دیر پہلے کم بخت نصیبو تھی) منا تو صبح سے ضد کر رہا تھا کہ چاچی کے ہاتھ کے پراٹھے کھائے گا، کیا سواد ہے تمہارے ہاتھ میں، ایسے ہی تو بشارا تمہارا دیوانہ نہیں، لو بھئی آج تو ہماری عید ہوگئی۔" ارم اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جا منے دوڑ کے جا اور بھائی کو بلا لا۔ اسے کہنا باہر کے دروازے پہ تالا لگا آئے۔" ارم کچن میں ہی بیٹھتے ہوئے بولی۔

"نہیں اماں میں نے پہلا پراٹھا لینا ہے۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔ تم خود ہی جاؤ۔"
منا بھی ارم کا ہی بیٹا تھا وہ بھلا کیوں جاتا۔ صاف جواب دے دیا اس نے نصیبہ نے پراٹھا پلیٹ میں رکھ کر منے کے آگے رکھا، پراٹھے پہ تازہ بنا ہوا مکھن بھی رکھا تو وہ خوش ہوگیا۔

دیسی گھی میں بنے آلو والے پراٹھے کی خوشبو باہر صحن میں سردیوں کی دھوپ کے مزے لیتی خواتین تک پہنچی تو خالہ ایمنہ کی بھوک بھی چمک اٹھی۔ فوراً بولی۔

"نازو جا میری بیٹی! ذرا ایک پراٹھا میرے لیے بھی لے آ اور نصیبہ سے کہو چائے بعد میں پئیں گے جا میری بیٹی وہ اکیلی لگی ہوئی ہے، ذرا خود ہی پکڑ لا پراٹھا۔ کیونکہ پراٹھے کا مزہ تو گرما گرم کھانے میں ہی ہے۔" نازو ماں کی بات سنتے ہی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"ثریا! تمہارے لیے اتنا دل اداس ہوا تھا ہم دونوں کا کہ صبح اس نے ناشتہ بھی نہیں کرنے دیا اور مجھے کھینچ کے لے آئی کہ اماں چھوٹا دن ہے۔ جلدی چلتے ہیں پھر بشارا بھی ڈیرے پہ چلا جائے گا۔"

گویا اصل بات تو بات کے آخر میں سامنے آئی۔ ثریا سر جھٹک کے رہ گئی کہ خوب جانتی تھی اس دکھاوے کی محبت کو اور اس کے مقصد کو۔

"نصیبہ! لاؤ میں تمہارا ہاتھ بٹاتی ہوں۔" نازو کچن میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

نصیبہ نے پراٹھا چمٹے سے پلٹتے ہوئے ایک سرسری نگاہ اس پہ ڈالی اور حق میزبانی نبھاتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔

"نازو! تو یہاں کیوں آگئی دھوئیں میں، تم باہر دھوپ میں بیٹھو میں دو تین پراٹھے پکالوں پھر چائے بناتی ہوں۔"

"نصیبہ! آلو والے پراٹھے تو مجھے اور اماں کو بھی بہت پسند ہیں اور پھر جب تمہارے ہاتھ کے ہوں تو کیا ہی بات ہے۔ قسم سے بھابھیاں بھی آلو والے

پراٹھے پکائیں تو حلق سے اترتے ہی نہیں۔"
نازو کو بھابھیوں کی برائی کرنے کا بھی موقع مل گیا۔ بھابھیوں کا ذکر کرتے ہوئے نازو نے یوں منہ بنایا جیسے کریلے کا جوس پی لیا ہو۔

"تو تم بھابھیوں کا منہ کیوں دیکھتی ہو۔ خود ہی بنا لیا کرو ناں۔"

نصیبہ یوں خوش دلی سے بولی جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ان ماں بیٹی نے کوئی بات کی ہی نہ ہو۔ اور یہی خوبی اسے ہر دل عزیز بناتی تھی۔

"اچھا نازو تم یوں کرو! خالہ سے پوچھو، ناشتہ باہر دھوپ میں ہی کر لیں گی یا بیٹھک میں لگاؤں۔"

نصیبہ پراٹھوں کو مکھن لگا کر ایک دوسرے کے اوپر رکھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی ڈونگے میں دہی ڈالا، ایک پیالے میں چینی ڈالی۔ ایک جگ لسی کا بھرا، ساتھ ہی چولہے پہ حلوے کے لیے کڑاہی رکھ کے دیسی گھی ڈالا اور تین، چار الائچیاں کڑکڑانے کے لیے ڈالیں، دوسرے چولہے پہ پانی میں چینی ڈال کر شیرہ تیار کرنے کو رکھا۔

اسی اثناء میں ارم خود ہی دوڑ کے دوسری گلی میں اپنے گھر سے ارسلان کو بھی اٹھا لائی۔ آٹھ سالہ ارسلان کو ساتھ لگا کر ارم نے جلدی جلدی باہر صحن میں ہی خالہ کی ایما پہ ناشتہ لگا دیا۔

☆☆☆

نصیبہ بہت کھلے دل کی مالک تھی۔ اس کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے۔ بلکہ دونوں بھائیوں بشارت احمد اور عظمت اللہ کی شادی ایک ساتھ ہی ہوئی تھی۔ عظمت کی شادی پھوپھو کے گھر ہوئی تھی۔ ارم ثریا بیگم کی نند کی بیٹی تھی۔

بشارت احمد کے لیے ثریا اور بشارت دونوں کی مرضی ثریا بیگم کی بھانجی نازو سے کرنے کی تھی۔ نازو گوری چٹی نازو انداز سے بھری اونچی ہواؤں میں اڑان بھرنے کے خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے تھی۔

جب ثریا بیگم رشتہ لے کر بڑی بہن ایمنہ کے پاس پہنچیں تو وہ تو گویا ماتھے سے ہی اکھڑ گئی۔

"ثریا بندہ بات کرنے سے پہلے سوچتا تو ہے کہ کیا بات کرنے جا رہا ہے۔ کہاں میری نازو؟ اور کہاں بشارا؟ نازو دودھ مکھن سی گوری ملائم، پوری بارہ جماعتیں پاس اور تمہارا بشارا، یتیمی کا مارا، سوکھا چرخ، نہ عقل نہ شکل، نالائق کہیں کا کتنے سال ہوگئے دسویں پاس نہ کر سکا۔ سارا دن کھیتوں میں مٹی میں ہوا ہوتا ہے۔ مٹی، گوبر کی بساند میں رچا ہوا، نہ بی بی نہ! میری نازو، بڑی نازک مزاج ہے۔ تمہارے گھر میں گزارا نہیں کر سکتی۔"

ایمنہ کا لہجہ ہی اجنبی نہیں ہوا تھا۔ چہرہ بھی کسی اجنبی کا لگ رہا تھا۔ ثریا جو خوشی خوشی بہت ارمانوں سے بیٹے کا رشتہ مانگنے آئی تھی اسے یوں لگا گویا کسی نے اچانک آسمان سے زمین پہ لا پٹخا ہو۔

"مگر آپا! بشارا یتیم ہو گیا تو اس میں اس بے چارے کا کیا قصور؟ پھر یہ بھی تو دیکھو وہ نازو سے کتنی محبت کرتا ہے۔"

ثریا بیگم آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ایمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"بس ثریا بس! میری نازو کا نام نہ لو۔ اگر تم میری بہن ناں ہوتی تو میں تمہیں اسی وقت دھکے دے کر گھر سے نکالتی اور پھر نازو کا رشتہ اس کے تایا نے مانگ رکھا ہے۔ اب دوبارہ ایسی کوئی بات نہ کرنا۔"

ایمنہ نے ہر لحاظ ختم کرتے ہوئے نہایت دوٹوک انداز میں ثریا کی کاوشوں کو خاک میں ملاتے ہوئے صاف جواب دے دیا۔

"مگر آپا! بھائی قادر کا اکو اک (اکلوتا) بیٹا تو جرمنی میں شادی کر چکا ہے کسی میم کے ساتھ۔ تو کیا تم نازو کا رشتہ ایک بڑی عمر کے دوہاجو (دوسری شادی والا) کے ساتھ کر دو گی۔ دیکھو آپا! میرا بشارا نازو کو بہت چاہتا ہے دونوں ہانی (ہم عمر) ہیں۔ ایسا مت کرو، میری بات مان لو آپا! میں تمہاری چھوٹی بہن ہوں۔ بڑے مان سے تمہارے در پہ آئی ہوں۔ مجھے

خالی ہاتھ مت بھیجو۔"

ثریا بیگم بڑی لجاجت سے منت بھرے انداز میں بولی تو اس کے لہجے میں ایک ماں کی مامتا فریاد کر رہی تھی، اس نے ایمنہ کا بازو پکڑنے کی کوشش کی۔

"ثری! تم میری بہن ہو، اسی بات کا تو لحاظ کر رہی ہوں کوئی اور یوں منہ اٹھا کے چلا آتا اور ایسی بات کرتا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوتا۔ دوہا جو کیوں ہونے لگا وہ، اس نے تو کاغذ بنوانے کے لیے پیپر میرج کی تھی اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ شادی تو وہی ہوگی جو وہ یہاں کرے گا۔ یہیں اس کی نسل چلے گی۔ میری نازو تو راج کرے گی راج، دن رات پیسوں میں کھیلے گی۔"

ایمنہ جو اس وقت بہت اونچی اڑان کی تیاریوں میں تھی لہجے میں خواب بھرتے ہوئے بولی وہ ثریا کی کسی بات کو سننے کو تیار نظر نہ آئی۔

"دیکھو آپا! میں تمہاری چھوٹی بہن ہوں۔ نازو میری بھانجی ہے۔ اسے ہمیشہ اپنی ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھوں گی۔ مان جا۔" ثریا نے ایک کوشش اور کی، آنسو اب ہر رکاوٹ عبور کر کے ثریا کے چہرے پہ دیوانہ وار ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سسکیاں ثریا کے لہجے میں سسک رہی تھیں۔

"دیکھو ثریا! آخری بار کہہ رہی ہوں۔ نازو کے خواب دیکھنا چھوڑ دے، بتا تو دیا ہے کہ اس کی زبان دے دی ہے اس کے تایا کو اور اپنے بہنوئی کا تمہیں پتا ہے کتنا غصے والا ہے۔ میں تو شکر کر رہی ہوں کہ وہ اس وقت گھر نہیں جا، اس کے آنے سے پہلے لوٹ جا اور پھر ایک اور بھانجی بھی تو ہے تیری۔ اسے کیوں نہیں بہو بنا لیتی ارے نصیبہ کو ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھے گی تو ثواب بھی ملے گا۔ مری ہوئی بہن کی روح بھی راضی ہوگی اور تیرا بھانجی کو بہو بنانے کا خواب بھی پورا ہو جائے گا۔"

ایمنہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی یعنی بے مروتی کی انتہا ہی ہو گئی تھی۔

ثریا کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اپنی گود میں رکھے ہوئے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی پھر چادر کے پلو سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ایک نظر پاس پڑی ٹیبل پہ رکھے مٹھائی کے ڈبے پہ ڈالتے ہوئے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے آہستہ سے اٹھی تو ایک ٹھنڈی آہ اس کے لبوں پہ آ کے دم توڑ گئی۔ بھاری قدموں اور جھکے ہوئے سر کے ساتھ اردگرد سے بے نیاز ہو کر چھوٹے چھوٹے بے جان قدم اٹھاتے ہوئے صحن عبور کرتے ہوئے ثریا ان کے دروازے سے ہی نہیں ان کی زندگیوں سے بھی نکل گئی۔

☆☆☆

وہاں سے ثریا سیدھی نصیبہ کے باپ کے پاس پہنچی، وہ اس کا بہنوئی ہی نہیں بلکہ دیور بھی تھا مگر بشارے کو ساری باتیں بتانے اور اس کا عندیہ لینے کے بعد کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ساری عمر بشارے کی مجرم بنی رہے۔

بشارا بے شک نازو کو پسند تو کرتا تھا مگر اس حد تک نہیں کہ اس کے بغیر عمر بھر کا روگ لگا لیتا۔ اور پھر حقیقتوں کے رنگ تو اس کے باپ کی وفات کے بعد ہی یہ آشکار ہونے لگ گئے تھے۔ اور پھر انہی حقیقتوں کو اس نے اپنی طاقت بنا لیا تھا۔ کہ ان سے فرار اپنے آپ سے دشمنی تھی۔ اگر اس کی ذات اکیلی ہوتی تو خوابوں کے سرابوں میں بھٹکتے ہوئے شاید وہ اپنی عمر گزار دیتا مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔ ماں اور بھائی کا ساتھ تھا۔ اپنے پیارے بھائی کو پڑھانے کے لیے اس نے اپنی پڑھائی کی قربانی دے دی تھی اور اسے میٹرک کروا کے فوج میں بھرتی کروا دیا تھا۔ اب اس کی نسبت پھوپھی کی بیٹی ارم سے طے ہو چکی تھی جبکہ بشارے کے لیے اس کی بڑی خالہ ایمنہ خود شروع ہی سے خواہش مند تھی کیونکہ بشارا بچپن سے بہت پیارا بچہ تھا اور پہلا بیٹا، جس کا باپ بہت کھلے دل اور کھلے ہاتھ کا بندہ تھا اور رشتہ داروں پر کھلے دل سے خرچ کر کے خوش ہوتا تھا۔ مگر جو ہی ایک حادثے میں اس کی وفات ہوئی تو یہ عقدہ کھلا کہ اس نے بچایا کچھ نہیں۔

جیسے تیسے قل، دسواں کروا کے سب رشتہ دار فصلی کیڑوں کی طرح اڑ، اڑا گئے اور واپسی کا گویا رستہ ہی بھول گئے اور بھولے ہوئے راستے مفلسی کی گرد میں اپنی پہچان کھو بیٹھتے ہیں۔

ہاں اس کے چچا نے مقدور بھر کوشش کی ان کا ساتھ دیا۔ مگر بشارے نے اپنی تعلیم کی قربانی دی اور ڈیرے داری سنبھال لی پھر دنیا کے دھندوں نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ مڑ کے کتابوں پہ نظر ڈالتا۔ شروع شروع میں اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اکثر نقصان اٹھاتا پھر بھی جیسے تیسے لگاتار محنت سے وہ اپنے گھر کی گاڑی کو سست روی سے ہی سہی چلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب بھی وہ بڑی چاہت سے برکت کی دکان کی اسپیشل قلاقند کا دو کلو کا ڈبہ لے کر اپنی ماں کے ساتھ خالہ ایمنہ کے گھر گئے تھے، وہ بیٹھک (ڈرائنگ روم) میں بیٹھا ساتھ والے کمرے میں ہونے والی بیشتر باتیں سن چکا تھا، جو ایمنہ خالہ نے جان بوجھ کر اسے سنانے کی غرض سے اونچی آواز میں کی تھیں۔

"اماں! میرے لیے دنیا میں تجھ سے اور تیری عزت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔ بس اب تو بھی نازو کو بھول جا۔ میرے دل کا ہر دروازہ اس کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ اب وہ خالہ زاد کے علاوہ اور کچھ نہیں اور یہ بات تو نصیبہ کو بھی میرا نصیب بننے سے پہلے بتا دینا۔"

بشارا اماں کو چچا کے گھر چھوڑنے آیا تو یہ ساری بات کہہ کر واپس مڑنے لگا تو ثریا نے آواز دی۔

"بشارے! کیا نصیبہ کی بے قدری نہیں کہ میں خالی ہاتھ اس کا رشتہ لینے آ جاؤں۔"

"اماں تو خالی ہاتھ کیوں جائے گی؟ میں چاچا برکت کی دوکان ہی جا رہا ہوں۔ ابھی برفی لا کے دیتا ہوں، تم اندر تو جاؤ۔"

وہ ایک مرتبہ پھر برکت کی دکان کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ثریا واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ بڑی بہن کے گھر سے خالی ہاتھ لوٹنے والی کو دیور نے خالی جھولی واپس نہیں بھیجا تھا۔ پھر جھٹ پٹ ثریا نے دونوں بیٹوں کی شادی کر دی۔

اس کے کچھ ہی عرصے بعد نازو کی شادی بھی جرمن پلٹ تایا زاد سے ہو گئی اور یوں نازو اونچی اڑانوں میں اڑتے اڑتے زمین سے اپنے تعلق کو بھول ہی تو چکی تھی۔ ہر وقت تتلی کی طرح بنی سنوری اڑی اڑی پھرتی اور پھر ایک مہینے کی چھٹی پہ آنے والا اس کو اونچے خواب دکھا کے امیدوں کی شمعیں جلا کے گیا تو اس کا رستہ دیکھنے والی اس کے واپس آنے تک ایک خوب صورت بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔

دوسری مرتبہ بھی وہ ایک مہینے کی چھٹی پہ ہی آیا تھا۔ مگر بیس دن بعد ہی جانا پڑ گیا کہ اس کی جرمن بیوی کو شک ہو گیا تھا۔ بس یہ ایک مہینہ اور بیس دن نازو بی بی کی زندگی کا سرمایہ بن گئے۔ اس مرتبہ بھی نازو کا بیٹا ہوا مگر اب کے اس کا خاوند نہیں آیا کہ اب اس کا پاسپورٹ اس کی جرمن بیوی کے قبضے میں تھا۔

اب نازو تھی اور اس کی تائی اور چار نندیں، جو پہلے تو اس کے صدقے واری جاتی تھیں مگر اب انہوں نے گھر کا سارا کام جب اس سے لینا شروع کیا تو نازو بھی اتنی سیدھی اور معصوم تو نہیں تھی کہ ان کے سامنے بھیگی بلی بنتی۔ سو روزانہ جھگڑے ہوتے۔

ماں اور بہنیں فون پہ اپنے بھائی کے خوب کان بھرتیں اور پھر بالا ہی بالا اس کے دونوں بچوں کے ویزے لگوا کر باپ نے اپنے پاس بلا لیے، ستم تو یہ کہ جاتے ہوئے اس کے بچوں کو اس سے ملوایا بھی نہ گیا۔

وہ اپنے گھر والوں کو کھلے پیسے بھیجتا مگر نازو کو کچھ بھی نہیں بھجواتا بلکہ کہتا کہ اگر ضرورت ہے تو میری ماں سے لے لو۔ یہی وجہ تھی وہ بشارے پہ دوبارہ قربان ہو رہی تھی۔ جو شادی کے دس سال بعد بھی ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔

نصیبہ انہیں ناشتہ بھجوا چکی تھی۔ اب دودھ پتی کی مزے دار چائے ٹرے میں رکھ کر لائی تو اسے دیکھتے

ہی ایمنہ خالہ نے ایک مصنوعی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے بولی۔

''نصیبہ تمہارے ہاتھ کے کھانے میں تو جادو ہے۔ شاید اسی لیے تو دس سال کی بے اولادی کے باوجود بھی بشارا تمہارے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔''

''پہلی بات تو یہ خالہ کہ میں بے اولاد ہوں میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں، اگر تم بار بار اس بارے میں مجھے نہ یاد کراؤ تو بھی کوئی بات نہیں اور دوسرے یہ کہ میں اپنے رب سوہنے کی تقسیم پہ راضی ہوں اگر اس نے ابھی تک مجھے اولاد نہیں دی تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہی ہوگی مجھے اس بات پر پختہ یقین ہے۔''

وہ اتنی بات کر کے تھوڑا سا مسکرائی اور دوبارہ بولی۔

''اور خالہ بشارا کوئی ڈھور ڈنگر (مویشی) نہیں جو میں اسے کسی کھونٹے سے باندھ کر رکھوں گی۔ وہ خیر سے چودہ جماعتیں پاس کر چکا ہے، جسے تم اور تمہاری بیٹی نے انڈر میٹرک ہونے کی وجہ سے دھتکار دیا تھا اور اسے یہ بات اچھی طرح یاد ہے۔''

''نصیبہ پتر! میں نے تو ایسے ہی ایک بات کی تھی تم تو برا ہی مان گئیں۔'' ایمنہ خجل سی ہو کر بولی۔

''نہیں خالہ! میں نے برا نہیں مانا۔ بس ویسے ہی تمہیں یاد دلایا ہے کہ تم لوگوں نے بشارے کو ریجکٹ کیا تو میری تو زندگی ہی سنور گئی۔ ہم دونوں مل کر پڑھتے بھی رہے، کام بھی کرتے رہے اور زندگی کی گاڑی کو کھینچتے بھی رہے اور اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ ہمیں اس کی رحمت پر پورا بھروسا ہے وہ ہمارے آنگن میں پھول ضرور کھلائے گا۔''

نصیبہ کے چہرے پہ ایک بھرپور مسکراتی ہوئی یقین کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

''اچھا خالہ! یہ بتاؤ کہ دوپہر کو کیا کھاؤ گی؟ تمہارے لیے کیا بناؤں۔''

''اب دوپہر کون سا دور ہے۔ ابھی اتنا پیٹ بھر گیا ہے۔ بھلا دوپہر کو کیا کھانا ہے۔''

''نہیں نہیں خالہ! جب تک کھانا بنے گا بھوک بھی لگ ہی جائے گی اور بشارا بھی واپس آجائے گا۔ سب مل کر اکٹھے کھانا کھائیں گے۔''

نصیبہ مسکراتے ہوئے بولی تو ثریا اپنی بہو کی طرف دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگئی۔

☆☆☆

نصیبہ نے تو واقعی اس گھر کے نصیب ہی بدل ڈالے تھے۔ اس نے آتے ہی بشارے کی عملی میدان میں بھی ہر سرگرمی میں اس کا ساتھ دیا۔ باہر زمینوں پر کھیتوں کے کنارے شیشم اور سفیدے کے درخت لگوائے ڈیرے پہ پھل دار درخت لگوائے، جن سے حاصل ہونے والے پھل منڈی میں بیچ دیے جاتے۔ فصل سب سے پہلے اور سب سے اچھی ہوتی۔

وہ خود بھی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں فوت ہو چکی تھی، باپ بھی ساتھ تھا۔ تھوڑا بہت ہاتھ بھی بٹاتا اور اپنے تجربے کی بنا پر مفید مشوروں سے بھی نوازتا۔ یوں ان کی زمین سونا اگلنے لگی۔ بشارا چھوٹے بھائی کو ایمان داری سے اس کا حصہ نکال کر اسے دے دیتا۔

ان دس سالوں میں اس نے نہ صرف خوب صورت گھر بنوالیا۔ بلکہ کچھ بچت بھی کر لی جس سے اس نے کئی بھینسیں بھی خرید لیں جن کا دودھ بھی وہ خود جا کر قریبی شہر میں دودھ فروش کو دے آتا اور ساتھ بھینسوں کی خرید و فروخت بھی کرتا۔ جس سے اس کو ایک اچھی خاصی معقول آمدن ہو جاتی۔ آج بھی بشارا اپنے ٹریکٹر ٹرالی پہ بہت سی لکڑیاں رکھوا کر فرنیچر بنوانے کے لیے دینے گیا ہوا تھا۔

نصیبہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ نازو اس کو برتن پکڑانے آئی تو مسکرا کر کہنے لگی۔

''نصیبہ دوپہر کو صرف چاول ہی پکا لینا، زیادہ تکلف مت کرنا۔''

''تکلف کیسا نازو! تم لوگ کوئی روز روز تھوڑی آتے ہو۔'' وہ کھلے دل سے مسکرا کے برتن پکڑتے ہوئے بولی۔

(توبہ بڑا حوصلہ ہے بھئی اس کا، جانے کس دل

سے مسکراتی ہے)

''ہائے ہائے ارمو! منع کرو پپو کو، دیکھو کیسے ٹماٹر کا پورا پودا ہی کھینچ لیا اب اسے پکڑ کے مرغی کے پیچھے دوڑا ہے۔ سارے پودے خراب کر دے گا۔ نصیبہ نے اتنی محنت اور شوق سے لگائے ہوئے ہیں۔''

خالہ ثریا کی تیز آواز نصیبہ کے کانوں میں پڑی جو چھوٹی بہو کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہائے اماں کیا ہو گیا اگر ٹماٹر کا پودا کھینچ لیا تم نے کیا اس کے ٹماٹر بیچنے تھے؟ اور پھر آخر کو سارا کچھ انہی کا تو ہے۔ بشارے کی کون سی آل اولاد ہے، جو ہے آج بھی ان کا ہے۔ کل بھی ان کا تو پھر تمہیں کیوں دورے پڑ رہے ہیں؟''

نصیبہ جو خالہ ثریا کو سمجھا کر چپ کروانے کی نیت سے باورچی خانے سے باہر تیزی سے آ رہی تھی، اس کا دھیان ارم کی تیز آواز پر تھا اچانک اس کا پاؤں رپٹا اور وہ آن کی آن میں، تیورا کر چاروں شانے چت گر چکی تھی۔

ثریا تڑپ کر اٹھی اور ننگے سر ننگے پاؤں نصیبہ کی طرف بھاگی مگر نصیبہ تو بے ہوش ہو چکی تھی۔ ثریا کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اس پچوئیشن میں۔ اب جیسے تیسے اسے رکشے میں ڈال کر قریبی شہر کے ہسپتال چلی آئیں کہ بشارے کو دکھانا مقصود تھا کہ ہمیں تمہاری فیملی کی بڑی فکر ہے۔

بشارے کو فون کر دیا تھا۔ وہ ان سے پہلے ہی ہسپتال پہنچ چکا تھا۔

ارم اپنے بچوں کے پاس رک گئی تھی کہ اس کی نظر میں یہ صرف نصیبہ کا ڈراما تھا جس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

بشارا اس وقت نہایت مغموم انداز میں سر جھکائے ماں کے پاس ہسپتال کے کاریڈور میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایمنہ بھی پاس ہی بیٹھی تھی مگر نازو برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے سیل فون کان سے لگائے کسی سے بات کرنے میں مصروف تھی۔ گاہے بگاہے ایک خاموش نظر اپنی سدھ بدھ بھلائے بیٹھے بشارے پہ ڈال لیتی۔

اچانک ایمرجنسی روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آئی تو بشارا کمان سے نکلے تیر کی طرح تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

''ڈاکٹر صاحبہ! نصیبہ کیسی ہے، کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟''

''خطرہ کیسا بھئی؟ بات خطرے والی نہیں بلکہ خوشی والی ہے آپ یہ بتائیں پیشنٹ آپ کی کیا لگتی ہے؟''

ڈاکٹر نے مسکرا کر پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحبہ! وہ میری بیوی ہے۔''

''تو پھر آپ کو بہت بہت مبارک ہو، آپ باپ بننے والے ہیں۔ ایسی حالت میں چکر وغیرہ آ ہی جاتے ہیں۔ پریشان نہ ہوں۔ آپ پیشنٹ کا بہت زیادہ خیال رکھیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کا موقع دیں اور غذا کا خیال رکھیں، غذا میں دودھ اور پھل کا استعمال زیادہ کروائیں۔''

ڈاکٹر اپنی پیشہ ورانہ ہدایات دیتے ہوئے بولی۔

اور بشارے پہ تو شادی مرگ کی کیفیت تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جبکہ ثریا وہیں ایک طرف اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو چکی تھی۔

ایمنہ اور نازو کس وقت وہاں سے کھسک لیں۔ کسی کو خبر بھی نہ ہو سکی۔

نصیبہ جو اپنے رب کی تقسیم پہ راضی تھی تو وہ بھلا اپنی رضا میں راضی رہنے والوں کو کبھی مایوس کرتا ہے۔ نہیں ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔

بشارا اندر کمرے میں نصیبہ کا ہاتھ پکڑے مسکرا رہا تھا مگر آنسو ابھی بھی اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ نصیبہ کے لبوں پہ ایک شرمیلی مگر آسودہ مسکراہٹ تھی۔

اور ثریا نصیبہ کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر دونوں کو دیکھتے ہوئے قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی۔

ان کو مسکراتا دیکھ کر ساری فضا مسکرا رہی تھی۔

☆☆

محروم

مدیحہ عارف

"آپ بے شک ایک عظیم انسان ہیں، بنا کسی این جی او اور بین الاقوامی ادارے کے بغیر اتنے بڑے سیٹ اپ پر اکیلے ہی کام کر رہے ہیں اور وہ بھی اتنی خوش اسلوبی سے......ایم امپریسیڈ۔"

وہ واقعی مرعوب و متاثر ہوئی تھی، تب ہی دل سے تعریف کرتی چائے پی رہی تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے اسے پیش کی گئی تھی۔ اس ایک ملاقات کے لیے وہ پچھلے دو ہفتوں سے خوار ہو رہی تھی۔ وہ صحافی تھی اور سوشل ورکر بھی۔ اس حیثیت سے وہ بنا روک ٹوک کے اس پورے ادارے کو اچھے سے دیکھ چکی تھی اور اپنا آرٹیکل بھی لکھ چکی تھی جو ہفتہ پہلے اخبار میں شائع بھی ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس کی تشنگی ختم نہ ہوئی تھی، وہ ادارے کے اس قدر منظم طریقے سے چلنے اور ہر قسم کی برائی اور جھوٹ سے پاک ہونے کی وجہ سے کافی حد تک مطمئن و متاثر تھی۔ اسی لیے وہ اس کے مالک سے ملنے اور اس کا ایک عدد انٹرویو لینے کی خواہش مند تھی تاکہ وہ دنیا کو بتا سکے کہ صرف برائی ہی نہیں اچھائی بھی اس دنیا میں موجود ہے۔

محمد زبیر کیانی ایک کاروباری آدمی تھے، جن کی اپنی مصروفیت تھی۔ کبھی شہر سے باہر تو کبھی ملک سے ہی باہر ہوتے، جس کی وجہ سے وہ اپنی خواہش کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا پا رہی تھی۔ اس کے متاثر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آج اسے محمد زبیر کی طرف سے خود بلایا گیا تھا۔ اپنی مصروفیات کے پیش نظر وہ اس سے معذرت بھی کر چکے تھے اور آج وہ ان کے روبرو ان ہی کے دفتر میں موجود تھی۔ چائے آنے تک وہ چھوٹے موٹے سوالات پوچھ چکی تھی اور اس کی مرعوبیت میں اضافہ ہی ہوا تھا، کمی نہیں۔ تب ہی وہ برملا ان کی تعریف کر رہی تھی۔ گلابی رنگ کی لانگ شرٹ اور سفید ٹراؤزر دوپٹے میں ملبوس وہ قلم کاغذ سنبھالے جوابات لکھتی جا رہی تھی۔

"آپ نے بہت بڑی بات کہہ دی مس عروج! میں اس قابل نہیں کہ مجھے عظیم کہا جائے۔ یہ سب تو ایک قرض کی طرح اتار رہا ہوں کہ شاید یوں ہی میرا روٹھا ہوا رب مجھ سے راضی ہو جائے۔" ان کے سامنے پڑی چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی اور انہیں اس سے ذرا دلچسپی نہیں تھی۔

"میں آپ سے اتفاق نہیں کرتی سر! بے گھر اور بے سہارا عورتوں کو سہارا دینا خاص کر ان ماؤں کو جن کی اولادیں انہیں دربدر کر دیتی ہیں۔ ان کی ہر بنیادی ضرورت پوری کرنے اور عزت کی زندگی دینے والے کو عظیم نہیں کہیں گے تو یہ زیادتی ہو گی۔" سفید دوپٹے کو سر پہ ٹکائی وہ مسکرائی تھی اس انسان کی سادگی پہ۔

"آپ میرا انٹرویو لینے آئی ہیں، اس ادارے کے پیچھے کی محرکات اور وجوہات جاننا چاہتی ہیں اور چاہیں گی کہ میں سچ ہی بتاؤں اور میری کوشش بھی یہی ہے کہ جھوٹ نہ بولوں۔"

وہ بات کرتے کرتے کھڑے ہوئے اور پھر دفتر سے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے پیچھے چلی آئی۔

"یہ ادارہ میری ماں کے نام ہے ہر اس ماں کے لیے جس کو اس کی اولاد رکھنا نہیں چاہتی۔ اس ماں کے لیے جو بیوہ ہے یا طلاق یافتہ ہے، جس کا کوئی سہارا نہیں۔ میں اور میرا یہ ادارہ ان کا سہارا بننے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں۔ ان کی ضروریات کو پورا کر کے انہیں خوشی کے کچھ پل زندگی سے کشید کر کے دیتے ہیں تاکہ وہ بھی آسودگی سے زندگی گزار سکیں اور لوگوں کے لیے یہ ادارہ ہے پر میرے لیے اور ان سب عورتوں کے لیے یہ ایک گھر ہے۔ ایک ایسا گھر جو ان کا اپنا ہے، جہاں سے انہیں کوئی بے دخل نہیں کر سکتا۔"

آفس کے باہر برآمدے میں کھڑے کھڑے اس نے سامنے ہال پہ نگاہ دوڑائی، جہاں لکڑی کے بینچ اور صوفے رکھے گئے تھے۔ جن پہ ادھیڑ عمر عورتیں، کچھ جوان خواتین بیٹھی اپنے اپنے کاموں اور خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ وہ ان سب سے مل چکی تھی ہر ایک سے باری باری اس گھر کے بارے میں پوچھ چکی تھی اور اسے یہاں کوئی جھول نظر نہیں آیا تھا۔

سب عورتوں نے فخریہ اسے اپنا گھر ہی کہا تھا اور ان کے لہجے میں جھلکتا مان اور استحقاق اسے چونکا گیا تھا۔ پہلے بھی وہ ہر قسم کے شیلٹر ہوم دیکھ چکی تھی۔ وہ سب نارمل تھے مگر یہ ادارہ اپنے آپ میں بہترین تھا۔ وہ متاثر نہ ہوتی تو ضرور بے حس کہلاتی۔ وہ گنگ بھی، حیران تھی اور ان ہی عجیب نگاہوں سے اس ادھیڑ عمر آدمی کو دیکھ رہی تھی جو نگاہوں میں احترام و محبت لیے پورے ہال پہ نظریں جمائے کھڑا تھا۔

"یہ چار کنال کی کوٹھی میں نے اپنی ماں کے لیے بنوائی تھی اور اب ان سب میں اپنی ماں کو تلاشتا

ہوں۔'' وہ کسی یاد میں کھوئے کھوئے سے بے حد مدھم آواز میں بولے کہ وہ بمشکل سن پائی تھی۔

اب وہ ایک ایسے کمرے سے گزر رہے تھے جہاں سلائی مشین اور کڑھائی بنائی کرنے کا سامان پڑا تھا۔ ایک دو عورتیں یہاں بھی سلائی کرنے میں مصروف تھیں۔ یہ سب ان کی مصروفیت کے لیے تھا تاکہ ان کو اپنے دکھوں سے نظر ملانے کا بھی وقت نہ ملے۔

''پہلے تو یہاں آپ کی فیملی رہتی تھی غالباً، تو اب آپ کی فیملی کہاں ہے؟''

''میری بیوی کو میرے اس کام سے چڑ تھی، میں نے جب انہیں اوپر والے پورشن میں رہائش کا کہا تو وہ ناراض ہو کر میکے چلی گئی پھر میں نے انہیں اسی کالونی میں ایک گھر خرید کر دیا تاکہ وہ اپنی زندگی جیسی چاہے گزاریں۔''

نوٹس بناتے اس کے ہاتھ اتنی نجی بات سن کر ٹھٹکے تھے۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ ہلکا سا مسکرائے۔

''میں نے کہا تھا نا میں کوشش کر رہا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں۔ تو یہ سچ کیسے چھپاتا۔''

''مجھے افسوس ہوا۔''

''ارے نہیں، میں اسی قابل ہوں جو اپنی ماں کو خوش نہیں رکھ سکا۔ وہ دوسرے رشتوں سے خوشی کی امید بھی نہ لگائے۔''

اب وہ پچھلے باغ میں موجود تھے۔ یہاں بھی عورتیں اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھیں۔ اسے یہاں ہر بار آنے پر کبھی کوئی فارغ نظر نہیں آیا۔ ہر فرد اپنے کام میں مگن ہوتا۔ لان میں بھی خواتین مل کر پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مشغول تھیں۔

''میں نہیں مانتی اس بات کو۔ اب آپ عاجزی کی انتہا کر رہے ہیں۔ جس شخص نے محض بے سہارا عورتوں کو ماں کی جگہ یہ محسوس کر کے اس قدر آسودہ حال رکھا ہوا ہو، وہ اپنی سگی ماں کو بھولے سے دکھ نہیں دے گا۔ کبھی نہیں۔'' وہ ان کی بات کو جھٹلاتی سنگی نشست پر بیٹھ گئی۔

''آپ اپنی جگہ درست ہیں، پر تب تک جب تک میں آپ کو اپنی پوری بات بتا نہ دوں اور چاہوں گا آپ اسے ضرور شائع کریں تاکہ کل کو کوئی بیٹا میرے جیسی حماقت نہ کر دے۔ میری روداد سے سبق پکڑے اور ہر بیٹا اپنی ماں کو خوش رکھے، اگر اسے آخرت میں جنت پیاری ہے تو......''

''ہمم......تو مجھے سننے میں دلچسپی ہے۔'' وہ قلم بند کرتی، خود کو ان کی طرف متوجہ کر چکی تھی۔

''میں اپنی ماں کا اکلوتا و یتیم بیٹا تھا۔ اس کوٹھی تک کا سفر اس یتیم کے لیے بہت کٹھن تھا۔ چودہ سال لگے اس بیٹے کو اور تب وہ خود بھی دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ بڑے چاؤ سے میں نے یہ کوٹھی اپنی ماں کے لیے بنوائی تھی۔ پر اس خوش حال زندگی کے بس چند سال ہی گزرے تھے کہ سگے رشتوں میں تلخیاں جو پہلے ناپید تھیں۔ سر اٹھانے لگی تھیں۔ آسودگی، پیسے کی فراوانی اور نئے جدید حالات نے میری اولاد اور بیوی پر یکسر مختلف اثر ڈالا تھا۔ وہ اسی ماحول کے رنگ میں رنگ گئے جو کہ فطری بھی تھا۔ دوسری طرف میری ماں اللہ کے حضور سجدہ شکر ادا کرتی نہ تھکتیں۔ اماں بچوں اور بہو کی روش سے سخت پریشان رہا کرتیں۔ بعض اوقات مجھے بھی بتاتیں، جو حالات گھر کے تھے۔ صبح دیر تک سوتے رہنا اور دیر رات تک گھر سے باہر وقت گزارنا، انہیں نالاں کیے رکھتا۔ دونوں بچوں کی اپنی سرگرمیاں تھیں، وہ پڑھائی سے زیادہ سیر سپاٹوں کو ترجیح دیتے اور بیگم کو اپنی نام نہاد پارٹیوں اور امیر بیگمات کی طرز زندگی اپنانے سے فرصت نہ تھی۔ اللہ کو یاد کرنا تو دور کی بات......کوئی نماز کا نام بھی نہ لیتا تھا۔ ان ہی باتوں پر کافی ہنگامے ہونا شروع ہو چکے تھے جو کہ میرے لیے پریشان کن تھے۔ میں بزنس دبئی تک لے جانا چاہتا تھا، اسی وجہ سے مجھے حقیقتاً سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ میں جس قدر آسائشات اکٹھی کر رہا تھا اتنا ہی بے سکون ہو رہا تھا اور پھر چند سال پہلے ایک صبح اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت طلوع ہوئی۔''

''زبیر! پلیز آپ اماں کو سمجھا کر جائیے، خود تو آپ ...ں کے بہانے دبئی چلے جاتے ہیں۔ مجھے اور میرے ...وں کو یہ عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔'' نخوت سے کہی گئی بات ...بے اثر تھی، جس سے مجھے کوئی فرق ہی نہ پڑا۔

''اب کیا ہو گیا ہے اور ویسے بھی میں کوئی شوق ...نہیں جاتا۔ تم لوگوں کے لیے ہی کما رہا ہوں، تو ہی یہ ...ٹھاٹھ باٹھ ہیں تمہارے اور تمہاری اولاد کے۔'' ...ہوں پیتے ہوئے میرے لہجے کی تلخی عروج پر تھی۔

''رات کو بتایا تو تھا میں نے کہ آج گھر میں ...ارٹی ہے۔ سب بیگمات آئیں گی۔ مجھے ڈر ہے کہ اماں پھر پچھلے ماہ والا کام نہ کریں۔ یاد ہے نا آپ کو وہ ...۔ سب بیگمات کو ان کے کپڑوں اور دین سے ...وری کے اور فضول خرچی سے اجتناب کے درس ...نے لگی تھیں۔ کس قدر سبکی ہوئی تھی میری، کتنے دن تو ...اق بنا رہا میرا۔'' پرانے زخم ہرے ہو گئے تھے، سو ...بیگم نے منہ بسور کر جتایا۔

''تم گھر پر پروگرام ہی نہ رکھو، بلکہ فائیو اسٹار... ہوٹل میں ارینج کر لو۔'' اپنے سر سے بلا ٹالتا، ...ں آئیڈیا دے رہا تھا جو کہ فوراً ہی رد ہو گیا۔

''ارے کیوں بھئی، سب اپنے گھر پر کرتی ہیں۔ وہ سب میرا گھر بھی دیکھنا چاہتی ہیں اور ویسے بھی ان کو بھی تو ہمارا اسٹینڈرڈ پتا چلے ناں۔ ہم کوئی کم ہیں کسی سے۔'' اس کی آواز میں غرور و تکبر گونج رہا تھا۔ دل کے کسی گوشے نے اس غرور کو ناپسند کیا پر میں پھر بھی دل کو تھپکی دے کر آگے بڑھ گیا تھا۔

''تم نے جو کرنا ہے کرو، مجھے نہ لاؤ اس سب میں۔''

''آپ بس اماں کو کہہ جائیں کہ وہ خالہ کی طرف چلی جائیں۔ ایک دو دن کے لیے۔'' مجھے کوٹ پہناتے ہوئے وہ اپنا ارادہ بتا کر مطمئن ہو گئی تھی، جیسے اسے یقین تھا کہ میں وہی کروں گا جو اس نے کہہ دیا ہے۔

''اماں کیسی ہیں آپ؟'' صوفے پر بیٹھتے ہوئے میں نے اماں کو دیکھا جو اپنی تسبیحات میں مشغول تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر ڈھیروں

الف لیلہ ہزار داستانیں

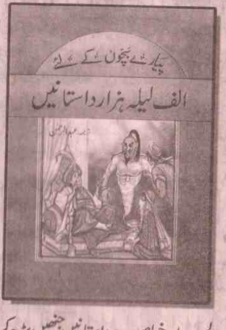

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں

-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں

فی کتاب -/1200 روپے

ڈسکاؤنٹ -/300 روپے

آج ہی -/950 روپے

منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

دعائیں دیں۔

''اماں میں دبئی جا رہا ہوں، دو دن کے لیے۔'' بیٹھتے ہی میں شروع ہو چکا تھا، وقت کی کمی جو تھی۔

''اچھا بچے! خیر سے جاؤ، خیر سے آؤ۔''

''اماں آپ کچھ دنوں کے لیے خالہ کے ہاں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ آپ کا دل بہل جائے گا اور ذرا ہوا بدلی بھی ہو جائے گی۔'' دل میں شرمندگی کا احساس لیے ان کی دعائیں سنتے میں نے اپنی بیگم کا مدعا بیان کیا کہ کسی نئے ہنگامے کی خواہش نہ تھی۔

''سب خبر ہے مجھے۔'' وہ مبہم سا مسکرائیں۔

''بہو رانی کی دعوت ہوگی ضرور رات کو، تب ہی مجھے گھر سے بھیجا جا رہا ہے تاکہ میں اس کے لیے مشکل نہ بنوں، ہاں۔''

''اماں! جب آپ کو پتا ہے پھر کیوں کرتی ہیں۔ میرے لیے بے سکونی بنی رہتی ہے۔ ایک طرف کاروبار کی پریشانیاں، اوپر سے گھر آؤ تو الگ محاذ کھڑا ہوا ہوتا ہے۔''

''اچھا چلی جاؤں گی، اب کوئی بے سکونی نہیں ہوگی۔'' مسکراتے ہوئے انہوں نے سر پر پیار دیا اور میں ان کی آنکھوں میں آئی نمی کو نظر انداز کرتا باہر نکل آیا، جہاں کار بمعہ ڈرائیور میری منتظر تھی۔

''پتا ہے مس عروج! ہم انسان بے خبری میں پچھتاوے اپنے نصیبوں میں لکھ لیتے ہیں، بس پھر کاش جیسا لفظ ہر دم ہماری سماعت میں زہر گھولنے کو رہ جاتا ہے۔ جیسے یہ لفظوں کا زہر میرے ساتھ ہے اور تادم آخر رہے گا۔ اماں کی آخری بات میرے دل کو تیر کی طرح لگی لیکن میں نے ان کی تردید نہیں کی اور نہ ہی انہیں اپنے پیار کا احساس دلایا۔ گاڑی تک آ کر دل میں آئی کہ اماں کو جا کر بتاؤں کہ آپ کس قدر اہم ہیں میرے لیے بلکہ اہم ترین۔ پر میں ایسا نہ کر سکا اور دبئی روانہ ہو گیا۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھرتے آنکھ کے کونے سے آئی نمی صاف کر رہے تھے، جب عروج نے افسوس اور ترحم لیے ان کو دیکھا۔ وہ شخص جو ساٹھ برس کے لگ بھگ تھا، کس قدر پچھتاوؤں کی زد میں تھا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تہی دامن و تہی دست کی مثال بنا بیٹھا تھا۔

''پھر کیا ہوا جب آپ واپس آئے تو؟''

''میرا دو دن کا ٹور ہفتے میں ختم ہوا تو اماں گھر میں نہیں تھیں اور اس بات کی بیگم کو نہ بچوں کو پروا تھی اور نہ ہی خبر۔ خالہ حیدر آباد میں مقیم تھیں سے پتا چلا کہ وہ وہاں پہنچی ہی نہیں اور ڈرائیور انہیں خود گھر کے آگے اتار کر آیا تھا۔ وہ اسی بات پر اٹل تھا پھر کیا کام اور کہاں کی مصروفیت، سب چھوڑ چھاڑ کر ہر طرف ڈھونڈا۔ پولیس کو انوالو کیا لیکن وہ نہ ملیں۔ ملتا تو وہ ہے جو گم ہو جائے جو خود کہیں چھپ جائے وہ پھر کبھی نہیں ملا کرتا۔ محض میرے سکون کے لیے وہ میری زندگی سے چلی گئیں۔ پورے چھ مہینے ڈھونڈتا رہا۔ پولیس تو کب کی جواب دے چکی تھی پر میں ہمت نہیں ہارا۔ پھر بھی وہ نہ ملیں، ایسی ناراض ہوئیں کہ شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

میرے بچوں و بیگم کو چنداں فرق نہ پڑا۔ وہ اپنی زندگیوں میں مگن تھے اور میں پریشان اور دل گرفتہ۔ مجبوری سے کام نبٹاتا پھر رہا تھا۔ جب ایک دن ایسے ہی ایک معمولی سے ادارے سے مجھے بلاوا آیا۔ شہر کا ہر ادارہ تو چھان مارا تھا پر مجھے تو وہ نہ ملیں۔ جب یہاں سے بلایا گیا تو میں سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ وہاں پہنچا تو بس ایک خط تھا جو مجھے دیا گیا۔ ان کے عملے کے مطابق وہ انہیں آج ہی ملا تھا۔ میری اماں کے سامان سے جن کو وہ ہفتہ پہلے سپرد خاک کر چکے تھے۔ میری جنت مجھ سے چھن چکی تھی اور میں بھری دنیا میں اکیلا کھڑا اس کاغذ کے ٹکڑے کو نم آنکھیں لیے دیکھ رہا تھا جو مجھے ان کے چند کپڑوں کے بیگ کے ساتھ تھما دیا گیا تھا۔ بیگ میں میرا نام اور فون نمبر ملنے پر ہی وہ ادارے والے مجھ تک پہنچے تھے۔ انہیں شاید پتا تھا کہ میں ضرور ڈھونڈوں گا انہیں، تب ہی وہ نام بدل کر وہاں رہائش پذیر تھیں۔ میں گھومتے سر اور کانپتے بدن کے ساتھ گھر آیا تھا۔ اس کاغذ کو کھولنے کی ہمت

نہیں کر پا رہا تھا۔ جانتا تھا کہ وہاں سوائے دعاؤں کے کچھ نہ ہوگا اور اب میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میری اماں مجھے دعائیں دیں۔

میرے بیٹے! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ روز روز کی پریشانی کو ختم کر دیا۔ تمہارے لیے بس، تمہارے سکون کے لیے۔ تھوڑا مشکل تھا پر ہو گیا۔ ہمیشہ خوش رہو اور کوشش کرتے رہو کہ زندگی محض گزارو نہیں۔ آخرت کے زادِ راہ کے لیے سامان بھی کرو

تمہاری اماں

یہ چند سطریں میری اماں کے ہاتھ کی لکھیں جو آج بھی جیب میں لیے پھرتا ہوں۔''

ذرا بوسیدہ ہوئے کاغذ کے ٹکڑے کو وہ تہہ کرتے والٹ میں رکھ رہے تھے۔

''بس پھر یہ ادارہ بنایا کہ شاید اس طرح اپنی ماں کو اپنے پاس محسوس کر لوں۔''

اداسی سے مسکراتے ہوئے وہ اٹھے اور اسے یوں ہی حیران و پریشان چھوڑ کر عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔

''ماں کے لیے'' عمارت کے باہر کھڑی اس کے ماتھے پہ بڑے بڑے حروف میں لکھے ان تین لفظوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ زندگی میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ وہ اب بھی اپنے پہلے تاثر پہ قائم تھی۔ وہ واقعی عظیم شخصیت ہیں، جو انسان اپنی غلطی اور گناہوں کو تسلیم کر لے تو پھر توبہ کا عمل نہایت آسان ہو جاتا ہے اور بے شک وہ نیلی چھتری والا غفور و رحیم ہے۔

وہ اس واقعے کے لیے عنوان کے طور پر ذہن میں ابھرے لفظ ''مہزوم'' کو نوٹ پیڈ پہ محفوظ کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی بزنس کی دنیا میں کامیاب ترین شخص نجی زندگی میں کس قدر ناکام تھا، شکست خوردہ تھا۔ کاغذ قلم بیگ میں رکھتی وہ عمارت کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔

☆☆

مکمل ناول

مدیحہ سعید

کاسۂ دل

"آیت کم آن بیٹا!" اس نے گلابی فراک پاجامہ میں ملبوس تین سالہ بیٹی کو پکارا، وہ بھاگتے ہوئے اس کے پاس آئی، تو اس نے جھک کر بانہوں میں بھرتے ہوئے نرمی سے اس کی پیشانی چومی۔

"یونو پاپا! آیت کو فہد بھیا بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"پاپا جانتے ہیں۔ آیت کو فہد بھیا اچھے لگتے ہیں۔" نرمی سے بیٹی کا گال چومتے ہوئے وہ کھڑا ہوا۔

"آیت کو مما، پاپا اور جبریل بھیا بھی اچھے لگتے ہیں۔" باپ کے گلے میں ننھے منے بازو حمائل کرتے گال سے گال ملاتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا تب ہی اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا۔ یونہی لبوں پر مسکان سجائے وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوا، جہاں سے سفید کلیوں والی فراک میں ملبوس ہلکی پھلکی سی جیولری میں ہلکا پھلکا میک اپ کیے دو ماہ کے جبریل کو احتیاط سے گود میں لیے وہ اپنے دھیان میں پلٹی تھی۔

☆☆☆

ازلان احمد لاشاری، اس وقت سرمئی پجیرو سے ٹیک لگائے فون پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ چھ فٹ قد، مضبوط کسرتی جسم، سرخ و سفید رنگت، کھڑی مغرور ناک۔ جینز میٹریل کی شرٹ کے کف موڑے وہ جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا تب ہی کیب اس کے سامنے رکی، گہری سانس لیتے سیل جیب میں ڈالتے ہوئے سامنے دیکھا، جہاں سے واصف کرایہ ادا کر کے اسی کی طرف آ رہا تھا۔

"ہائے مین!" واصف پنجا اس کے پنجے سے لڑاتے ایک ادا سے بغلگیر ہوا۔ "سوری یار میں تھوڑا لیٹ ہو گیا۔"

"تھوڑا؟" الگ ہوتے ازلان نے اسے گھورا، پھر کلائی پر بندھی بیش قیمت گھڑی اس کی نگاہوں کے سامنے کی۔

"پچھلے سترہ منٹ بیس سیکنڈ سے بے وقوفوں کی طرح یہاں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"غلط لفظ بول گئے تم۔" واصف نے بجائے شرمندہ ہونے کے اس کے جملے پر اعتراض کیا۔ "تمہیں کہنا چاہیے تھا، الوؤں کی طرح، یہاں

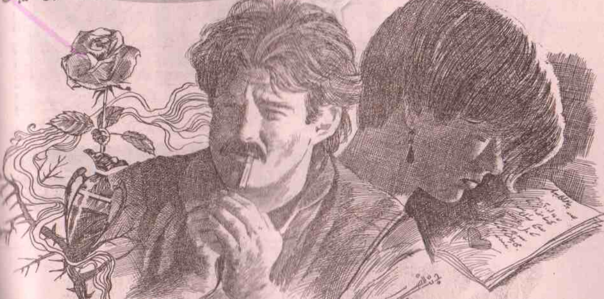

کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔"

"ظالم انسان!" اذلان کے پنچ پر وہ کراہ کر رہ گیا۔

"خبیث؟" اس نے اذلان کو دیکھا۔ جواب مسکرا رہا تھا۔ "شرم تو نہیں آتی یوں مسکراتے ہوئے اپنے بیس کلو کے ہاتھ سے میرا کندھا ہلا دیا۔" اس نے دہائی دی جو سراسر مصنوعی تھی، اذلان نے اس کی دہائی نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ "اب بیٹھ بھی چکو یا انویٹیشن دینا پڑے گا؟ گاڑی بھی مانگ کر لایا ہوں۔" چابی اگنیشن میں ڈالتے واصف کو ڈپٹا۔

"تمہاری گاڑی کہاں ہے؟" واصف بھی اس کے برابر بیٹھا۔

"سروس کے لیے گئی ہے کہاں جانا ہے۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے واصف سے پوچھا۔

"پہلے تو تم مجھے کسی اچھی جگہ سے لنچ کرواؤ اس کے بعد خالہ کی طرف چلیں گے۔" اذلان نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"لنچ میں کروا دیتا ہوں مگر خالہ کی طرف جانے سے معذرت۔"

"کیوں؟" واصف نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تو اذلان نے سر جھٹکا۔

"کیونکہ کل شام میں مما کو لے کر ان کی طرف گیا تھا اور میں تمہیں بالکل سمجھ نہیں پایا، آخر تم چاہتے کیا ہو؟" وہ ازحد سنجیدہ تھا۔

"جیسے تمہیں تو معلوم ہی نہیں، میں کیا چاہتا ہوں۔" اس نے شرم دلاتی نگاہوں سے اذلان کو دیکھا۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کیا چاہتے ہو مگر یہ بالکل نہیں سمجھ پا رہا کہ آخر تم سیدھی سادھی لو اسٹوری کو کیوں خواہ مخواہ پیچیدہ بنانے پر تلے ہو؟" گاڑی ریستوران کے سامنے روکتے ہوئے وہ پوری طرح رخ موڑ کر اس کی طرف متوجہ تھا جبکہ واصف بھی سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"تم خالہ سے بات کرو اور اسے اپنے ... رجسٹرڈ کروا لو اس میں کیا مسئلہ ہے؟"

"تمہارے لیے کہنا آسان ہے اذلان!" واصف دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ "کیا تم بابا اور ... کے درمیان چلتی سرد جنگ سے واقف نہیں ہو؟"

اس کے لہجے سے افسردگی جھلکی۔ اذلان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے خاموشی کی زبان میں تسلی دی۔

"بل تم پے کرو گے۔" اذلان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا وہ جو رکوع میں جھک رہا تھا، جھٹکے سے سر اٹھا کر مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

"تمہیں شرم آتی ہے اذلان لاشاری؟"

"تم بل بھرو گے تو بھلا مجھے کیوں شرم آئے گی؟" کمال معصومیت سے پوچھتے اس نے آنکھیں پٹپٹائیں انداز چھیڑنے والا تھا۔

"وہ گاڑی تمہاری ہے ناں؟" واصف نے گلاس وال سے نظر آتی گاڑی کی طرف اشارا کیا۔ اذلان نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے واصف کو گھورا۔

"ہاں ہے تو؟"

"تو اتنی بڑی گاڑی کے مالک ہوتے ہوئے تم اس ٹیکسی میں کرائے بھرنے والے غریب سے بل پے کرواؤ گے تو تمہیں شرم نہیں آئے گی۔" اذلان نے اس کی مصنوعی دہائیاں نظر انداز کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر کرسی کی طرف دھکیلا۔

"بند کرو یہ مسخریاں اور وہ اتنی بڑی گاڑی میری نہیں بلکہ میرے باپ کی ہے۔"

"تو، باپ تو پھر وہ تمہارے ہی ہیں ناں، باپ بیٹے میں کیا تیری میری؟"

"شٹ اپ واصف!" اذلان نے ویٹر کو اس کی پسندیدہ ڈشز آڈر کرتے ہوئے اسے گھورا۔

"ویسے نا۔" ویٹر کے جاتے ہی وہ دوبارہ واصف کی طرف متوجہ ہوا جو ہال میں یہاں وہاں نگاہیں دوڑا رہا تھا، پھر سے اذلان کی طرف متوجہ ہوا۔

"ریحان بھائی کے ساتھ تم بھی دو بول پڑھوا لو ... واہ مجنوں بنے پھر رہے ہو۔"

"اذلان!" واصف اس کی تجویز پر بدکا۔ "شرم کرو یار میں اور ریحان بھائی کے ساتھ استغفراللہ۔" اس نے جھرجھری لیتے کانوں کی لویں چھوئیں اذلان نے حیرت اور نا سمجھی سے اس کا ردعمل دیکھا پھر سمجھ میں آنے پر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ جہاں تک اس کی آواز گئی تھی تقریباً سبھی نے اس کی طرف دیکھا تھا جبکہ واصف تو مبہوت رہ گیا تھا۔

"یار تمہاری ہنسی کس قدر خوب صورت ہے، لڑکیاں تو پروانے کی طرح پٹ پٹ نثار ہوتی ہوں گی۔" دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھے اس کا اشتیاق سے بھرپور تھا، اذلان نے بامشکل ہنسی کنٹرول کرتے اسے گھورا۔

"ویسے میری تعریف کرنے سے یہ اچھا نہیں کہ تم ضحیٰ کی تعریف کرو تو ہو سکتا ہے کچھ کام بن جائے، لڑکیاں تو یوں بھی اپنی تعریف ہی سنتے پھول کر کپا ہو جاتی ہیں۔" واصف کے لبوں کو بے ساختہ مسکان چھو گئی۔

"تم کہہ سکتے ہو کیونکہ تم ضحیٰ اظہار کو نہیں جانتے وہ تعریف سن کر پھولنے کے بجائے میرا سر پھوڑنا پسند کرے گی۔" اور اس بات پر دونوں ہی ہنس دیے تھے۔

☆☆☆

اذلان احمد لاشاری، عثمان اور صوفیہ لاشاری کی اکلوتی اولاد تھا۔ جس کی دو خالائیں اور ایک ماموں تھے، صوفیہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں، ان کے بھائی کی دو بیٹیاں شادی شدہ تھیں تو بہن کے بیٹے بھی شادی شدہ تھے جبکہ صوفیہ سے بڑی ارما تھیں ان کی دو بیٹیاں تھیں ضحیٰ اور نمرہ، ان کے شوہر اظہار جن کی اپنے ہم زلف عمران سے شروع سے ہی ان بن تھی، ارما اور شائستہ (آپا) دونوں اپنے میاؤں کے درمیان چلتی سرد جنگ سے بخوبی آگاہ تھیں، ایک دوسرے کے ہاں جانا صرف غمی میں ہوتا خوشی کے موقع پر تو وہ کھڑے کھڑے ہی اگلے پر احسان کرتے ماں باپ تو تھے نہیں۔ تینوں بہنوں کے لیے فاروق بھائی کا گھر ہی میکہ تھا خوش قسمتی سے رقیہ بھابھی (ان کی ماموں زاد بھی تھیں) بھی اچھی عادات کی مالک تھیں۔ نندوں کے آنے جانے پر کبھی ماتھے پر شکن تک نہ لائی تھیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میکے کے مان کا احساس فاروق سے زیادہ رقیہ بھابھی سے محسوس ہوتا ان کے بڑے بیٹے سفیان کی شادی شائستہ آپا کی نور سے ہوئی تھی جبکہ ریحان کا رشتہ غیروں میں ہوا تھا، جس کی شادی کی تیاریاں تقریباً مکمل تھیں، عثمان لاشاری فنانشلی کافی اسٹرونگ فیملی سے تعلق رکھتے تھے ان کی اپنی زمینیں اور چلتا کاروبار تھا جبکہ صوفیہ کے میکے میں تقریباً سبھی لوگ ملازمت پیشہ تھے۔ عثمان اکلوتے بیٹے تھے اور اذان ان کی اکلوتی اولاد تھا، عثمان طبیعتاً صلح جو اور نرم مزاج کے انسان تھے، شائستہ آپا کا چھوٹا بیٹا واصف تھا جو اظہار احمد کی بیٹی کو پسند کرتا تھا لیکن اپنے باپ اور خالو کی وجہ سے وہ سوائے اذلان کے اپنی فیلنگز کسی سے شیئر نہیں کر پا رہا تھا۔ جبکہ اذلان لاشاری کی طرف راوی فی الحال چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"یار آپ لوگ سنبھال نہیں سکتے اپنے نمونوں کو۔" واصف نور آپا کے دو سالہ بیٹے کو گردن سے دبوچے لاؤنج میں آیا۔ وہ سخت جھنجھلایا لگتا تھا، نور نے دہل کر بیٹے کو گود میں لیتے چوما۔

"اللہ پوچھے تم سے واصف!" نور نے اسے گھورا جبکہ باقی لوگ بھی، ملامتی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں مجھے ہی پوچھے اللہ۔" اس نے بھی جواباً بہن کو گھورا۔ "آپ لوگوں کو کچھ نہ سنا جائے نہ پوچھا جائے۔" وہ خفگی سے کہتے ہوئے دھپ سے اذلان کے پہلو میں بیٹھا پھر سب کو اپنی طرف دیکھتا پا کر جوابی گھوری سے سب کو نوازا۔

"اتنی خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھنے کا

مطلب؟ شرم نہیں آتی تمہیں کیسے بچے کو قصائیوں کی طرح دبوچ رکھا تھا۔" سفیان نے اب کے اسے لتاڑا۔

"یہ دیکھیں بھائی!" اس نے کھٹاک سے دونوں ہاتھ سفیان کے سامنے جوڑتے ہوئے پیشانی سے ٹکائے۔ "مجھے تو بخش ہی دیں آپ لوگ میری آپیاں بھابھیاں تو یہاں آ کر اپنے نالائق بچوں سے غافل ہی ہو گئی ہیں پورا دن میرا سر کھاتے ہیں یہ بدتمیز بچے۔" اس نے لاؤنج کے دروازے میں کھڑے آٹھ سے دو سال کی عمر کے پانچ بچوں کو گھورا، جو معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے اسے ہی دیکھ رہے تھے جبکہ چھوٹا تھوڑی دیر قبل والا تشدد بھلائے پھر سے اس کی طرف لپک رہا تھا جسے نور بامشکل سنبھال رہی تھی۔

"جلد نبٹے شادی اور جائیں اپنے گھروں کو آپ سب۔"

"واصف۔" نور نے صدمے سے اسے دیکھا۔ "تم اتنے تنگ آ چکے ہو ہم سے۔"

"تصحیح کر لیں، آپ سے نہیں آپ کے سپوتوں سے۔ یا اللہ! ایک معتبر ادارے کا کرائم رپورٹر بچے سنبھال رہا ہے۔" اس کی دہائی سب کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

"وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے پورے ہفتے کی چھٹی اپلائی کی اور نجانے میرے کھڑوس باس کو کیا سوجھی اس چھٹی کو منظور کرنے کی۔" اس کی دہائیاں جاری تھیں جب وہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے، اس نے رک کر سب کو ہنستے دیکھا پھر خود بھی مسکرا دیا۔

"یار۔ اس میں ان معصوموں کا کیا قصور تمہاری شکل بھی تو ان کی اماؤں سے ملتی ہے۔" ازلان نے مسکراتے ہوئے فضہ کی تین سالہ بیٹی کو گود میں بٹھاتے نرمی سے اس کی پیشانی چومی۔

"چھوڑو اس بحث کو۔" فضہ نے ٹوکا۔ "کل بات ہوئی تھی میری خالہ سے وہ کہہ رہی تھیں ضحیٰ اور عزہ آج آئیں گی ادھر، لیکن میں سوچ رہی ہوں۔ ہم لوگ تیار ہیں شاپنگ پر جانے کے لیے پر ضحیٰ نے بھی جانا ہے تو تم لوگوں میں سے کون ہمیں خالہ کی طرف ڈراپ کرے گا۔" اس نے باری باری چاروں لڑکوں کو دیکھا۔

"واصف جائے گا آپی۔" اس سے قبل کہ کوئی کچھ کہتا، ازلان نے فوراً واصف کی طرف اشارہ کیا۔

سفیان نے بغور ازلان کی عجلت اور واصف کے چہرے کے رنگوں کو ملاحظہ کیا۔ لیکن برا ہوا کہ اسی وقت فاروق نے ریحان کو لڑکیوں کے ساتھ بھیج دیا کہ واصف دو روز سے یہی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ ماسوائے نور کے سب ہی چلی گئیں۔

"واصف سیرت کا سناؤ کیسی ہے وہ؟" نور کے لہجے میں اشتیاق در آیا۔ جبکہ سفیان نے بھی اس کی طرف رخ موڑا۔ (دونوں میاں بیوی اس کے مداح تھے البتہ ازلان صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔)

"کس لحاظ سے پوچھ رہی ہیں؟ شکل یا کام؟"

"دونوں ہی لحاظ سے۔" نور اور سفیان نے بیک وقت کہا تو ازلان اور واصف مسکرا دیے۔

"یار میں اکثر اس کے کالمز پڑھتا ہوں، سننے میں تو یہ بھی آ رہا ہے کہ اسے پرائم ٹائم شو کے لیے بلایا جا رہا ہے۔" سفیان اب سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"جی، بلایا تو جا رہا ہے اور اس کا ارادہ بھی ہے ابھی الیکشن کا موسم آنے والا ہے اس کے بعد ہی کچھ ہوگا۔"

"واصف! تم اسے سمجھاؤ وہ جن لوگوں کے بارے میں لکھ رہی ہے وہ بہت طاقتور ہیں۔ لڑکیوں کے لیے ایسے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔" نور نے تشویش سے کہا۔ ازلان نے سنجیدگی سے واصف کی طرف دیکھا جو فلور کشن پر بیٹھا سنجیدہ تھا۔

"آپ کو لگتا ہے اسے نہیں سمجھایا ہوگا کسی نے۔" اس نے رخ موڑ کر نور کو دیکھا۔ "لیکن بات یہ ہے کہ یہ نڈر انداز اسے ورثے میں ملا ہے ایڈووکیٹ جنرل عبدالمنان صاحب کو جانتے ہیں نا آپ لوگ؟ وہی جنہوں نے داور ملک کے خلاف کیس لڑا تھا۔"

سفیان کے کہنے پر اس نے سر ہلایا، سفیان نے متاسف نگاہیں واصف کے چہرے پر جمائیں۔ "اور

انہیں سوا دو سال قبل عدالت کے احاطے میں شہید کر دیا گیا تھا؟"

"جی وہی عبدالمنان صاحب سیرت انہی کی صاحبزادی ہے۔"

"اوہ۔" سفیان اور ازلان کے منہ سے بیک وقت اوہ...... نکلا۔

"تم کبھی ملواؤ نا ہم سے، شادی میں انوائیٹ کیا ہے تم نے اسے؟"

"کیا تو ہے آپا!" واصف اٹھ کر ازلان کے برابر بیٹھ گیا۔ "مگر اس نے آنے سے معذرت کر لی ہے کیونکہ چھٹی منظور نہیں ہوئی جبکہ احسن بھائی بھی [illegible] کے لیے شہر سے باہر ہیں۔"

"تو بتاؤ دوستو اگر کسی کو دعاؤں کی ضرورت ہے تو بندہ آج موڈ میں ہے دعا کر دے گا۔" نور کے اٹھتے ہی سفیان نے پاؤں سامنے میز پر پھیلاتے ریموٹ اٹھایا انداز شاہانہ تھا۔ "بتاؤ ازلان کیا مانگوں تمہارے لیے؟"

"آپ کی دعاؤں کا شکریہ فی الحال مجھے جو بھی چاہیے ہوگا میں خود مانگ لوں گا اللہ تعالیٰ سے۔" ازلان اور سفیان کی نگاہیں واصف کی طرف اٹھیں۔

"ایسے مشکوک نظروں سے کیوں دیکھا جا رہا ہے مجھے؟" اس نے سفیان سے پوچھا۔

"چلو شاباش واصف اب رٹو طوطے کی طرح فوراً سے اپنا حال دل بیان کر دو۔"

"کک...... کیا حال دل۔" واصف ہکلایا جبکہ ازلان محظوظ انداز میں مسکرایا۔

"بہت اچھے اب یاروں سے استادیاں۔" سفیان نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔ "تم انسانوں کی طرح بتاؤ گے یا میں صاف لفظوں میں نام لے کر پوچھوں تو تب ہی کچھ بتاؤ گے۔"

"کس کا نام؟" اس نے ٹالنے کی کوشش کی مگر سامنے سفیان فاروق تھا۔ سب اگلوا کر ہی دم لیا تھا چند لمحوں کے لیے وہاں خاموشی چھا گئی، جسے سفیان نے توڑا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

بساطِ دل
بھی عجب شے ہے
افشاں آفریدی
قیمت -/400 روپے

فصلِ غم کا گوشوارہ
رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

گلِ کہسار
فرح بخاری
قیمت -/400 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”تواب تم کیا چاہتے ہو۔“ وہ سنجیدہ تھا۔
”دعا کرو خالہ مان جائیں۔“
”خالہ تو مان ہی جائیں گی بیٹا! اگر ان کے شوہر نامدار کا کچھ کہہ نہیں سکتے۔“ اذلان نے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔
”اور صرف دعا سے کام نہیں بننے والا کوئی قدم بھی اٹھانا ہوگا۔“
”یار بابا اور خالو تو ایک دوسرے کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتے۔“ وہ متفکر تھا۔
”تو کوشش کرو دونوں کے اختلافات ختم کرانے کی، کوئی تو وجہ ہوگی۔ اسے ڈھونڈو۔“ سفیان کے مشورے پر وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔
”میں، میں کیا کرسکتا ہوں۔“ اس کے لہجے سے جھلکتی بے بسی پر اذلان نے دانت پیسے جبکہ سفیان کچھ سوچ رہا تھا۔
”تمہارے بھوسے بھرے ذہن کو زنگ لگ چکا ہے واصف عمران۔“ اذلان کے جڑا بھینچے تبصرے پر سفیان چونک کر حواسوں میں لوٹا۔
”تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں اذلان!“ وہ روہانسا ہوا۔
”لعنت ہے تم پہ اتنے بڑے ادارے میں نجانے تمہیں ملازمت کیسے مل گئی؟“
”مجھے تو لگتا ہے وہاں صرف جھک مارنے جاتے ہو۔“
”ٹھیک ہے اگر مجھ پر لعنت ہے تو تم دوست ہو میرے، تم دونوں پر بھی لعنت ہو۔“ واصف نے بھی چبا چبا کر کہا۔
”یہ بھی خوب کہی اب تمہاری دوستی میں مجھے بھی ناکردہ گناہوں کی سزا ملے گی۔“ اذلان آج جارحانہ موڈ میں تھا۔ ”ہاتھ پر ہاتھ تو دھرے تم بیٹھو اور لعنت ہو مجھ پر کیا خوب فلسفہ ہے۔“
”اگر میں کچھ نہیں کر رہا تو تم ہی کر دو تین تین رشتے ہیں مجھ سے تمہارے۔“ واصف نے بھی دوبدو جواب دیا۔ ”تم تو بڑے چمچے بنتے ہو اظہار انکل کے تو ان کی بابا سے صلح بھی کروا دو۔“ واصف نے اسے جوش دلایا۔
”ٹھیک ہے اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“ وہ جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گیا جبکہ واصف کے مطمئن انداز کو سفیان نے حیرت سے دیکھا تھا کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اذلان نے اگر کہا تھا تو واقعی کچھ کرنے والا تھا۔

☆☆☆

”تمہارے لیے ایک آفر ہے میرے پاس۔“ وہ میز پر صفحات پھیلائے بری طرح مصروف تھی جب واصف نے میز پر انگلی سے ناک کرتے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
”اور وہ آفر کیا ہے؟“ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے صفحات سمیٹتے مصروف سے انداز میں پوچھا۔
”میں ڈیڑھ روز کی چھٹی پر جارہا ہوں۔“ سیرت نے بے ساختہ سر اٹھا کر واصف کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھا۔
”کم آن واصف! ابھی ہفتہ قبل تم نے اپنے کزن کی شادی کے سلسلے میں پورے ہفتے کی چھٹی لی تھی نجانے وقار صاحب اتنے دیالو کیسے ہوگئے ہیں کہ تمہاری اتنی چھٹیاں منظور کیے جارہے ہیں۔ اور تمہاری چھٹی کے ساتھ میرا کیا لینا دینا......؟“ اس نان اسٹاپ بولتی لڑکی پر واصف نے ایک افسوس بھری نگاہ ڈالی۔
”اب ایسے دیکھنے کا مطلب؟“
”پہلے کسی کی پوری بات سن لیتے ہیں سیرت عبدالمنان۔“ وہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھا اور لائٹ پرپل سوٹ میں ملبوس اس لڑکی کو گھورا۔ جس کا شیفون کا دوپٹہ سلیقے سے شانے پر پن تھا، فرنچ چٹیا میں گندھے بال، ڈائمنڈ ٹاپس پہنے وہ لڑکی سادہ سے حلیے میں بھی اپنے اندر عجیب ہی اٹریکشن رکھتی تھی، صاف اور دوٹوک انداز مقابل کو اپنی حد میں رہنے کی گویا وارننگ دیتا تھا۔ واصف عمران وہ واحد مرد کولیگ تھا جو اس سے بے تکلف تھا۔ وہ بھی اپنی کوششوں سے اس کے قریب ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ اول روز سے اپنے لیے احترام کا جذبہ دیکھ چکی تھی۔

”میڈم! آج کے لیے مجھے صرف ایک آرٹیکل دینا تھا وہ میں دے چکا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے صبح اتوار ہے، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو اس مبارک دن پورا پاکستان چھٹی کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔“ سیرت کے لبوں کو بے ساختہ مسکان چھو گئی۔ صفحات پر پیپر ویٹ رکھتے وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
”اور تمہارے لیے آفر یہ ہے کہ کل میں داور ملک کے گاؤں جارہا ہوں۔“ سیرت کی مسکراہٹ سمٹی وہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔ ”سنی داور سے ملنے بہت مشکل سے وہ ملنے پر رضامند ہوا ہے پہلے تو اکیلے ارادہ تھا پھر سوچا تم سے بھی پوچھ لوں چلو گی؟“
”آف کورس چلوں گی میں۔“
”آپی جانے دیں گی تمہیں؟“
”انہیں میں منالوں گی، جانا کس وقت ہے۔“
”کل دس بجے تک تیار ہو جانا میں تمہیں پک کرلوں گا۔“ واصف کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

☆☆☆

”کیا تم بردکھوے کے لیے جارہے ہو؟“ اگلے روز مقررہ وقت پر جب وہ اس کی گرے ہونڈا میں بیٹھی تو حیرت سے پوچھا۔
ڈریس پینٹ سفید براق شرٹ جیل سے سیٹ کیے بال، کلین شیو وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔ سیرت کے سوال پر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ سی گرین اے لائن شرٹ کے دامن پر ہلکی سی بیل کڑھی تھی جبکہ آستین شیفون کی تھی سادہ چٹیا لیکن آج ہونٹوں پر لپ اسٹک نظر آرہی تھی۔
”اب میں سیرت عبدالمنان تو ہوں نہیں کہ سادگی میں بھی غضب ڈھاؤں، میں بے چارہ عام سا بندہ اتنے اہم بندے سے ملنے جارہا ہوں تو اتنی تیاری تو بنتی تھی۔“ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔
”اف! نجانے تمہیں دوسروں کی تعریفیں کرنے کا اتنا خبط کیوں ہے۔“ سیرت نے جھنجھلا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کردیا۔ تقریباً سوا گھنٹہ بعد گاڑی کچے پکے راستوں سے ہوتی ہوئی دیوہیکل سلیٹی رنگ گیٹ کے سامنے رکی واصف نے ہارن دیا تو اندر سے گن کندھے پر لٹکائے تیزی سے گیٹ کھولتے ایک شخص باہر آیا۔
”سائیں حکم؟“ وہ واصف کی طرف والی کھڑکی پر جھکا۔ سیرت نے دیکھا وہ چھ فٹ کے قریب قد، گندمی رنگت والا شخص مضبوط قد کاٹھ کا مالک تھا براؤن شلوار سوٹ میں چہرے پر متانت و سنجیدگی تھی۔ واصف اس کی طرف متوجہ ہوا۔
”ہمیں سنی داور سے ملنا ہے۔“
”کیا آپ اخبار کے دفتر سے ہیں؟“ پوچھا تو واصف سے تھا لیکن نگاہیں سیرت پر جمی تھیں، جس کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے تھے، جسے دیکھتے اس شخص نے فوراً نگاہوں کا زاویہ بدلا۔ واصف کے سر ہلانے پر وہ ایک طرف ہوا۔
”آیئے سائیں! آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ دونوں اس کی معیت میں گیٹ سے اندر آئے، سرخ اینٹوں کی لمبی روش کے دائیں بائیں گھاس کے قطعات تھے، وہ انہیں لیے ہال نما کمرے میں داخل ہوا جس میں بیش قیمت فرنیچر مالکان کے اعلیٰ ذوق اور امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ واصف نے سرسری نگاہ اطراف میں ڈالی۔ دیواروں پر خطاطی اور مختلف ثقافتی مناظر کی عکاسی کرتی پینٹنگز لگی تھیں۔ سیرت کی آنکھوں میں ستائش ابھری، ماحول میں تازہ پینٹ کی خوشبو چکراتی پھر رہی تھی۔
”پہلے بات کرو اگر نہ مانیں تو ٹھکانے لگا دو۔“ گمبھیر مردانہ خوب صورت لب و لہجے نے سیرت کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ کوئی بولتے ہوئے اسی طرف آرہا تھا۔
”مسئلہ نہیں ہے آگے میں خود سنبھال لوں گا۔“ وہ دہلیز پھلانگتے اندر داخل ہوا، سیرت جھٹکے سے اٹھ کر پلٹی۔
مثل مشہور ہے پلٹ کر دیکھنے والے پتھر ہو جاتے ہیں۔ تو پلٹنے والی سیرت عبدالمنان بھی پتھر ہوگئی تھی۔ جبکہ سیل کان سے لگائے مقابل بھی اپنی بات بھول چکا تھا۔ نازک سی لڑکی پر نگاہیں جمائے اس

کا فون والا ہاتھ مکینکی انداز میں پہلو میں نیچے آیا تھا۔ سیرت نے چھ فٹ کے قد و سراپا کے مالک اس انتہائی پرکشش چہرے کو دیکھا جو اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا، لیکن وہ صرف لمحوں کی بات تھی۔ دونوں سیکنڈز میں اپنی فیلنگز پر قابو پا چکے تھے۔ واصف بھی آنے والے کو دیکھ کر کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم! سر۔''

''وعلیکم السلام، کیسے ہیں آپ واصف؟'' اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''اور اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ سیرت فاطمہ ہیں؟'' واصف کا ہاتھ تھامے ہی سیرت سے مخاطب ہوا تو واصف مسکرا دیا۔ جبکہ سیرت نے ناگواری سے اس کے دمکتے چہرے کو دیکھا۔

''تصحیح کر لیجیے میرا نام سیرت عبدالمنان ہے۔''

''لیکن مجھے تو سیرت فاطمہ ہی پسند ہے۔'' اس کے مقابل رشک اطمینان پر جہاں وہ چند پل کے لیے ساکت ہوئی، وہیں واصف نے بامشکل مسکراہٹ چھپائی۔ ''پلیز تشریف رکھیں آپ۔'' شہانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ سیرت کے مقابل صوفے پر بیٹھا۔ ''کیا لیں گے آپ لوگ؟''

''کچھ نہیں۔'' واصف سے قبل ہی سیرت نے انکار کر دیا۔ اس بار وہ سنجیدگی سے سیرت کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''آپ میری مہمان ہیں۔''

''میں نہیں صرف واصف آپ کا مہمان ہے۔ میں آپ جیسے لوگوں کی مہمان بننا پسند نہیں کرتی۔'' واصف نے لب بھینچے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔

''ویل آپ پسند نہ بھی کریں تو پھر بھی یہاں موجود تو ہیں۔'' اس کی بات میں وزن تھا، سیرت چند لمحوں کے لیے چپ رہ گئی۔

''اٹس او کے سر! آپ نے وقت دیا یہ ہی بہت ہے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔'' واصف نے ماحول کی کشیدگی کم کرنے کی شعوری کوشش کی۔

''میں نے تو وقت دیا تھا مگر آپ تاخیر سے پہنچے، واصف آپ کو دیے پندرہ منٹ ختم ہو چکے۔'' سنجیدگی سے کہتے ہو سیرت کے عمل کا ردعمل دے رہا تھا وہ سمجھ رہی تھی۔ اسی لیے بھرپور خفگی سے نگاہوں کا زاویہ موڑ لیا۔

''واصف! معذرت خواہ ہوں مجھے واقعی کام سے جانا ہے، شہر آنا جانا رہتا ہے ان شاء اللہ وہاں ملاقات ہو گی۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھا تو دونوں ہی اس کی تقلید میں اٹھے۔ واصف نے بنا برا منائے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ جبکہ وہ تین قدم چلتے سیرت کے عین سامنے آ رکا، نگاہوں نے دیوانہ وار اس کے چہرے کا طواف کیا۔ اس کی نگاہوں کی تپش اتنی پر اثر تو تھی کہ سیرت کی نگاہیں لرز کر جھک گئیں۔

''سیرت فاطمہ!'' لہجے میں نرمی اپنائیت محبت کے بھی رنگ تھے۔

''جی۔'' سیرت نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے گویا اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔

''لمبی باتوں سے مجھے کوئی مطلب نہیں مجھے تو ان کا جی کہنا بھی کمال لگتا ہے۔'' مقابل کے لبوں پر دلکش مسکان چھوٹے سے جی سے چمکی تھی۔

''آپ سے مل کر بہت اچھا لگا، روبرو آپ سے پہلی ملاقات ہے۔ کافی اچھا اور کھرا لکھتی ہیں آپ۔'' سیرت ایک دم گویا ٹرانس کی سی کیفیت سے آزاد ہوئی۔

وہ کس انسان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے لگی تھی وہ اس کے باپ کے قاتل کا بیٹا تھا، اس کا چہرہ شدت جذبات سے گلابی ہو گیا مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

''لیکن قلم کی تلخی کو تھوڑا سا کم کریں خود اعتمادی اور نڈر انداز قابل تعریف ہی سہی مگر بعض اوقات آپ کے لیے مشکلات کا باعث بھی بن جاتا ہے۔''

''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟''

''جو آپ سمجھنا چاہیں۔'' سیرت کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھتے ہوئے اس نے شان بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''او کے سنی داور صاحب پھر ملاقات ہو گی۔'' ماحول میں بڑھتی کشیدگی محسوس کر کے واصف کو مداخلت کرنا پڑی۔

''او کے مگر ایک بات ذہن نشین کر لیں۔ آپ لوگ یہاں سے باہر اگر کبھی سر راہ آپ سے ملاقات ہو تو آپ مجھے نہیں پہچانتے خاص طور پر سیرت فاطمہ آپ۔''

''ایکسکیوزمی میرا نام سیرت عبدالمنان ہے۔'' اس نے دانت کچکچائے۔

''دیکھیں مس عبدالمنان میں کرتا وہی ہوں جو میرا دل چاہتا ہے، آپ بار بار میری تصحیح کر کے خواہ مخواہ اپنی انرجی ویسٹ کرتی ہیں۔''

''سر گاڑی تیار ہے۔'' بندوق والا شخص ادب سے کہتے ہوئے ایک طرف ہوا، واصف بھی سنی داور کے ہم قدم ہوا جبکہ سیرت چند قدم ان سے پیچھے تھی۔

☆☆☆

''اس بار کسے ووٹ دینے کا ارادہ ہے سر؟'' واصف کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ وہ مسکرایا۔ ''شاید نہیں یقیناً اپنے والد صاحب کو۔'' وہ چلتے ہوئے لینڈ کروز کے پاس آ رکے جس کا ڈرائیونگ دروازہ کھلا تھا۔

''او کے واصف! زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو گی۔''

وائٹ کاٹن کے کڑکڑاتے شلوار کرتا پشاوری چپل، سلیقے سے جمے سلکی بال وجیہہ چہرے پر متانت و سنجیدگی لیے وہ فیوڈل لارڈ واصف سے مخاطب تھا پھر نگاہ موڑ کر چند قدم کے فاصلے پر موجود سیرت کی طرف متوجہ ہوا جو انہیں نظر انداز کیے بے مقصد یہاں وہاں نگاہیں دوڑا رہی تھی۔ اس کی بے نیازی پر وہ ایک پل کے لیے مسکرایا، کیونکہ سیرت کی شعوری بے نیازی کو وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور اس کا توڑ بھی اس کے پاس تھا۔

''او کے سیرت فاطمہ!'' سیرت نے جھٹکے سے رخ اس کی طرف موڑا لیکن تصحیح کرنا فضول تھا جبکہ وہ مزید گویا ہوا۔ ''آپ سے مل کر بہت اچھا لگا بلکہ خوشی ہوئی۔'' ڈارک گلاسز نے آنکھوں کے تاثرات چھپا لیے تھے۔

''لیکن مجھے نہ تو آپ سے مل کر اچھا لگا ہے اور نہ ہی کوئی خوشی ہوئی ہے۔'' اس کے جارحانہ انداز پر واصف نے خفگی سے گھورا لیکن داور نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھتے سر قدرے خم کیا۔ پھر ہاتھ ہلاتے گاڑی میں سوار ہو گیا۔

گاؤں کی حدود سے نکلنے تک سنی داور کی سینڈ کروزران کے تعاقب میں رہی پھر وہ بائیں جانب شہر جانے والے راستے کی طرف مڑ گئے۔ واصف نے نگاہ موڑ کر سیرت کی طرف دیکھا جو بھاگتے دوڑتے مناظر میں کھوئی تھی۔

''تمہیں اس قدر روڈ نہیں ہونا چاہیے تھا سیرت۔'' واصف کے از حد سنجیدگی سے کہنے پر سیرت نے رخ موڑا۔

''تم جانتے ہو نا، مجھ سے مغرور اور خود پسند لوگ بالکل برداشت نہیں ہوتے۔'' لہجہ دھیما صفائی دیتا ہوا تھا۔

''کبھی کبھی ہمیں اپنے مزاج کے خلاف چیزوں، رویوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے سیرت!'' واصف کا انداز سمجھانے والا تھا۔ سیرت نے سر جھکائے ہاتھوں پر نگاہ جمائی تو واصف کچھ سوچ کر مسکرا دیا۔

''سو گاؤں آنے کا تجربہ کیسا رہا سیرت فاطمہ!'' واصف کے انداز تخاطب پر وہ بے ساختہ اس کی طرف متوجہ ہوئی نگاہوں میں خفگی — کا تاثر تھا۔

''ویسے تم مانوں یا نہ مانوں مگر اس کے منہ سے سیرت فاطمہ جچ رہا تھا۔'' اور اس بار وہ نا چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی تھی کیونکہ اس تبصرے میں شک کی گنجائش نہیں تھی۔

☆☆☆

''سننے میں آیا ہے، پچھلے دنوں گاؤں میں اخبار والے آئے تھے۔'' داور ملک نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے بیٹے کے تاثرات جانچے۔ جہاں صاف لکھا تھا وہ ان کی معلومات پر حیران ہے اور یہی حیرت اس کے جملے سے بھی ظاہر تھی۔

"آپ کو کس نے بتایا بابا سائیں؟" داور ملک نے ملامتی نگاہوں سے اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھا۔

"جو بات تمہیں مجھے بتانی چاہیے تھی وہ میں تمہیں بتا رہا ہوں، حد ہے تم کہیں پردیس ملک میں بیٹھے ہو جسے یہاں کے حالات کی خیر خبر ہی نہیں۔"

"آئم سوری بابا سائیں۔" وہ فوراً سنبھل کر معذرت کرنے لگا۔ جانتا تھا وہ اصول پرست اور ایک حد تک سفاک انسان بھی تھے، جو اصولوں کی خلاف ورزی کی صورت میں اولاد تک کو نہیں بخشتے تھے اور اصول بھی وہ جو سراسر ان کے اپنے وضع کردہ تھے۔

"معلوم کرو وہ یہاں کس لیے آئے تھے۔" داور کہتے ہوئے اٹھے تو وہ بھی ساتھ ہی اٹھا۔

"میں کرتا ہوں بابا سائیں۔"

"یہی تم سب کے حق میں بہتر ہوگا۔"

☆☆☆

اس روز اتوار تھا، سیرت حمزہ کے ساتھ آئسکریم پارلر آئی تھی۔ آپی احسن بھائی کے ساتھ احسن کے دوست کی شادی میں شرکت کے لیے گئی تھیں۔

"آپ کو معلوم ہے آنی! جواد ہے نا اس کے گھر چھوٹی سی گڑیا بھی ہے۔" سیرت اسے کرسی پر بٹھا کے سامنے بیٹھی تو حمزہ کے بتانے پر مسکرا دی۔

"میں نے دیکھا اسے آنی! وہ بہت سافٹ اور کیوٹ ہے۔" وہ پوری طرح حمزہ کی طرف متوجہ دلچسپی سے اس کی باتیں سنتے مسکرا رہی تھی، تبھی چابی کی مدد سے ٹیبل بجائی گئی تو وہ چونک کر متوجہ ہوئی اور مقابل کو دیکھتے ہی جھٹکے سے اٹھی۔

"آپ......!" جینز کیمل کلر شرٹ کے کف فولڈ کیے سنی داور اس کے سامنے تھا۔ سیرت کی اس درجہ حیرت پر محظوظ ہوتے ہوئے سر خم کیا۔ حمزہ دلچسپی سے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ جمائے آنے والے کو دیکھ رہا تھا۔

"میں کسی کام سے آیا تھا ادھر، آپ کو دیکھا تو سوچا مل لوں، آپ کیسے ہو ہینڈسم؟" سیرت سے کہتے ہوئے حمزہ کے بال سہلائے۔

"فائن۔" حمزہ کے یک لفظی جواب پر سر ہلاتے ہوئے پھر سے سیرت کی طرف متوجہ ہوا جو مشکوک نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"آپ کیسی ہیں سیرت فاطمہ! اور مشکوک نظروں سے مت دیکھیں۔ میں اتنا فارغ انسان بھی نہیں ہوں کہ سب کام چھوڑ کر آپ کو فالو کرتا پھروں، بائے چانس ملاقات ہے یہ۔" وہ سیرت کی طرف متوجہ تھا جب حمزہ نے اس کا ہاتھ ہلا کر اپنی طرف توجہ مبذول کروائی۔

"ایک بات بتاؤں انکل؟"

"جی بالکل بتایئے۔" سیرت دانت پیستے ہوئے کرسی پر بیٹھی۔

"آپ بہت کیوٹ ہیں۔"

"ارے۔" وہ اس قدر سچی اور بے ساختہ تعریف پر ہنس دیا۔ سیرت نے خفگی سے رخ موڑ کر شیشے کی دیوار سے باہر دیکھنا شروع کر دیا جبکہ وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"کتنا کیوٹ؟" اس بار لہجے میں دلچسپی کا عنصر نمایاں تھا۔

"اوں۔" حمزہ نے سنی کے بعد سیرت کی طرف دیکھا۔

"آنی جتنے۔" سیرت نے گلابی چہرے سے حمزہ کو گھورا جبکہ وہ اس کے تاثرات سے محظوظ ہوتا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"یہ تو زیادتی ہے یار! میں آپ کی آنی سے زیادہ کیوٹ ہوں۔" انداز سراسر سیرت کو چڑانے والا تھا اور وہ چڑ بھی گئی۔ جارحانہ انداز میں اٹھتے حمزہ کو بازو سے دبوچ کر کرسی سے اتارا، وہ بھی ساتھ اٹھا مسکراہٹ سمٹ چکی تھی۔

"آرام سے، میرا غصہ بچے پر کیوں اتار رہی ہیں؟" سیرت جو حمزہ کو زبردستی گھسیٹتی چل رہی تھی سنجیدہ انداز پر پلٹی تو نگاہوں میں سلگتی کیفیت تھی۔

"مسٹر ملک مجھ میں اتنی ہمت تو ہے کہ جس پر غصہ ہو اس پر نکالوں بھی۔" اس نے سیرت کا سرخ پڑتا چہرہ بغور دیکھا، جبکہ وہ اب بازو سینے پر لپیٹے پوری طرح دو دو ہاتھ کرنے کے موڈ میں تھی۔

"اگر آپ کی یادداشت کمزور ہے تو میں یاد دلاؤں آپ کو کہ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو نہیں پہچانتا پھر اب خود کیوں یہاں آئے؟" سیرت نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر حمزہ کی انگلی تھامی اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔

"وہ تو میں نے آپ کے لیے کہا تھا، میں جب چاہوں آپ کو کہیں بھی پہچان سکتا ہوں۔" نجانے سیرت کو غصہ دلا کر اس کے کون سے جذبوں کو تسکین ملتی تھی مسلسل بولتے ہوئے اس کے ہم قدم ہوا۔

"آپ کو محتاط رہنا چاہیے سیرت فاطمہ۔" گاڑی کے قریب وہ ایک دم اس کے سامنے آ رکا۔

"اور آپ کو مجھ سے دور رہنا چاہیے مسٹر ملک ناؤ پلیز لیفٹ داوے۔" چہرہ نہ جانے کس جذبے کے تحت سرخ تھا تو آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں اس کا یہ انداز دیکھتے ہوئے وہ مکینکی انداز میں سائیڈ پر ہوا۔

☆☆☆

"اذلان کہاں مصروف ہو گئے ہو یار؟" واصف نے اسے رات گئے کال کی تھی۔

"آفس جا رہا ہوں باقاعدگی سے تمہیں تو معلوم ہے بابا گاؤں گئے ہوئے ہیں۔" وہ بیڈ پر نیم دراز واصف کی کال کی طرف متوجہ تھا۔ "اور ایک سیکرٹ مشن پر بھی ہوں۔"

"انکل کب واپس آ رہے ہیں؟ سیکرٹ مشن ملنے پر پوچھوں گا۔"

"شاید کل۔" گھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے وہ چت لیٹ گیا۔ "خیریت بابا کا پوچھنے کے لیے کال کی تھی سوا دس بجے؟" اس نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے واصف کو چھیڑا۔

"یہی سمجھ لو۔" واصف مسکرایا۔ "کام ہے ان سے۔"

"مجھے بتاؤ شاید میں کر سکوں۔" بازو موڑ کر سر کے نیچے رکھا۔

"دراصل اس بار ہم لوگ الیکشن سے قبل تمام نامزد امیدواروں سے ملنے کا سوچ رہے ہیں اسی لیے سوچا بات کر لوں، انکل کے مدمقابل داور ملک ہے اور وہ خاصی مستحکم پارٹی ہے۔" واصف کے سنجیدگی سے کہنے پر اذلان بھی سنجیدہ ہوا۔

"تو تم فون پر بات کر لو۔"

"پہلے انہیں ہی کال کی تھی مگر کال مل نہیں رہی۔"

"ہاں، گاؤں میں سگنل پرابلم اکثر رہتا ہے۔ ویسے یار! میں سوچ رہا تھا بابا سے کیا جرم ہوا کہ کرائم رپورٹر ان سے ملنے آ رہے ہیں۔" واصف بے ساختہ ہنس دیا۔

"کرائم رپورٹر نہیں جناب! سیرت ملنا چاہتی ہے۔" اذلان چونکا۔ "مطلب وہ انٹرویو لینا چاہتی ہے؟"

"انٹرویو نہیں بس ان کی پریس کانفرس سے قبل چند ایک سوال پوچھنا چاہتی ہے، اس نے نمبر تو لے لیا ہے صبح رابطہ کرے گی، تم انکل سے کہہ دینا ٹائم دے دیں اسے اور ہاں یہ تو اسے بھولے سے بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میرا انکل سے کوئی ریلیشن ہے۔"

"کیوں تم کیوں چھپانا چاہتے ہو؟" اذلان کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

"وہ اس لیے کہ سیرت یہ نہ سمجھے کہ میں نے اس کی سفارش کی ہے اور دوسرا یہ کہ انکل کی مستحکم پوزیشن ہے کاروبار اور سیاست کی فیلڈ میں اور میں نہیں چاہتا مجھے ان کی وجہ سے کوئی فیور ملے۔"

"پتا ہے کیا واصف!" اذلان کا انداز پرسوچ تھا۔ "تم سیرت کے ساتھ رہتے ہوئے اس کے جیسے ہوتے جا رہے ہو۔"

"سیرت نہیں یار۔" واصف ہنسا۔

"سیرت فاطمہ۔" اس بار دونوں ہی بے ساختہ ہنسے تھے۔ "بولو اذلان کر دوں دعا پھر۔" انداز چھیڑنے

والا تھا۔

”بہت شکریہ اس آفر کا مگر میں ابھی انجوائے کرنے کے موڈ میں ہوں۔“

☆☆☆

”سیرت عبدالمنان صاحب کی بیٹی ہے بابا سائیں۔“ دو روز بعد ہی سنی نے اوطاق میں داور ملک کے سامنے معلومات دینے کا آغاز کیا۔

”عبدالمنان!“ داور ملک نے زیر لب نام دہراتے ذہن پر زور دیا۔ ”یہ نام سنا سنا سا تھا۔“ سنی نے گہری سانس لی۔

”ایڈووکیٹ جنرل عبدالمنان، جنہوں نے ہمارے خلاف کیس لڑا تھا جس کے نتیجے میں ہمیں باغ والی زمین سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔“

”اوہ......“ داور ملک مسکرائے۔

”وہی جس بے چارے کو دن دیہاڑے کسی نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ چچ......ابھی تک مجرم پکڑ نہ سکی پولیس۔“ انداز صاف مذاق اڑانے والا تھا سنی انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

”میں بھی سوچ رہا تھا وہ لڑکی کیوں ہمارے پیچھے پڑ گئی ہے بے چاری۔“

”اب کیا حکم ہے بابا سائیں؟“ سنی نے اس موضوع کو بدلنا چاہا۔

”ابھی کچھ مت کرنا الیکشن سر پر ہیں، کوئی بھی جذبات میں اٹھایا قدم ہمارے خلاف مسئلہ کھڑا کر سکتا ہے۔ مناسب وقت آنے پر اس کا بھی کچھ بندوبست کر لیتے ہیں۔“

”یعنی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں ہم۔“ وہ بدمزا ہوا۔ ”آج دبے الفاظ میں لکھا جا رہا ہے کل ببانگ دہل باقاعدہ نام لیا جائے گا، گاؤں تک تو آ ہی چکی ہے وہ۔“

”بے فکر رہو پتر! لڑکی ذات ہے کہاں تک جا سکتی ہے۔“

”آپ اس معاملے کو سنجیدہ نہیں لے رہے بابا سائیں۔“

”سنجیدہ ہی ہوں بچے۔“ انہوں نے پرسوچ انداز میں بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

”وہ لڑکا جو ساتھ تھا اس کا کیا نام ہے؟“

”واصف۔“ سنی نے لقمہ دیا۔

”ہاں وہی اس سے کچھ ڈیل کرو۔“

”ہاں۔“ وہ جھلایا واصف کرائم رپورٹر ہے اسے ڈیل آفر کرنے کا مطلب ہے آ بیل مجھے مار، جبکہ فساد کی جڑ وہ لڑکی ہے۔“

”دھیرج پتر دھیرج، اگر وہ لڑکی مزید کچھ کرے گی تو نقصان اسی کا ہوگا۔ تم تو جانتے ہو نا داور ملک سفاکی کا دوسرا نام ہے۔ وہ سبق سکھاؤں گا کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی داور ملک کو نہیں بھول سکیں گی۔“ ان کے لہجے کی سفاکی پر سنی داور بھی ساکت رہ گیا۔

☆☆☆

”بالآخر ازلان شاہ کی تقریباً ایک ماہ کی جدوجہد کے بعد دور روٹھے ہوئے انسانوں کو اپنے گھر آمنے سامنے لانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس جدوجہد میں اس نے کتنے پاپڑ بیلے تھے یہ الگ داستان تھی۔

اس روز عثمان نے تمام سسرالیوں کی ضیافت کا اہتمام کیا تھا جس میں درپردہ ازلان لاشاری کا ہاتھ تھا شائستہ خالہ، عمران انکل، ارما اور اظہار چونکہ باقی بچے شادی شدہ اور کام کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں تھے اسی لیے اس وقت لاشاری ہاؤس میں چاروں بہن بھائیوں اور ان کے شریک حیات کے علاوہ چار غیر شادی شدہ بچے تھے جن میں شائستہ آپا کا واصف، ارما کی ضحیٰ اور نمرہ کے ساتھ ان لوگوں کو ڈنر پر مدعو کرنا چاہتے تھے لیکن اظہار کو رات کسی ولیمے میں جانا تھا تو وہ اسی لیے لنچ پر اکٹھے تھے۔ کھانے کی تیاریوں میں تھے جبکہ ماسوائے واصف سب ہی لاؤنج میں تھے۔

یونہی باتوں کے دوران اظہار کی کئی بار بے ساختہ نظر گلاس وال سے لان میں مضطرب سے

واصف کی جانب اٹھی اور ایسا ہی کچھ حال عمران کا تھا جو بیسیوں بار ضحیٰ کو صوفیہ کے پہلو میں دیکھ چکے تھے۔ شاکنگ پنک دوپٹہ جس کے اطراف سلور لیس لگی تھی اوڑھے وہ بہت پیاری اور حیادار لڑکی تھی۔ انہیں ازلان کی ضحیٰ کی تعریفوں پر گویا یقین آ چکا تھا جبکہ اظہار بھی ایسی ہی نگاہوں سے واصف کو دیکھ رہے تھے کیونکہ ازلان کی برین واشنگ سے دونوں اتنا تو سمجھ ہی چکے تھے کہ ان کی اولادیں اپنے بڑوں کی ناراضی دور کر کے نئے رشتوں کی خواہاں ہیں اور اب دونوں بچوں کا جائزہ لیتے انہیں بچوں کی خواہش پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔

واصف کھانے کی میز پر بھی قدرے سنجیدہ سا تھا اظہار انکل کے سامنے تو وہ یوں بھی خاصا بھیگا بلا بن جاتا تھا۔ ازلان اس کی اس درجہ سنجیدگی اور بردباری (وہ بھی زبردستی کی) سے خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔ رائم رپورٹر صاحب کی بولتی آج متوقع سسر کے سامنے بند تھی۔ کھانے کے بعد فاروق ماموں نے ضحیٰ سے چائے کی فرمائش کی تھی اور چائے پیتے ازلان بار بار عثمان کی طرف دیکھ رہا تھا عثمان اس کی بے چینی پر مسکرائے پھر بولے تو مخاطب عمران اور اظہار تھے۔

”یار آج مجھے تو بتاؤ آخر کون سی رنجشیں پال رکھی ہیں آپ دونوں نے، ختم کریں ان دوریوں کو دیکھیں آج کتنا مبارک دن ہے کہ ہم سب یوں اکٹھے ہیں ورنہ تو مہینوں بعد آپ دونوں کو دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ چلیں اب بتائیں عمران بھائی! آپ کو کیا گلہ ہے اظہار بھائی سے۔“ عثمان لاشاری سنجیدہ ہوئے تو عمران نے اظہار کی طرف دیکھا۔ یاد کرنے پر بھی کوئی ٹھوس وجہ ناراضی ذہن میں نہیں آئی تھی۔

”تم پوچھو اس سے اس نے کبھی مجھے بڑا ہونے کے ناتے وہ عزت دی جو اس رشتے کا حق تھا۔“ عمران کی نگاہیں اظہار پر جبکہ مخاطب عثمان لاشاری تھے۔ سب کی نظریں بے ساختہ اظہار کی طرف اٹھیں۔

”اگر آپ مجھے چھوٹے بھائیوں جیسا مان دیتے تو کیا وجہ تھی کہ میں آپ سے بدگمان رہتا۔“ اظہار نے بھی انہی کے انداز میں جواب دیا۔

”بس چھوڑیں آپ لوگ گلے شکوے۔“ ازلان آگے بڑھ کر ان کے صوفے کے پیچھے کھڑا ہوا اور ان کے شانوں پر ہاتھ رکھے۔ ”جلدی سے اچھے بچوں کی طرح گلے مل لیں۔“ بس اس کا انداز دھونس بھرا تھا جو سب کو مسکرانے پر مجبور کر گیا۔

”واہ عثمان! تمہارے بیٹے نے تو ہمیں بچہ ہی بنا دیا۔“ اظہار ہنسے۔ ”تو بن جائیں نا بچے بھلا دیں ناراضیاں پتا ہے جو انسان تین دن تک اپنے مسلمان بھائی سے خفا رہے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں ان کے حساب کتاب کے کھاتے بند کر دیں۔“ ازلان آج واعظ کے موڈ میں تھا۔ ”چلیں جلدی سے گلے ملیں وہ بچپن میں ہم کیا سنتے تھے۔“ اس نے رک کر واصف کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ چٹکی بجاتے چہکا۔

”لڑائی لڑائی معاف کریں اللہ تعالیٰ کا گھر صاف کریں۔“ ”تم کس پر چلے گئے ہو یار اتنے بہادر اور سچ کے علم بردار۔“ جاتے سمے اظہار نے واصف کے شانے پر ہاتھ رکھتے خاصے دوستانہ انداز میں کہا تھا پشت پر ہاتھ باندھے واصف کو ان کے انداز پر خوش گوار حیرت ہوئی تو دل ترنگ میں دھڑکا جبکہ اظہار کن اکھیوں سے عمران کو دیکھتے مزید گویا ہوئے۔

”سنتے تو یہی رہے ہیں کہ بیٹا باپ کا پرتو ہوتا ہے مگر افسوس اب تم دیکھ لو اور سن لو عثمان۔“ عمران نے مصنوعی خفگی سے انہیں اظہار کی طرف متوجہ کیا۔

”تمیز ہے اسے کہ خود سے بڑے بھائی پر افسوس کر رہا ہے فکر نہ کرو ادھار رکھنے کا قائل تو میں بھی نہیں۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر ضحیٰ کو بائیں بازو کے حصار میں لیتے اپنے ساتھ لگایا۔ ازلان نے بمشکل یاہو کے نعرے کو دبایا۔ مگر وہ برا ماننے کے بجائے بے ساختہ ہنس دیے۔

☆☆☆

"منہ میٹھا کرو سیرت۔" واصف نے ڈبا اس کے سامنے کیا۔

"کس خوشی میں؟"

"اس کی منگنی کی خوشی میں۔" فرقان نے ہانک لگائی۔ سیرت نے ہاتھ میں پکڑا چم چم واپس رکھتے ہوئے بے یقینی سے واصف کا چہرہ دیکھا۔

"منگنی کروالی اور مٹھائی کھلا کر اعلان کر رہے ہو یہی ویلیو ہے نا ہماری لے جاؤ اسے۔" اسے غصہ آیا واصف نے پاس آتے فرقان کو پنچ دے مار اوہ کراہ کر رہ گیا۔

"بدتمیز ابلیس کے چیلے تم سے کس نے کہا میری منگنی ہوگئی ہے اور تم کس جھوٹے کی باتوں میں آرہی ہو سیرت۔"

"اگر منگنی نہیں ہوئی تو پھر منے کی مٹھائی ہے۔" فرقان نے معصوم صورت بناتے گلاب جامن اٹھایا جسے واصف نے جھپٹ لیا۔

"تم اس کے اہل ہی نہیں ہو جاؤ یہاں سے۔" فرقان ڈھٹائی سے ہنس دیا۔ پھر سیرت کی طرف دیکھا۔

"سیرت! معاف کردو بے چارے کو ایسی کوئی بات نہیں اس کے ایسے نصیب کہاں کہ بے چارے کی منگنی ہو۔" واصف نے اس کی گردن دبوچی۔

"گھٹیا انسان بد دعا دے رہے ہو۔" تبھی وقار صاحب آفس سے نکلے تو وہ تینوں مودب ہوگئے۔

"سیرت! آپ اور فرقان ابھی تک یہی ہیں آپ لوگوں کی تو ملاقات طے تھی۔ عثمان لاشاری صاحب کے ساتھ۔ انہوں نے گھڑی دیکھی جہاں ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

"ہم نکلنے والے ہیں سر ساڑھے بارہ بجے وقت دیا تھا انہوں نے۔" فرقان نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ سر ہلاتے مٹھائی دیکھ کر چونکے باری باری تینوں کو دیکھا۔

"یہ کون لایا اور کس خوشی میں؟"

"سر! واصف لایا ہے اور وجہ تو اس نے ہمیں بھی نہیں بتائی۔" سیرت نے ڈبا ان کے سامنے کیا۔

"ہاں بھئی کس خوشی میں ہے مٹھائی؟" تھوڑی سی چم چم منہ میں ڈالتے وقار صاحب نے شگفتگی سے پوچھا۔ "کہیں منگنی وغیرہ تو نہیں کروا آئے۔"

"سر آپ بھی؟" واصف نے دہائی دی۔

"ہمارے بغیر کر کے تو دکھائے ٹانگیں نا توڑ دیں گے اس کی۔" فرقان نے دھمکی دی۔

"یہ دیکھ بھائی۔" واصف نے ہاتھ جوڑے "معاف کردے جو مٹھائی لے آیا۔"

"تو وجہ بتا دو نا کیوں سسپنس کری ایٹ کر رہے ہو۔" سر وقار بھی فرقان کے ہمنوا تھے۔

"سر! بس فیملی میں کچھ کلیش چل رہے تھے وہ حل ہوئے تو اسی لیے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا یار۔" فرقان نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے چن کر تین لڈو اٹھائے تو وقار مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد سیرت عثمان لاشاری کے آفس میں موجود تھی۔ فرقان کچھ ہی دیر میں پہنچنے والا تھا۔

"معذرت خواہ ہوں بیٹا! آپ کو پورا ہفتہ انتظار کرنا پڑا۔ مصروفیات ہی کچھ ایسی نوعیت کی تھیں کہ وقت نکالنا مشکل تھا۔" انہوں نے نرمی سے چکن کے سفید ٹراوزر کے ساتھ سرخ لمبی قمیص میں دونوں رنگوں کے دوپٹے کو شانوں پر پھیلائے کھلتی گندمی رنگت دلکش نقوش کی حامل لڑکی سے نرمی سے کہا۔ سیرت مسکرادی۔

"کوئی بات نہیں سر! آپ نے اپنے اتنے بزی شیڈول میں سے ہمارے لیے وقت نکالا اس کے لیے ہم آپ کے مشکور ہیں۔" گہری سرمئی غلامی آنکھوں پر سایہ فگن لانبی پلکیں چہرے کی تابناکی میں اضافے کا باعث تھیں تبھی دستک دے کر فرقان نے شیشے کے دروازے سے سر اندر گھسایا۔

"میں آجاؤں سر؟" انہوں نے سر کو اثبات

میں جنبش دی۔ فرقان ہی سوالات پوچھتا رہا۔ سیرت خاموش بیٹھی تھی۔

"اینچولی بیٹا مجھے ابھی ایک میٹنگ میں جانا ہے۔" انہوں نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔

"سر! بس آخری سوال۔" کب سے چپ بیٹھی سیرت نے کہا تو انہوں نے سر ہلایا۔

"ہمارے ملک کے کم و بیش سب ہی سیاسی راہنماؤں کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ وہ صرف سادہ لوح عوام کو اپنے خالی خولی دعووں سے بہلاتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف عوام کا پیسہ ہڑپ کرنا ہے۔" سیرت کا سوال اور انداز قدرے تلخ تھا فرقان نے اسے تنبیہی نگاہوں سے دیکھا۔ مگر وہ عثمان احمد کی طرف متوجہ تھی۔ جو تحمل سے اسے سن رہے تھے۔

"آپ بھی اپنے آبائی گاؤں سے الیکشن میں عہدہ حاصل کر چکے تھے مگر اس سیٹ سے آٹھ ماہ بعد ہی مستعفی ہوگئے اور وہ سیٹ بعد میں داور ملک کو ملی۔"

داور ملک کے ذکر پر ایک پل کے لیے اس کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی لیکن وہ فوراً سنبھل چکی تھی۔ "وہ شخص منافقت کا دوسرا نام ہے لیکن سر! میرا سوال یہ ہے۔ عمومی تاثر عوام کو لوٹنے کا ہے تو، ماشاءاللہ آپ خاصی رچ فیملی سے بی لانگ کرتے ہیں تو آپ اس میدان میں کیوں آنا چاہتے ہیں، اگر آپ کا مقصد حقیقت میں اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا ہے تو آپ پہلے کیوں مستعفی ہوئے تھے؟" عثمان لاشاری نے نہایت تحمل سے اس پیاری سی لڑکی کی تمام کڑوی کسیلی سنی تھیں۔ داور ملک کے نام پر وہ کیوں جذباتی ہوئی تھی اور ان کے مستعفی ہونے کا اسے کیوں غصہ تھا وہ سب کا محرک جانتے تھے۔

"آپ کی تمام باتیں درست ہیں بیٹے! مجھے بھی اپنے غلط فیصلے کا ابھی تک پچھتاوا ہے، ذاتی مفاد کی خاطر میں نے اپنے لوگوں کو ایک جابر حکمران کے رحم و کرم پہ چھوڑا، اگر اس بار میں منتخب ہوا تو میری بچی کو یہ شکایت نہیں رہے گی۔" وہ مسکرائے سیرت نے شرمندگی محسوس کرتے لب کچلے۔

"جہاں تک بات عوام کو لوٹنے کی تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔ لوٹ مار والوں کی فہرست سے یقیناً آپ مجھے نہیں دیکھیں گی، صحافی ہماری سپورٹ ہیں۔" انہوں نے فرقان کی طرف دیکھا۔

"اور میں امید کرتا ہوں آپ لوگ ہمارا ساتھ نبھائیں گے۔"

"ان شاءاللہ سر۔" فرقان سے صدق دل سے کہا۔

"سوری سر! میں کچھ تلخ ہوگئی تھی۔" سیرت نے عثمان کو سیٹ سے اٹھتے دیکھ کر شرمندگی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے میز کے اس پار اس کے پاس آئے سیرت اور فرقان ساتھ ہی اٹھے۔

"کوئی بات نہیں مجھے برا نہیں لگا۔" اس کے سر پر دست شفقت رکھتے وہ نکل گئے۔

☆☆☆

"سیرت عبدالمنان کون ہے؟ آپ جانتے ہیں اسے۔" ناشتے کی میز پر صوفیہ نے اخبار دیکھتے ہوئے عثمان سے پوچھا تو وہ مسکرادیے۔

"صرف ایک بار ملاقات ہوئی ہے واصف کے ساتھ روزنامہ پاسبان میں ہوتی ہے۔"

"آپ کے بارے میں کافی اچھا لکھا اس نے صبح میں دیکھ رہی تھی۔" صوفیہ نے چائے میاں کے سامنے رکھتے ہوئے بتایا۔ تبھی اذلان مسکراتے ہوئے میز پر آیا۔

"السلام علیکم صبح بخیر۔" جینز کے ساتھ شہد رنگ ٹی شرٹ میں ملبوس نکھرا نکھرا بہت فریش لگ رہا تھا دونوں میاں بیوی نے زیر لب ماشاءاللہ کہتے فخر سے اکلوتے بیٹے کو دیکھا۔

"کیا ہوا آج بہت پیار آرہا ہے ناچیز پر؟" ماں کو بازو کے حصار میں لے کر ان کا سر چومتے انداز چھیڑنے والا تھا ماں نے مسکراتے ہوئے اس کے سلکی بال بکھیر کر اس کا بازو ہٹایا۔

"پیار تو ہمیشہ ہی آتا ہے تم جیسی ناچیز پر۔" صوفیہ نے اسی کے انداز میں جواب دے کر میاں کو

تائیدی انداز میں دیکھا تو وہ مسکرا دیے۔ عثمان نے ایک نظر اذلان پر ڈال کر صوفیہ کو مخاطب کیا۔

''دو روز قبل سیرت آئی تھی آفس مجھ سے ملنے۔'' اذلان نے ایک نظر انہیں دیکھ کر گلاس میں جوس انڈیلا۔ ماں تو سیرت کے ذکر میں الجھ کر اسے جوس دینا بھول چکی تھیں۔ ''بہت بہادر بچی ہے خیر بہادر نڈر تو عبدالمنان صاحب بھی تھے۔'' صوفیہ بغور انہیں سن رہی تھیں جبکہ اذلان بھی سرسری نگاہ اخبار پر دوڑاتے جوس پیتے انہیں سن رہا تھا۔

''آپ تو بہت کم کسی سے متاثر ہوتے ہیں سیرت میں ایسی کوئی خاص بات تو ہوگی کہ آپ پہلی ہی ملاقات میں اس سے اس درجہ متاثر نظر آ رہے ہیں۔'' عثمان نے اس تجزیے پر بے ساختہ متبسم نگاہوں سے اخبار دیکھتے پڑھتے بیٹے کو دیکھا۔

''وہ جب سرخ لباس میں ملبوس دروازے پر دستک دے رہی تھی ایک فیصلہ اسی وقت ہو گیا تھا۔'' انہوں نے ڈرامائی انداز اپنایا۔ اذلان نے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

''کیسا فیصلہ؟'' صوفیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''یہی کہ اگر وہ کہیں انگیجڈ نہیں ہے تو اسے عثمان لاشاری کی بہو بننا۔''

''اف۔ آرام سے۔'' انہیں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اذلان کی پیٹھ سہلانا پڑی جسے زور سے اچھو لگا تھا جوس فوارے کی صورت منہ سے نکلا صوفیہ نے بھی تشویش سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جو بے یقینی سے باپ کی طرف متوجہ تھا۔

''بابا آپ بھی حد کرتے ہیں۔'' ہونٹ تھپتھپاتے ہوئے اس نے قدرے خفگی سے کہا۔

''اس میں حد والی کیا بات ہے؟'' عثمان نے حیرت سے اسے دیکھا جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وجہ نجانے اچھو تھی یا غصہ وہ سمجھ نہ سکے۔

''آپ ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں۔'' اس بار لہجہ نارمل تھا۔

''وہ ایک اچھے باعزت گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اذلان میں معلوم کروا چکا ہوں وہ کہیں انگیجڈ بھی نہیں ہے اگر تم کسی میں انٹرسٹڈ ہو تو بتا سکتے ہو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بابا۔''

''تو ٹھیک ہے خود کو ذہنی طور پر تیار کرو الیکشن کی مصروفیات سے فراغت پاتے ہی میں باقاعدہ پروپوزل دینے والا ہوں تمہارا۔''

''اگر ان لوگوں نے انکار کر دیا تو؟''

''وہ بھلا کیوں انکار کریں گے میرا بیٹا تو بالکل شہزادہ ہے۔'' صوفیہ نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔

''ڈیئر مام! ہر ماں کو اپنا اندھا، کانا بیٹا شہزادہ ہی لگتا ہے، ماؤں کے کیا کہنے۔'' ماں کی انگلی چومتے وہ مسکرایا۔

''فکر مت کرو انکار نہیں ہوگا کیونکہ نہ تو تم اندھے ہو نہ کانے۔''

☆☆☆

''یار پہلے تو مجھے شک تھا اب پکا یقین ہو چکا ہے اذلان احمد لاشاری قسمت کا دھنی ہے جس کے بخت کا ستارا عروج پر ہے۔'' سفیان اور نور فیصل آباد سے آئے ہوئے تھے اسی لیے ینگ پارٹی پھر سے فاروق ماموں کے ہاں تھی، عمران واصف کا پرپوزل ضحیٰ کے لیے دے چکے تھے زبانی کلامی ہاں تو ہو چکی تھی، باقاعدہ منگنی کا فنکشن کرنے سے فی الحال عثمان نے روکا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے فارغ ہو کر وہ سیرت کا پرپوزل لے جائیں تو اذلان اور واصف کی ایک ساتھ منگنی کا فنکشن ہو۔

انہیں سو فیصد امید تھی بلکہ سب ہی پر امید تھے کہ اذلان کے پرپوزل کو قبول کر لیا جائے گا۔ چونکہ نوجوان پارٹی کو پتا چل چکا تھا تو وہ اب اذلان کو چھیڑنے کے موڈ میں نظر آ رہے تھے جو فلور کشن پر سفید شلوار اور ہلکے سرمئی رنگ کے کرتے میں ویک اینڈ انجوائے کر رہا تھا۔ صوفے پر سفیان، ریحان اور واصف تھے سنگل صوفے پر ضحیٰ اور نور بیٹھی تھیں جبکہ

نمرہ اذلان کے ساتھ بیٹھی اس کے سیل فون پر گیم کھیل رہی تھی جو ابھی اس نے نمرہ کی فرمائش پر ڈاؤن لوڈ کی تھی، گفتگو کا آغاز ریحان نے کیا تھا۔ سارا (ریحان کی بیوی) چائے بنا رہی تھی۔

''ہاں واقعی اس کی قسمت کا ستارا عروج پر ہے ماشاءاللہ۔'' سفیان نے اس کی تائید کی۔

''ہاں بھئی جس انسان کو سیرت مل رہی ہو اس کی خوش قسمتی پر کون بے وقوف شک کرے گا۔'' نور کے کہنے پر جہاں سب مسکرائے وہیں اذلان نے اسے گھورا۔

''کیا کہنے میری خوش قسمتی! اب سیرت سے مشروط ہے واہ۔''

''ہاں تو سیرت جیسی لڑکی چراغ تو کیا ٹیوب لائٹ لے کر بھی نہیں ڈھونڈی جا سکتی تھی جو اسے بیٹھے بٹھائے مل رہی۔'' واصف خاصا چہک رہا تھا۔

''تصحیح کر لو واصف! بیٹھے بٹھائے نہیں چلتے پھرتے۔'' ریحان کی تصحیح پر سب ہنس دیے۔

''ویری فنی غدار پارٹی ابھی تو وہ آئی نہیں اور تم لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا۔'' اذلان نے دہائی دی۔

''دھیرج رکھو دوست۔'' واصف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے خود پر زبردستی کی رنجیدگی طاری کی۔

''یہ لوگ تو تم سے حسد میں مبتلا ہو رہے ہیں کہ تمہیں ایسی پیاری بہادر، جفاکش وغیرہ وغیرہ لڑکی مل رہی ہے، تمہاری خوش قسمتی سے جل رہے ہیں جل ککڑے کیونکہ کہاں تم خبیث، پاجی، گدھے کہاں وہ میری، اولیس۔'' واصف اچھل کر کھڑا ہوا مگر اذلان نے اسے صوفے پر پٹخ دیا، سفیان اور ریحان کا قہقہہ چھت پھاڑ تھا جبکہ لڑکیاں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔

''کیا کہا پھر بکواس کرو میں گدھا ہوں۔'' گھٹنا موڑ کر واصف کے پیٹ پر مارتے اس نے واصف کی گردن دبوچی۔ سفیان اور ریحان صوفے سے اٹھ گئے جبکہ جسے پیٹا جا رہا تھا وہ پاگلوں کی طرح ہنسے جا رہا تھا۔

''یار صرف گدھا نہیں اس نے تمہیں خبیث بھی کہا ہے۔'' سفیان نے بمشکل مسکراہٹ چھپاتے صوفے پر ہاتھ مارا۔ ''سچ بتاؤ اذلان کیا تم واقعی خبیث ہو؟'' کیسا معصومیت بھرا سوال تھا سب کی کھلکھلاتی ہنسی پھر سے اسٹارٹ ہو گئی جبکہ اذلان نے ایک پنچ واصف کے شانے پر مارا۔

''اور تو اور اس نے تمہیں پاجی بھی کہا۔'' اب کہ ریحان نے اسے جوش دلایا۔

''اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اذلان احمد لاشاری واصف عمران سے اپنی سنہری حروف سے لکھی جانے والی بے عزتی کا بدلہ اچھی طرح لے پاتا ہے یا نہیں۔'' کہتے ہوئے ریحان نے باقاعدہ ایک ٹانگ پر بھنگڑا ڈالا تھا۔

''تمہیں کس کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔'' سفیان نے اسے ایک پنچ مارا۔

''او بھائی۔'' اس نے تاسف سے سفیان کو دیکھا۔ ''سارے ایموشنز کا بیڑا غرق کر دیا۔'' بولتے ہوئے صوفے پر اذلان اور واصف کو ساتھ دیکھا واصف نے اذلان کے شانے پر بازو پھیلا رکھا تھا۔

''ایں تم لوگوں کی صلح کب ہوئی؟'' اس نے مصنوعی صدمے سے دونوں کو دیکھا۔

''واصف! میرے یار تمہاری کون سی ہڈی پسلی ٹوٹی ہے مجھے بتاؤ؟'' اس نے جوش سے واصف کو جھنجھوڑا۔

''سارا! افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے شوہر نامدار اپنے حواسوں میں نہیں ہیں، پلیز انہیں کمرے میں لے جائیں۔'' اذلان نے چائے لاتی سارا سے کہا۔ جس کے لبوں پر مسکان تھی۔ ریحان، اذلان کو گھورتے بال سنوارتے آرام سے صوفے پر بیٹھا۔

''تمہیں کب عقل آئے گی اذلان! نئی نویلی دلہن کے سامنے اس کے شوہر کی بے عزتی کرتے تمہیں کچھ سوچنا چاہیے تھا۔ ویسے ہم کہاں تک پہنچے

تھے۔"

"مجھے ذلیل کرنے تک پہنچ گئے تھے۔" اذلان نے منہ پھیلایا۔

"ارے رے میرا بچہ رونا نہیں۔" سفیان نے اس کا سر شانے سے لگایا۔

"بس بھی کریں یار کوئی نہیں رو رہا ہوں میں۔" وہ جھنجلایا۔

"ویسے اس کی زندگی میں کوئی رنگ ہی نہیں۔" واصف نے سنجیدگی سے کہتے سپ لیا۔

"بھلا کیسے؟"

"یار! زندگی میں رنگ محبت سے آتے ہیں، کسی کو ایک نظر دیکھنے کا سرور، محبت کا نشہ کسی کا انتظار۔" ضحیٰ اس کے گمبھیر لہجے پر سمٹ کر نور کی اوٹ میں ہو گئی حالانکہ واصف سب کی موجودگی میں اسے دیکھنے کا رسک نہیں لے رہا تھا کیونکہ پتا تھا سب مل کر اس کا بھرکس نکال دیں گے۔

"محبت خود اپنے اندر ایک جہان ہے، رنگ، خوشبو بادل، نغمے اور سب سے بڑھ کر دعا۔" وہ ایک جذب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا جبکہ سبھی چپ اسے سن رہے تھے۔

"محبت دعا ہے اور دعا عبادت ہے، عبادت انسان کو اس کی اصل روح سے ملاتی ہے اور وہ فنا روح انسان کو اللہ سے اور جس نے رب کو پالیا اس نے سب کچھ پالیا۔" واصف شانے پر مضبوط ہاتھ کا لمس محسوس کرتے چونک کر حواس میں لوٹا سب کو خاموش اور اپنی طرف متوجہ پایا۔

"ہے گائز، کیا ہو گیا؟" اس نے اذلان کے سامنے چٹکی بجائی۔ "یار تم کس قدر خوب صورت بولتے ہو۔" ریحان نے بے ساختہ اس کی تعریف کی مگر واصف نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا ابھی چند لمحوں بعد میری بھی اذلان والی درگت بننے والی ہے؟" سفیان نے مسکراتے ہوئے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"واصف! کیا وجہ تھی سیرت نے پرائم ٹائم شو کے لیے کیوں انکار کر دیا؟" نور نے موضوع بدلا۔

"بولو بھی کیوں کیا اس نے انکار تمہیں تو معلوم ہو گا ہی۔" ریحان نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔

"ابھی تو پٹر پٹر بول رہے تھے اب کیوں سانپ سونگھ گیا تمہیں؟" سفیان جھنجلایا تب واصف کی نظر بے ساختہ نور کے پہلو میں گل رنگ چہرے والی ضحیٰ کی طرف اٹھی بابت لمحے بھر کی تھی لیکن سفیان نے اس کی چوری پکڑتے ضحیٰ کو ہی مخاطب کیا۔

"تم اتنی چپ کیوں ہو ضحیٰ جب سے آئی ہو کچھ نہیں بولیں خیریت؟"

"میں آپ لوگوں کو سن رہی تھی۔" سفیان کی طرف دیکھتے نگاہ سفیان کے برابر وجود پر لمحے کے لیے ٹکرا کر پلٹ آئی۔

"سننا اچھی بات ہے۔" سفیان نے سراہا پھر واصف کی طرف دیکھا جو مسکراہٹ چھپانے کے جتن کر رہا تھا۔

"ضحیٰ میری بہن!" سفیان نے خوش آمدی انداز اپنایا۔ "تمہیں بے شک سننے میں مزا آتا ہو گا مگر ہماری خاطر واصف سے ایک سوال پوچھ لو آخر سیرت نے کیوں منع کیا۔" واصف نے حیرت و بے یقینی سے سفیان کو دیکھا وہ کیسے اس کے دل کی بات جان گیا تھا۔ "مجھے معلوم ہے جب تک تم نہیں پوچھو گی یہ بدتمیز جواب نہیں دے گا۔" ضحیٰ نے بے ساختہ واصف کی طرف دیکھا وہ سفیان کی طرف متوجہ تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے اس نے کہہ دیا۔

"پلیز آپ بتا دیں بھائی کو۔" اس نے تیزی سے جملہ بول دیا جب تک کہ واصف اس کی طرف متوجہ ہوتا وہ پھر سے نور کی اوٹ میں ہو چکی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر عین ان کے صوفے کے سامنے آ کھڑا ہوا بازو سینے پر لپیٹے بالکل سیرت کے انداز میں وہ جواب دینے والا تھا۔ (کیونکہ سوال ضحیٰ اظہار کی طرف سے آیا تھا تو جواب واصف عمران پر فرض ہو چکا تھا۔)

"یہی سوال میں نے سیرت سے اسی حیرت

سے پوچھا تھا اور اس نے اتنی بے یقینی سے دیکھا تھا کہ اس لمحے کو یاد کر کے ایک بار پھر شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا خیر، تو سنیں آپ سب۔ وہ لوگ مجھے بنا دوپٹے کے سوٹ میں یہ جاب دینا چاہتے ہیں مگر میں دوپٹے پر کمپرومائز نہیں کر سکتی میں مسلمان لڑکی ہوں اسلامی جمہوریہ پاکستان کی آزاد شہری۔"

"لیکن آج کل تو یہی ٹرینڈ ہے یار کون سی لڑکی دوپٹے میں نظر آتی ہے، میڈیا کو چھوڑو اب تو عام خواتین نے بھی دوپٹے کو کسی فالتو چیز کی طرح پھینک دیا ہے۔" ریحان نے سنجیدگی سے پوچھا۔ واصف پلٹ کر اذلان کے پہلو میں آ بیٹھا۔

"یہی تو المیہ ہے یار! فیشن اور لبرل نظر آنے کی دھن میں ہم اپنے مذہبی اور ثقافتی اقتدار سے دور ہوتے جا رہے ہیں، نجانے مغرب کی اس اندھا دھند تقلید میں ہم کہاں جا رہے ہیں، اگر مسلمان اور غیر مذہب لڑکی کو ساتھ بٹھا دیں تو فرق کرنا مشکل ہو گا کہ کون مسلمان ہے۔" سفیان نے تاسف سے سامنے لڑکیوں کو دیکھا چاروں دوپٹوں میں نظر آ رہی تھیں۔

"اذلان احمد لاشاری۔" واصف نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچا۔ "وہ لڑکی جس کا نام سیرت عبدالمنان ہے، میری دعا ہے اس کا نصیب تم سے جڑے، ایسی خالص اور معصوم لڑکی کو تمہارا ہی نصیب ہونا چاہیے، وعدہ کرو اسے اس کی خوبیوں خامیوں سمیت قبول کرو گے۔ وہ جیسی ہے ویسا ہی قبول کرو گے کبھی اسے بدلنے کی کوشش نہیں کرو گے۔" اذلان نے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے اسے عہد دیا۔

☆☆☆

"السلام علیکم سیرت فاطمہ! آپ یہاں؟" وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

جب سیاہ پجیرو اس کے قریب رکی آنے والے کو دیکھ کر جہاں ہارٹ بیٹ مس ہوئی وہیں جھنجلا بھی گئی۔ بلاشبہ وہ چھا جانے والی شخصیت کا مالک تھا مگر سیرت کو جس گاؤں جانا ہی نہیں تھا اس کے کوس گننے کا بھی شوق نہیں تھا اس نے بری طرح دل کو ڈپٹا جو الگ ہی لے پر دھڑک رہا تھا۔

"وعلیکم لسلام۔" سیاہ گاڑی سے نکلنے والے کا لباس بھی ویسا ہی تھا سیاہ شلوار قمیص، کولہا پوری اور ڈارک گلاسز وہ عین اس کے سامنے آ رکا تو سیرت نے سڑک پر نگاہیں جماتے سلام کا جواب دیا۔

"کیسی ہیں آپ؟" گلاسز اتارتے سیرت کا انداز ان دیکھا کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ کیوں مجھے فالو کرتے ہیں؟" وہ جھنجلا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اونہہ تصحیح کر لیں فالو نہیں کرتا اتفاقی ملاقات ہوتی ہے۔" بے نیازی سے کہہ کر چابی لے کر بونٹ اٹھایا۔ سیرت نے آنکھیں چندھی کر کے اس کی پشت کو گھورا۔

"کیا میں شکل سے بے وقوف نظر آتی ہوں آپ کو؟" تاروں سے چھیڑ خانی کرنے ایک نظر سیرت کو دیکھا۔ مگر کہا کچھ نہیں۔

"کب سے سروس نہیں کروائی۔" کھٹاک سے بونٹ گراتے ہاتھ جھاڑتے ہوئے سیرت کی طرف دیکھا۔

"چلیں آئیں میں ڈراپ کر دوں۔" گاڑی لاک کرتے اس قدر اطمینان سے کہا گویا وہ اسی کے لیے تو یہاں کھڑی ہے۔

"مجھ پر حکم مت چلائیں مسٹر ملک! غلام نہیں ہوں میں آپ کی؟"

"تو میں نے کب کہا کہ غلام ہیں۔ ویسے کہاں جا رہی تھیں؟"

"اوہ۔" وہ کراہی۔ نجانے یہ شخص کیوں نہا دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

"آفس تو نہیں جا رہیں گھر ہی جانا ہو گا آئیں ڈراپ کر دوں یوں۔" سنسان سڑک پر کھڑے ہونا مناسب نہیں لگتا۔ وہ بندہ بھی اپنے نام کا واحد پیس تھا۔

"میں چلی جاؤں گی، آپ کو فکر مند ہونے کی

ضرورت نہیں۔‘‘

’’گاڑی خراب ہے، کنوینس ملنا مشکل ہے تو کیسے جائیں گی؟‘‘ سیل نکال کر نمبر پش کرتے قدرے رخ موڑا۔ ’’صفدر یار۔‘‘ کال اٹھالی گئی تھی سیرت اسے دیکھ کر رہ گئی۔

’’مسئلہ ہے گاڑی خراب ہوگئی ہے پہنچو ادھر یا کسی کو بھیجو۔‘‘ جگہ کا پتا بتاتے ہوئے فون بند کرتے سیرت کی طرف دیکھا جو خفگی سے اسے گھور رہی تھی۔

’’کیا ہوا اتنی خوفناک نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔‘‘ اس نے ڈرنے کی بھرپور اداکاری کی۔

’’یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے میں جاؤں یا کہیں بھی کھڑی رہوں۔ آپ جائیں، میں نے بھائی کو کال کر دی تھی وہ آتے ہوں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے میں یہیں رک کر انتظار کر لیتا ہوں، بھائی آجائیں۔‘‘ سنجیدگی سے کہتے ہوئے گاڑی سے ٹیک لگائی۔

’’آپ ایسے کیوں کر رہے ہیں مسٹر ملک؟‘‘ وہ زچ ہوئی۔

’’ارے واہ کیا حسن اتفاق ہے آپ نے بھی بلیک کلر پہنا ہے۔‘‘ اس نے سیرت کے سوال پر یوں پوز کیا گویا ابھی ہی تو سیرت کو دیکھا ہے۔ سیاہ پٹیالہ نما شلوار کے ساتھ گول دامن کی شرٹ پر سلور کلر کی نفیس سی بیل تھی جبکہ سیاہ دوپٹہ سلیقے سے اوڑھا تھا اس نے ڈارک گلاسز کی وجہ سے بغور اس کا جائزہ لیا دلکش دل موہ لینے والے چہرے پر غصے کی سرخی تھی۔

’’تم ساتھ ہو مقدر پہ حکومت اپنی
بن تیرے زندگی کی اوقات ہی کیا ہے‘‘

’’آپ سن کیوں نہیں رہے، جائیں یہاں سے۔ میں چلی جاؤں گی۔‘‘

’’مجھے لگتا ہے آپ نے صرف مجھ سے ضد باندھ لی ہے سیرت فاطمہ۔‘‘

’’ایکسکیوز می میرا نام سیرت عبدالمنان ہے۔‘‘ اس نے دانت پیسے مگر مجال ہے جو اس کے غصے کا مقابل پر کوئی اثر ہو۔

’’جب آپ جانتی ہیں میں وہی کرتا ہوں جو میرا دل چاہتا ہے اور مجھے سیرت فاطمہ پسند ہے تو آپ کیوں بلاوجہ خود کو مشکل میں ڈالتی ہیں۔ مجھ سے بحث میں آپ جیت نہیں سکتیں۔‘‘ اس کے ہونٹوں پر محظوظ سی مسکراہٹ چمکی تو سیرت نے تیزی سے نگاہوں کا زاویہ بدلا۔

’’اور ایک اہم بات سیرت فاطمہ، آں ہاں نو آرگیومنٹ۔‘‘ سیرت کا اعتراض کے لیے کھلتا منہ دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔ ’’سیرت فاطمہ آپ دیگر لڑکیوں سے مختلف ہیں میں امید کرتا ہوں آپ کوئی غلط فہمی نہیں پالیں گی۔‘‘

کیسی غلط فہمی؟

’’وہی جو اکثر لڑکیوں کو ہوجاتی ہے جب کوئی ہینڈسم لڑکا ان سے ہنس کر بات کرے یا ایک دوبار اتفاقیہ ٹکرا جائے تو وہ سمجھنے لگتی ہیں شاید لڑکا ان سے پیار کر بیٹھا ہے۔‘‘ سیرت جو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی آخری لفظوں پر ٹپٹا کر نگاہیں چرائیں۔ چہرہ گلابی مائل ہو رہا تھا جو مقابل کو مبہوت کر دینے کی اہلیت رکھتا تھا تبھی کوئی گاڑی زن سے قریب سے گزری وہ کھنکارتے مخالف سمت دیکھنے لگا جہاں سے سفید چھوٹی سی گاڑی آ رہی تھی سیرت نے پرسکون سانس لی تو وہ سمجھ گیا آنے والا احسن ہے اسی لیے سر خم کرتے ہوئے گاڑی زن سے بھگا لے گیا۔

☆☆☆

’’یہ میں کیا سن رہا ہوں سیرت۔‘‘ وہ سر جھکائے تیزی سے کچھ لکھ رہی تھی۔ تب واصف بعجلت کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھا سیرت نے نگاہ اٹھا۔

’’میں کیسے جان سکتی ہوں تم نے کیا سنا؟‘‘ وہ خلاف معمول سنجیدہ تھی۔

’’یہی کہ عثمان احمد لاشاری نے تمہارے لیے اپنے بیٹے کا پرپوزل دیا ہے۔‘‘ ایک پل کے لیے دل سہم کر دھڑکا پھر سر ہلا دیا۔

’’مجھے تو فرقان نے یہ تک بتایا ہے کہ تم نے

ایک سوال ان سے پوچھا تھا وہ بھی خاصا تلخ جارحانہ انداز میں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ کیسے اپنے بیٹے کا پرپوزل دے گئے حیران کن بھئی۔‘‘ واصف کی لاعلمی کی ایکٹنگ شاندار تھی سیرت مسکرا دی۔

’’یہ بات تو مجھے خود سمجھ میں نہیں آئی آخر انہیں مجھ جیسی بددماغ لڑکی میں کیا خوبی نظر آگئی؟‘‘ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ نگاہیں جھکا کر وہ نجانے واصف سے کون سا راز چھپانا چاہتی تھی۔

’’خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔‘‘ واصف کو اس کے تبصرے پر اعتراض ہوا۔ ’’یوں بھی۔‘‘ وہ مسکرایا۔ ’’خوبی دیکھنے والی آنکھیں ہونی چاہیے سیرت فاطمہ۔‘‘ اس کے شریر لہجے پر سیرت نے خفگی سے دیکھا۔

’’ذکر مت کرو، اس بدتمیز شخص کا میرے سامنے۔‘‘ واصف چونکا۔

’’خیریت کیا ہوا وہ ملا تھا تمہیں دوبارہ؟‘‘

’’ایک بار نہیں بہت بار۔ ہفتے میں دو بار تو ضرور کہیں نہ کہیں ٹکراتا ہے اور موصوف کو خوش فہمی ہے کہ کہیں مجھے عام لڑکیوں کی کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے، اسی لیے جتاتا ہے سرراہ اتفاقی ملاقات ہوتی ہے میں فارغ انسان تو نہیں جو آپ کو فالو کرتا پھرے۔‘‘

’’ہوسکتا ہے وہ واقعی تم سے اتفاقیہ ٹکرا رہا ہو۔‘‘ واصف سنجیدہ تھا۔

’’تم تو ایسا مت کہو واصف! جانتے ہو ان لوگوں کو۔ میں سب گیم سمجھ چکی ہوں مسٹر ملک کی۔ دیکھنا میں کیسے ان کا کچا چٹھا کھولتی ہوں ثبوت میرے پاس ہیں۔ یاد رکھیں گے کس باپ کی بیٹی سے پالا پڑا تھا، مجھے نفرت ہے ان ملکوں سے۔‘‘ اس نے زور سے قلم مٹھی میں بھینچا واصف اسے دیکھ کر رہ گیا۔

’’ملکوں تک بات ٹھیک ہے مگر وہ بے چارا تو خاصا ڈیسنٹ ہے۔‘‘

’’اونہہ۔‘‘ سیرت نے سر جھٹکا۔ ’’مجھے اس ڈیسنٹ انسان کی صورت سے بھی نفرت ہے۔‘‘ واصف جھٹکے سے اٹھا۔

’’کہاں جا رہے ہو؟‘‘

’’مجھے بہت ضروری کام یاد آگیا ہے سیرت آتا ہوں۔‘‘ وہ تیزی سے پلٹ گیا۔

☆☆☆

’’آخر وہ لوگ سوچنے کے لیے مزید کتنا وقت لیں گے؟‘‘ صوفیہ جھنجلا کر عثمان صاحب کے سامنے بیٹھیں۔

’’آرام سے بھئی بیٹی کا معاملہ ہے وقت لینا ان کا حق ہے۔‘‘

’’نجانے مزید کتنا وقت لیں گے میں تو آپا کو روک رکھا ہے کہ احسن ہاں کرے تو واصف اور اذلان کی منگنی کا فنکشن اکٹھا کریں گے۔‘‘

’’صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔‘‘ عثمان نے اخبار سے نظر اٹھا کر بیوی سے کہا۔

’’ویسے بھی احسن اذلان سے ملنا چاہتا ہے اور آپ کے صاحبزادے کے پاس آج کل وقت کی شدید قلت ہے۔ وقت ہی نہیں اس کے پاس۔‘‘

’’تو وقت مل بھی کیسے سکتا ہے۔‘‘ انہوں نے خفگی سے میاں کو گھورا۔

’’آپ کو نجانے بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی سیاست میں جانے کی ساری ذمہ داریاں میرے بچے کے کندھے پر ڈال دی ہیں۔‘‘ عثمان بے ساختہ مسکرائے۔

’’بیان بدلنے میں تو آپ ہم سیاستدانوں کو بھی مات دیتی ہیں بیگم صاحبہ!‘‘ صوفیہ نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

’’تھوڑی دیر قبل آپ بیٹے کی شادی کی جلدی میں تھیں اور اب بچہ کہہ رہی ہیں، حد ہے ہم بے چارے تو خوامخواہ بدنام ہیں۔‘‘

’’ہاں تو بچہ ہی ہے ناماں کے لیے تو اولاد بوڑھی ہو کر بھی بچے کی طرح ہی ہوتی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔‘‘ عثمان نے صلح جو انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ ’’ویک اینڈ پر اذلان سے

کہو احسن سے مل لے۔"

☆☆☆

"السلام علیکم، جی سر!" وہ تیار ہو کر گھر سے نکل رہی تھی جب وقار صاحب کی کال آ گئی۔

"وعلیکم السلام، سیرت آپ آفس چلی جاؤ۔"

"مگر سر! کل میں نے بتایا تھا آپ کو میری فرینڈ کا ولیمہ ہے وہ پہلے ہی ناراض ہے مجھ سے۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"میں جانتا ہوں تم چھٹی لے چکی ہو مگر بچے! میں بھی آفس نہیں آ سکا میری مسز کی طبیعت اپ سیٹ ہے۔ واصف بھی شہر سے باہر ہے تو پلیز صرف آدھے گھنٹے کے لیے چلی جاؤ پھر وہیں سے اپنی فرینڈ کی طرف چلی جانا۔"

"جی سر۔" مرے مرے انداز میں کال کاٹتے ہوئے گاڑی آفس کی طرف موڑی۔ شیشے کا دروازہ کھول کر جوں ہی آفس میں قدم رکھا ہما نے ستائشی نگاہوں سے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ میرون تنگ پاجامہ کے ساتھ اسکن کلر شرٹ کے دامن پر میرون اور گولڈن کامدار پٹی لگی تھی۔ بڑا سا اسکن دوپٹہ جس پہ شرٹ کی طرح کامدار پٹیاں لگی تھیں، کانوں میں چھوٹی سی بالیاں جن میں میرون ننھے ننھے اسٹون جڑے تھے، ہلکا پھلکا سا میک اپ میرون لائٹ لپ اسٹک وہ معمول سے کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ دونوں کلائیوں میں میرون چوڑیاں، پاؤں میں چھوٹی سی ہیل کے نازک سے سینڈل۔ اندر قدم رکھتے ہی ہما کے انداز نے اسے کنفیوژ کر دیا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہیں، کیوں ایسے گھور رہی ہو؟" ہما اس کے سرخ چہرے کو دیکھتے ہوئے ہنس پڑی۔

"خیریت یہ آج اتنا سج سنور کر کس پر بجلیاں گرانے کا ارادہ ہے؟"

"بکو نہیں میں تو ولیمے میں جا رہی تھی کہ سر کی کال آ گئی وہ کہہ رہے تھے صرف آدھے گھنٹے کے لیے آفس آ جاؤں۔" ہما کی خود پر جمی نگاہوں سے نروس ہوتے ادھر ادھر دیکھا۔

"یار میں لڑکی ہوں تو میرے دیکھنے پر ایسے پزل ہو رہی ہو فرض کرو کسی ہینڈسم سے بندے نے تمہاری تعریف کر دی تو تم تو بے ہوش ہی ہو جاؤ گی۔"

"میں سر نہ توڑ دوں گی اس بدتمیزی کرنے والے کا، جانتی نہیں ہو تم مجھے۔"

"ہاں بھئی جھانسی کی رانی! میں سمجھ گئی بہت اچھی لگ رہی ہو ماشاء اللہ، ہاں وہ سر کے آفس میں کوئی صاحب بیٹھے ہیں تمہارا پوچھ رہے تھے۔"

"کون ہیں؟"

"نام نہیں بتایا صرف تمہارا پوچھا تھا، اب انتظار کر رہے ہیں۔" سیرت آگے بڑھی تو ہما نے پھر سے پکار لیا اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"اپنی نظر اتار لینا۔"

"کیا خیال ہے تمہیں ساتھ نہ لے چلوں نظر بٹو کے طور پر۔" وہ مسکراتے ہوئے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی وہ جو کوئی بھی تھا اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ سیرت ٹھٹک کر عجیب سے احساس کے تحت وہیں رک گئی جبکہ وہ شخص بھی آہٹ پر متوجہ ہوا۔

"السلام علیکم، سیرت فاطمہ! آئیے نا آپ وہاں کیوں کھڑی ہیں؟"

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" وہ جارحانہ انداز میں اس کے سامنے میز تک آئی۔ وہ جتنا اس شخص سے کتراتی تھی وہ اتنا ہی اس کی راہ میں آ کر اس کے ارادوں کو ملیامیٹ کر دیتا تھا۔

"آپ سے ملنا تھا نا اس لیے آیا ہوں۔" اطمینان سے جواب دیتے ہوئے بہت چاہت سے اس چہرے کو دیکھا جو اسے خود سے بھی زیادہ عزیز تھا، مگر کمال کا ضبط پایا تھا اس نے، مجال ہے جو چہرے پر دل کی کیفیت کا ذرا سا بھی عکس پڑنے دے؟

"آپ حیران ہیں یا پریشان اور بیٹھیں پلیز آپ کا اپنا آفس ہے۔" انداز ایسا تھا جیسے وہ میزبان

اور سیرت مہمان ہو، سیرت نے آنکھیں بند کرتے گہری سانس لے کر خود پر قابو پایا۔ مقابل نے اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے نگاہوں کے راستے عزیز از جان چہرے کو دل میں اتارا۔

"ابھی ہی نہیں نگاہ میری کسی اور کی طرف
بس اک شخص کا دیدار مجھے اتنا پابند کر گیا"

یہ شخص سختی سے نہیں نرمی سے ڈیل کرنے والا ہے، میں جس قدر غصہ کرتی ہوں یہ اتنا ہی مطمئن نظر آتا ہے، صاف محسوس ہو رہا تھا وہ دیکھ تو اس کی طرف ہی ہے مگر۔ اس کی نگاہ اور سوچ کا آپس میں کوئی ربط نہیں تھا وہ کھنکارا۔

"سیرت فاطمہ! پلیز کیوں خود کو تھکا رہی ہیں۔ جو بھی منصوبہ بنانا ہے بیٹھ کر بنائیں، میں آج فرصت سے آیا ہوں۔" سیرت نے چونک کر اس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی۔

"آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" پاور سیٹ پر بیٹھتے ہوئی اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"نجانے کون سی دولت ہے تمہارے لہجے میں
بات کرتے ہو تو دل خرید لیتے ہو"

"بہت انتظار کروایا آپ نے میں نے کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔ آج کیا تو پتا چلا انتظار کس چڑیا کا نام ہے۔" سوال گندم جواب چنا کے مصداق اس نے گویا قسم کھا رکھی تھی سیرت کے کسی سوال کا جواب سیدھا نہیں دینا۔

"آپ آخر سمجھتے کیا ہیں خود کو؟" انتہائی ضبط کے باوجود اس کے چہرے اور لہجے سے خفگی جھلک ہی گئی تو ثابت ہوا وہ عام سی کمزور قوت ارادی کی مالک لڑکی تھی دیگر لڑکیوں کی طرح۔

"وہ جو کروڑوں میں ایک ہے نا
وہ میں خود ہوں بات ختم"

برجستہ برمحل شعر پر سیرت کے لبوں کو بے ساختہ مسکان چھو گئی جو اس نے بایاں ہاتھ منہ کے سامنے لاتے مقابل سے چھپائی مگر آنکھوں کی ہنسی کو چھپانے کے لیے اسے بہت تردد کرنا پڑا تھا۔

"آپ کھل کر مسکرا لیں، میں نہیں دیکھتا آپ کو۔" کمال اطمینان سے کہتے نگاہ اس کے چہرے سے ہٹا لی۔

سیرت نے کھل کر مسکراتے اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھا۔ مغرور نقوش آف وائٹ شرٹ کے کف موڑے وہ با کمال شخصیت کا مالک تھا، آج پہلی بار اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی جو اسے بہت جچ رہی تھی۔ کاش یہ شخص ان لوگوں میں سے نہ ہوتا جنہوں نے ہماری ہنستی مسکراتی زندگی کو دکھوں میں دھکیل رہا ہے یا کاش مجھے اس شخص سے محبت نہ ہوئی ہوتی۔ اپنی سوچوں میں گم اعتراف پر وہ دہل کر رہ گئی، چہرہ زرد پڑ گیا تبھی اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی۔

"آر یو او کے سیرت فاطمہ!" اس نے پریشانی سے موبائل میز پر رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ پھر گلاس میں پانی انڈیل کر اس کے سامنے رکھا۔

"پانی پئیں اور ریلیکس رہیں پلیز میں کوئی آدم خور تو نہیں کہ آپ یوں خوف سے زرد پڑ گئی ہیں۔" نرمی سے کہتے آخر میں اس کا لہجہ غصیلا ہو چکا تھا۔ سیرت فوراً سنبھلی اور سیرت کے چہرے کی رنگت بحال ہوتے دیکھ کر وہ بھی پر سکون ہوا۔

"مجھے بتائیں کیا سوچ رہی تھیں آپ جس نے آپ کو اس طرح رنجیدہ کر دیا تھا۔"

"آپ سے مطلب جو بھی سوچوں۔" اسے دیکھتے رہنے کی خواہش نے سر اٹھایا تو اسے غصہ آ گیا۔

"اف کیا آپ چوبیس گھنٹے غصے میں ہی رہتی ہیں۔" کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے مصنوعی تاسف پوچھا۔

"نہیں مجھے صرف آپ پر غصہ آتا ہے اور اتنا تو آپ کو معلوم ہو گا ہی کہ غصہ ہمیں انہی لوگوں پر آتا ہے جن سے ہم نفرت کرتے ہیں۔"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔" سینے پر ہاتھ رکھتے سر خم کیا (حالانکہ دل تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ غصہ تو پھر انہیں پر آتا ہے جن پر بھروسا مان ہو جنہیں اپنا مانا

ہو)۔

"آپ جانتی ہیں سیرت فاطمہ! زندگی کی سب سے تکلیف دہ چیز کیا ہوتی ہے؟" وہ سنجیدہ ہوا تو سیرت نے نگاہ موڑ کر اسے دیکھا مقابل نے بھی اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ وہ سیرت کو مزید دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔

"زندگی کی سب سے تکلیف دہ چیز یک طرفہ محبت ہوتی ہے عزیز از جان ہستی جب آپ سے نفرت کا اظہار کرے تو جو دل پر گزرتی ہے اسے کوئی نہیں جان سکتا۔" سیرت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یکطرفہ محبت؟ کیا آپ کو کسی سے محبت ہے؟" (وہ اسے تو صاف لفظوں میں کہہ چکا تھا کہ کوئی خوش فہمی نہ پالے اسی تناظر میں اس نے بے یقینی سے پوچھا تھا)۔ وہ اس کے سوال پر بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

نہیں ہو سکتی یہ محبت تیرے سوا کسی اور سے
بس اتنی سی بات ہے اور تم ہو کہ سمجھتے نہیں

"آپ کو محبت ہے کسی سے؟"

"محبت کا تو معلوم نہیں سیرت فاطمہ! مگر......"
اس نے رک کر اس چہرے کو دیکھا۔

"میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ......"

"درد کے پاتال میں ابھرے کبھی تو دیکھنا
پربتوں میں روشنی کے باب ہو جائیں گے ہم

قربتوں کی آندھیوں میں وصل ہوگا حادثہ
مل جائے وہ شخص تو نایاب ہو جائیں گے ہم
"

"بتایا نہیں کیسی ہیں آپ؟" وہ گھوم پھر کر پھر اپنے پہلے سوال پر لوٹ آیا تھا اپنے مخصوص چڑانے والے انداز میں۔

"میں ٹھیک ہوں۔ ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"آپ کہیے سیرت فاطمہ! مجھے آپ کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔"

"آپ سمجھتے ہیں شاید آپ کوئی افلاطون ٹائپ شخصیت ہیں؟" وہ اس کے اس درجہ اطمینان پر جھنجلا گئی۔

"بالکل نہیں سیرت فاطمہ! میں تو ایک عام سا انسان ہوں۔" وہ اسے غصہ دلا کر پرسکون نظر آ رہا تھا۔

"فار گاڈ سیک۔ سیرت عبدالمنان نام ہے میرا۔" اس نے دانت پیسے۔

"آپ خواہ مخواہ خود کو تھکاتی ہیں سیرت فاطمہ! کروں گا تو میں وہی جو میرا دل چاہے گا۔"

"میری بلا سے، چاہے خودکشی کر لیں مگر پلیز یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

"جو میں کہنے آیا ہوں کہہ لوں تو چلا جاؤں گا۔"

"مگر مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی یو گو۔" اس نے غصے سے بایاں ہاتھ ٹیبل پر مارا۔

"سننی تو آپ کو پڑے گی ورنہ میں جاؤں گا نہیں۔" مجال ہے جو سیرت کے غصے کا اس پر رتی برابر فرق پڑا ہو۔ اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر گہری سانس لیتے ہوئے چہرہ اٹھایا۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھا۔

"جتنی آپ کی شکل اچھی ہے نا اگر اس کا ایک فی صد بھی آپ کا کردار۔"

"ہاہاہا۔" اس کی بات درمیان ہی رہ گئی جب وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ سیرت نے زبان دانتوں تلے دباتے خود کو کوسا۔

"بلیوی سیرت فاطمہ! آج تک ان گنت کمنٹ ملے ہیں مجھے اپنی صورت پر ہینڈسم ڈیشنگ اور بھی نجانے کیا کچھ لیکن مجھے آج یقین آیا میں واقعی خوب صورت ہوں آئینہ ہوگا آپ کے پاس خود کو دیکھ تو لوں، تھینک یو۔ تھینک یو سو ویری مچ اس قدر خوب صورت تعریف کے لیے۔"

"ایک بات کہوں؟" سیرت نے اس کی طرف دیکھا۔

"آخری بار اپنی صفائی دیتا ہوں
میں وہ نہیں جو دکھائی دیتا ہوں"

"آپ مجھے برا انسان سمجھتی ہیں ٹھیک ہے میں اس بات کو مان لیتا ہوں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔ "مگر مجھ میں ایک خوبی بھی ہے میں انا پرست انسان نہیں ہوں، تھوڑی دیر قبل آپ نے محبت کے بارے میں پوچھا تھا اس کا جواب ہے ہاں میں بھی کسی کا اسیر ہوں۔"
سیرت نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"پہلی نظر کی محبت کو مانتی ہیں آپ۔ میں اس کا اسیر ہوں، دلوں کے معاملے زبردستی نہیں نبھائے جاتے، اسی لیے آج میں اپنی عزیز ہستی کو یہ عہد دینے آیا ہوں کہ آئندہ اسے تکلیف نہیں ہونے دوں گا میں اس راہ میں آتا ہوں تو اسے تکلیف ہوتی ہے ناں۔" اس نے سیرت کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں چلتا ہوں اور یہ آپ کے لیے۔" جیب سے مخملیں کیس نکال کر اس کے سامنے رکھا تو سیرت گویا نیند سے ہڑبڑا کر جاگی۔

"پہلے تو انگوٹھی لینے کا سوچ تھا پھر سوچا انگوٹھی تو آپ کو پابند کر دے گی پھر یہ لے لیا آپ کو اچھا لگے گا۔"

"میرے لیے کیوں؟" گلابی آنکھوں سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔ (جبکہ اس کا دل رو دیا تھا، اظہار محبت کیا بھی تو کب جب راستے بدل رہا ہے)

"تحفہ سمجھ کر رکھ لیں۔"

"میں اجنبیوں سے تحائف لینا پسند نہیں کرتی۔ سو اپنا گفٹ ساتھ لے کر جائیں۔" اس نے کیس اس کی طرف دھکیلا۔

"آپ کے لیے لایا ہوں تو رکھنا پڑے گا آپ کو، تحفہ دے کر لینا مجھے اچھا نہیں لگتا اصولوں پر چلنا اچھا لگتا ہے مجھے۔" عجیب سر پھرا انسان تھا جو چاہتا تھا صرف اسے سنا جائے اور اسی کا کہا مانا جائے۔

"آپ مجھے فورس نہیں کر سکتے۔" جھٹکے سے اٹھتے ہوئے دونوں ہاتھ میز پر ٹکا کر وہ جھکی۔

"کسی کی خواہش کا احترام کرنا بری بات تو نہیں۔" سیرت کے انداز میں میز پر ہاتھ رکھتے وہ بھی تھوڑا جھکا پھر نگاہ جھکائی سیرت کے نازک سے لانبی مخروطی انگلیوں والے ہاتھ، سامنے تھے بائیں ہاتھ کی درمیان والی انگلی میں نازک رنگ تھی جس میں میرون چھوٹا سا یاقوت دمک رہا تھا وہ مسکرایا۔ (کیونکہ بالکل ایسا ہی گفٹ کیس میں موجود تھا) پھر سیرت کی طرف دیکھا۔

"میری خواہش تھی سیرت فاطمہ کبھی آپ کے ہاتھوں کا لمس محسوس کروں۔" سیرت نے بوکھلا کر نیچے دیکھا جہاں اس کے ہاتھوں کے مقابل سرخ و سفید مضبوط ہاتھ تھے۔ سیرت نے بوکھلا کر ہاتھ پشت پر باندھے جبکہ وہ اس کی حرکت پر محظوظ ہوتا ہنس دیا۔

"آپ نے غور نہیں کیا سیرت فاطمہ! میں نے بھی کہا تھا ہے نہیں، ورنہ مجھے آپ بھی نہیں روک سکتی تھیں۔ ڈونٹ وری میں ایسا کچھ نہیں کرنے والا میں چلتا ہوں آپ شاید فرینڈ کی شادی میں جا رہی ہیں آل ریڈی لیٹ ہو چکی ہیں میری وجہ سے۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"ایکچولی نا۔" سر کھجاتے سیرت کا گلابی چہرہ دیکھا۔ "میں نے آپ کی اور ہما کی باتیں سن لیں۔" مجال ہے جو وہ اپنی غیر شریفانہ حرکت پر شرمندا ہوا ہو الٹا مسکرا کر بتا رہا تھا۔

"سچ بتاؤں تو میرا سو فیصد ارادہ تھا آپ کی تعریف کرنے کا مگر کیا کروں کہ اپنا سر بہت عزیز ہے۔" نوٹ پیڈ پر فون نمبر لکھتے وہ سیرت کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ "بھری جوانی میں مرنا نہیں چاہتا۔" صفحہ پھاڑ کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ میرا پرسنل نمبر ہے چوبیس گھنٹے آن رہتا ہے آپ کا جب دل چاہے رابطہ کر سکتی ہیں اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ سیرت کو ہکا بکا چھوڑ کر پلٹا مگر دروازے کے قریب پھر سے رک کر مڑا وہ ابھی تک گم صم کھڑی تھی۔

"تعریف ادھار رہی کسی مناسب وقت پر قرض اتار دوں گا۔"

☆☆☆

''آخر تم لوگ کہاں جھک مارتے پھر رہے ہو۔'' داور ملک نے اخبار سنی کے منہ پر دے مارا۔

''میں نے کہا تھا آپ سے بابا سائیں کچھ سوچیں مگر آپ تو اسے لڑکی سمجھ کر ڈھیل دیتے رہے۔'' کم غصہ اسے بھی نہ تھا۔

''ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا، اس چھٹانک بھر کی لڑکی کو سبق سکھایا جا سکتا ہے۔ وہ صرف لکھ رہی ہے ثبوت تو ہیں نہیں اس کے پاس۔''

''اس کے ساتھ کون ہے اس سب کے پیچھے؟''

''واصف عمران کرائم رپورٹر۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کچھ حفاظتی تدابیر کر لیں۔ بابا سائیں اور آپ کو معلوم ہے عثمان لاشاری نے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا ہے اس کے لیے۔''

''عثمان لاشاری۔'' داور ملک حیران ہوئے۔

''جی عثمان لاشاری آپ کے حریف۔''

''اب آئے گا اصل کھیل کا مزا، ایک تیر سے دو شکار۔''

☆☆☆

آج کتنے دنوں بعد سیرت نے وہ سرخ مخملی کیس نکالا تھا۔ کھلنے پر نازک سی گولڈ کی چین میں آنسو شیپ میرون یاقوت دمک رہا تھا ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہوں میں سنی داور سے تمام ملاقات گھوم گئیں، وہ جزئیات کے ساتھ اسے یاد تھا اس کے بات کرنے کا انداز، کسی بات سے اتفاق کی صورت سینے پر ہاتھ رکھتے سر خم کرنا اس کی آنکھیں تیزی سے نم ہوئیں لاکٹ ہتھیلی پر رکھا۔

''جس کی یادوں سے رہائی نہیں ممکن محسن
وہ سمجھتا ہی نہیں اپنا گرفتار مجھے''

اس نے بے دردی سے آنسو رگڑے، تمام تر نفرت، مضبوط قوت ارادی کے باوجود وہ کامل احساسات کی نازک سی لڑکی تھی، جس پر تمام تر جذبے اثر انداز ہوتے تھے۔ اس صورت میں یہ جذبے زیادہ اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں جب سامنے والے کا انداز ہی دل موہ لینے والا ہو۔ آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔ وہ آخری بار اس محبت کے لیے رو رہی تھی جس کا شروع دن سے انجام معلوم تھا۔ مجھے اپنے بابا سے بے وفائی نہیں کرنی سنی داور، مجھے ان راستوں پر نہیں چلنا جن راستوں پر میرے پیارے رشتے کے خون کے چھینٹے پڑے ہوں۔ آج کے بعد تم میرے لیے اور میں تمہارے لیے مر چکے، آنسو پونچھتے عزم سے اٹھی، حلیہ درست کر کے فون اور بیگ لے کر آپی کو بتا کر وہ گھر سے نکل آئی تھی۔

سنی داور! ان راستوں پر آج میں آخری بار سفر کر رہی ہوں تم نے مجھے کیا اتنی کمزور لڑکی سمجھ رکھا تھا جو اپنے باپ کے قاتلوں کو معاف کر دے گی شاید یہ تمہاری زندگی کی غلط فہمی ہے۔ آج تمہارے روبرو تمہارا گریبان تھام کر اپنے بابا کا حساب لینے کا دن ہے۔ تیار رہو سیرت عبدالمنان کا سامنا کرنے کے لیے۔

گاؤں کی حدود میں داخل ہونے سے قبل اس نے میسج لکھ کر سنی کے دیے نمبر پر سینڈ کر دیا، پندرہ سیکنڈ بعد اس کی کال آنے لگی مگر اس نے اگنور کر دی بھی میسج ٹیون بجی جو اس نے دیکھے بغیر ڈیلیٹ کر دیا۔

''میں نے آپ کا میسج پڑھے بنا ڈیلیٹ کر دیا ہے، یہی اوقات ہے میری نظر میں آپ کی کسی بھی چیز کی۔ ڈونٹ ٹیکسٹ اینڈ کال می اگین۔''

☆☆☆

کال اٹینڈ کرتے ہی اسے بیتابی سے پکارا گیا۔

''کیا ہوا خیریت؟''

''سیرت فاطمہ گاؤں جا رہی ہیں، انہیں روکو۔ وہاں خطرہ ہو سکتا ہے۔ وہ میری کال اٹینڈ نہیں کر رہیں۔ میں یہاں نہیں ہوں ورنہ خود روک لیتا پلیز تم منع کرو انہیں۔''

''او کے ریلیکس میں کال کرتا ہوں اسے۔'' وہ بے چینی سے واصف کی کال کا منتظر تھا جو بیس سیکنڈ بعد موصول ہوئی تھی۔

''سوری یار وہ گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکی ہے۔''

''او خدا، وہ زندگی میں اتنا بے بس کبھی نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت خود کو محسوس کر رہا تھا۔''

''واصف دعا کرو وہ خیریت سے واپس آجائیں۔'' ''ان شاءاللہ ایسا ہی ہوگا ڈونٹ وری۔''

☆☆☆

''واصف!'' وہ لال بھبھوکا چہرے سے جارحانہ انداز میں — کیبن میں داخل ہوئی تو وہ چونک کر متوجہ ہوا۔

''کیا ہوا سیرت تم ٹھیک تو ہو؟'' اس نے شدت ضبط سے اس کا سرخ چہرہ دیکھتے تشویش سے پوچھا۔

''اذلان احمد لاشاری کون ہے؟'' واصف چند پل کے چپ رہ گیا پھر گہری سانس لیتے سیرت کا چہرہ دیکھا۔

''میرا کزن ہے، عثمان انکل کا بیٹا جس کا پروپوزل بھجوایا ہے۔ ہم نے تمہاری طرف۔''

''وہ ہے کہاں اس وقت؟''

''تمہیں اس سے ملنا ہے بتاؤ مجھے؟''

''میں آپی کے سامنے انکار کر چکی ہوں تمہارے کزن کے پروپوزل کا اور تمہیں بھی کہہ رہی ہوں، بتا دینا اپنی فیملی کو میں ریجیکٹ کرتی ہوں تمہارے کزن کو۔''

''میں وجہ جان سکتا ہوں؟''

''وجہ تو میں تمہیں ہی بتاؤں گی مسٹر واصف عمران۔''

''تم بیٹھو سیرت میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔'' واصف کو اس کے جارحانہ انداز سے بوکھلا دیا۔

''وہ تم ہی تھے نا واصف جس نے مجھے سنی داور سے ملوایا، آج میں مشکل میں ہوں تو وجہ صرف تم ہو، پہلی بار میرا دل چاہا تھا کسی انسان پر بھروسا کرنے کو وہ تم تھے، بھائیوں کا سامان تھا تم پر مگر میں غلط تھی بھائی صرف وہی ہوتے ہیں جو ماں جائے ہوں منہ سے کہہ دینے سے کوئی بھائی نہیں بن جاتا نفرت ہو رہی ہے۔ مجھے خود سے۔'' نم آنکھوں سے کہتے وہ باہر نکل گئی جبکہ واصف ساکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

پچھلے چند دنوں سے ایک ہی کیپ کو وہ مسلسل اپنے تعاقب میں آتے دیکھ رہی تھی، پہلے تو اس نے وہم جانا مگر ایک روز اس کا وہم یقین میں بدل گیا اس کا غصہ بوائلنگ پوائنٹ پر جا پہنچا اسے نامحسوس طریقے سے پروٹیکشن دی جا رہی تھی اور یہ کس کی جرأت تھی سیرت کو معلوم تھا۔ فون کر کے اس نے اسے اپنے روبرو بلایا تھا۔ وقار صاحب اپنی مسز کے علاج کے لیے بیرون ملک گئے ہوئے تھے اور سیرت ان کے آفس میں ہوتی تھی پون گھنٹہ بعد وہ اس کے روبرو تھا۔

''مسٹر ملک آپ کی ہمت کیسے ہوئی اپنے آدمی میرے پیچھے لگانے کی؟'' وہ لڑنے مرنے پر تلی تھی۔ اندر داخل ہوتے واصف کے قدم ٹھٹک کر رکے۔

''آپ کی حفاظت ضرورت ہے سیرت فاطمہ! ایسا کرنا ناگزیر تھا۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''آپ کو میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے' میرے معاملات میں مداخلت کرنا بند کر دیں۔'' دونوں دوبدو جواب دے رہے تھے، سفید شلوار کے ساتھ — بادامی کرتے میں وہ آج از حد سنجیدہ تھا جبکہ سیرت سفید ٹراؤزر کے ساتھ گلابی کرتی میں تھی، سادہ سی چٹیا چہرہ کسی بھی قسم کے میک سے صاف تھا۔

''میں یہ کام پہلے ہی کر چکا ہوں سیرت فاطمہ! مزید کیا چاہتی ہے آپ؟''

''آئندہ آپ کا کوئی بھی آدمی اگر مجھے اپنے پیچھے نظر آیا تو آئی سوئر میں آپ کو اقدام قتل کے جرم میں عدالت گھسیٹوں گی اور یہ صرف دھمکی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے نہیں آئے گا آپ ریزائن کر دیں۔''

''وہاٹ میں کیوں ریزائن کروں۔''

''تو جو جیسے چل رہا ہے چلنے دیں۔'' اس کا انداز — ضدی تھا۔

"آپ کو غلط فہمی ہے کہ صرف آپ ضدی ہیں مگر میں آپ سے زیادہ ضدی ہوں مجھے آپ کی صورت سے بھی نفرت ہے۔"

"میں بخوبی واقف ہوں اس حقیقت سے سیرت فاطمہ بار بار یاد مت دلایا کریں۔" اس کا انداز شکایتی تھا۔

"چھوڑ تو دیا ہے آپ کو آپ کے کہنے پر، لیکن میری وجہ سے آپ جس مصیبت میں گرفتار ہوئی ہیں اس سے آپ کو نکالنا میری ذمہ داری ہے۔ میں آپ کو سمجھا سکتا ہوں کہیں گی تو معافی بھی مانگ لوں گا مگر آپ تو کچھ سننا ہی نہیں چاہتی ہیں تو اب اس کا صرف یہی حل تھا مجھے اپنا فرض نبھانے دیں۔"

"اگر آپ نے کسی ایک لمحے میں میرے لیے اپنے دل میں عزت کا جذبہ محسوس کیا ہے تو آپ آئندہ اپنے کسی بندے کو میرے پیچھے نہیں بھیجیں گے۔"

اس کا چہرہ ایک دم سفید ہوا پھر اوکے کہتا پلٹا اور دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے واصف کو نظر انداز کرتے باہر نکل گیا۔ سیرت اس کے اتنی جلد مان جانے پر حیران تھی تو واصف پریشان، ذرا سی غلطی کی اتنی بھیانک سزا! غلطی کسی کی تھی اور سُولی پر کون چڑھا تھا' وہ نڈھال قدموں سے پلٹ گیا۔

☆☆☆

"اب کیا حکم ہے بابا سائیں؟" داور ملک کے دور اقتدار کا کچا چھٹا بمعہ ثبوت داور ملک کے سامنے تھا۔ وہ بے یقینی سے بیٹھے سامنے پڑے ثبوتوں کو دیکھ رہے تھے آنے والا وقت کس قدر کڑا تھا اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا سُنی داور استہزائیہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے پر سکون بیٹھا باپ کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ لڑکی یہ سب کیسے کر سکتی ہے۔" وہ اب بھی بے یقین سے تھے۔

"واصف عمران ساتھ ہے اس کے' وہی کرائم رپورٹر میں نے دیکھا اور سنا ہے پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اس نے اپنا دن رات ایک کیا ہوا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ عبدالمنان صاحب کے قاتل کو بھی وہ ڈھونڈ چکا ہے۔" وہ یوں مکینکی انداز میں سب بتا رہا تھا گویا اس کا کوئی لینا دینا ہی نہ ہو اس سارے مسئلے سے۔

"وہ لڑکی کس ہاتھ سے لکھتی ہے سنی؟" ساری تقریر سننے کے بعد داور ملک نے بے تاثر سے لہجے میں بالکل غیر متعلقہ سوال پوچھ کر حیران کر دیا۔

"کس ہاتھ سے لکھتی ہے؟" نگاہ اٹھا کر بیٹے کو دیکھا۔

"بائیں ہاتھ سے۔" شانے اچکاتے وہ بے نیاز بن گیا۔

"تو ٹھیک ہے آئندہ وہ ہاتھ قلم تھامنے کے قابل ہی نہیں رہے گا اگر آنے والا وقت ہمارے لیے کڑا ہو گا تو اس کا کچھ حصہ سیرت کو بھی تو ملنا چاہیے اگر ہم نا اہل ہوئے تو اسے بھی ہونا پڑے گا' بخشوا" ملازم کو پکارا جو بوتل کے جن کی مانند حاضر ہوا تھا۔

"حکم سائیں!"

"وہ شہری چھوکری کا بتایا تھا تمہیں اب وہ کام ہو جانا چاہیے، یاد رہے وہ الٹے ہاتھ سے لکھتی ہے اگر آئندہ وہ ہاتھ قلم تھامنے کے قابل رہا تو تم معذور کر دیے جاؤ گے۔"

"جو حکم سرکار۔" بخشو سر خم کرتے پلٹ گیا جبکہ سنی حیران تھا۔

"آپ کیا کروانے والے ہیں بابا سائیں اس کے ساتھ؟"

داور ملک نے ایک بار پھر سے نگاہیں کاغذ پر ٹکائیں۔ "اتنا اچھا لکھا ہے اس کا کچھ خراج تو بنتا ہے۔"

★★★

سیرت کے کہنے کے مطابق کوئی آدمی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا پھر بھی نجانے کیوں اسے لگتا وہ آس پاس ہی ہے اور اس کا وہم حقیقت بن گیا جب شاپنگ سے واپسی پر اس نے ریڈ آلٹو کو اپنے تعاقب میں دیکھا جسے ایک دو بار وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔

"مسٹر ملک!" سنسان ایریا میں گاڑی روکتے اس نے کال ملائی پہلی بیل پر کال ریسیو ہو چکی تھی۔

"آپ اس وقت کہاں ہیں؟" سیرت نے ریڈ آلٹو کو دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔ جبکہ وہ بھی سمجھ چکا تھا ...شناخت کر لیا گیا ہے۔ اسی لیے صاف گوئی سے

"آپ کے پیچھے ریڈ آلٹو میں، میں آتا ...ں۔" دروازہ کھول کر باہر آتے وہ سیرت کے ...آ بیٹھا۔ دونوں چپ سامنے ونڈ اسکرین کے پار ...دیکھتے رہے پھر سیرت نے رخ موڑا۔

"آپ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔" وہ ...ہانسی ہو گئی۔

"میں مجبور ہوں یہ میرے بس میں نہیں۔" اس ...نگاہ موڑنے کی غلطی نہیں کی تھی' سیرت کا چہرہ ...دیکھنے کی اس میں فی الحال ہمت نہیں تھی۔

"میں آپ سے ریکوئسٹ کرتی ہوں پلیز میرا ...پیچھا چھوڑ دیں۔"

"سیرت فاطمہ! پلیز مجھے وہ کام نہ کہیں جو ...میرے بس میں نہیں۔" وہ بھی بے بسی کی انتہاؤں پر ...تھا۔

"آپ کو خطرہ ہے گارڈز کا آپ نے منع کیا، تو ...مت رو کیں میں بہت پریشان ہوں آپ سمجھ ...کیوں نہیں رہیں اگر میں سینکڑوں کام چھوڑ کر صرف آپ کے پیچھے آ رہا ہوں تو میں کوئی سڑک چھاپ لڑکا ...ہوں نہیں سیرت فاطمہ! میں اپنے دل کے ہاتھوں ...مجبور ہوں' مجھے اپنا ہر نقصان آپ کی ذرا سی تکلیف ...کے سامنے ہیچ ہے اگر آپ چاہتی ہیں میں آپ کے ...پیچھے نہ آؤں تو جاب چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں ...میں آپ کا پیچھا چھوڑ دوں گا۔" سیرت نے مضبوطی ...سے آنکھیں بند کرتے ڈھیروں آنسو اندر اتارے۔

"دل کی نہ سن یہ فقیر کر دے گا
یہ جو اداس بیٹھا ہے نواب تھا کبھی"

پھر گلابی آنکھوں سے ضبط کے کڑے مراحل ...سے گزرتے شخص کے سرخ چہرے کو دیکھا جو ابھی بھی ...سامنے سنسان سڑک پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔

"اگر آپ کے دل میں میرے لیے ذرا سی بھی ...عزت ہے تو آپ کو اس کا واسطہ میرے پیچھے مت ...آئیں۔" تم کرلاتے دل اور خشک آنکھوں سے کہے جملے پر وہ تڑپ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے اتنی بڑی سزا مت دیں سیرت فاطمہ پلیز......"

"مجھے نفرت ہے آپ سے، میں جیتی جاگتی احساسات سے بھرپور لڑکی تھی —— کوئی کٹھ پتلی نہیں جسے آزمانے چلے تھے آپ اگر آئندہ آپ کبھی مجھے اپنے پیچھے نظر آئے تو میں اپنی جان دے دوں گی اور اتنا تو آپ جانتے ہی ہوں گے میں عمل کر گزروں گی۔"

سنگ دلی کی انتہا کرتے مقابل کا لٹھے کی مانند سفید چہرہ دیکھتے وہ نگاہ ہٹا چکی تھی۔ وہ بنا کچھ کہے باہر نکل گیا جب ریڈ آلٹو نے اسے اوورٹیک کیا تو ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں' اسٹیئرنگ ویل پر ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"کبھی زندگی سے ہم گلہ کر کے روئے
کبھی موت کی ہم دعا کر کے روئے
عجب سا ہے آغاز محبت کا
کبھی ادا کر کے روئے کبھی قضا کر کے روئے"

☆☆☆

"یار سیانے سچ کہہ گئے ہیں بندہ محبت کے جھنجٹ میں کبھی نہ پڑے۔" سفیان سنجیدگی سے کہتے واصف کے پاس آ بیٹھا۔ اذلان فون پر مصروف تھا سفیان کی طرف متوجہ ہوا جس نے اسے واصف کی طرف اشارہ کیا تھا جو دور خلاؤں میں نجانے کیا دیکھ رہا تھا۔ "محبت خواری کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"وہ کیسے؟" اذلان پھیکا سا مسکرایا وہ واصف کے صوفے کے پاس نیچے فلور کشن پر بیٹھا تھا۔

"اب اس مریض محبت کو ہی دیکھ لو یہاں ہو کر بھی موجود نہیں' تم لکی ہو یار کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑے۔"

"پلیز یار کبھی تو سیریس ہو جایا کریں آپ۔" واصف اذلان کا پھیکا پڑتا چہرہ دیکھ کر جھنجلایا۔

"بھائی میرے میں تو ہمیشہ سنجیدہ ہی ہوتا ہوں ہاں یہ الگ بات ہے کہ تمہیں کبھی نہیں لگتا، تمہیں کیا

لگتا ہے ازلان محبت میں انا ہوتی ہے۔'' سفیان قدرے سنجیدہ ہوا۔

''محبت میں انا کی گنجائش نہیں ہوتی۔'' سر صوفے سے ٹکاتے پلکیں موندیں تو سفیان چونکا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں محترم ازلان احمد لاشاری۔ محبت کے ٹاپک پر کچھ بول رہے ہیں۔'' جبکہ ازلان نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

''انا اور محبت ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، اس جذبے کے لیے دل کا صاف ہونا ضروری ہے۔'' سفیان نے تشویش سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جبکہ واصف لب بھینچے بیٹھا تھا۔'' دل اک کشکول کی مانند ہے۔ اور کشکول فقیری کی علامت، اگر کشکول خالی ہی نہ ہو تو پھر نامرادی مقدر بن جاتی ہے کیونکہ فقیری نام عاجزی کا ہے، جب کاسہ پھیلانا نصیب ٹھہرا تو کیسی انا اور کیسا غرور۔''

''اے ازلان کیا ہوا تمہیں؟'' سفیان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکا۔ پھر جھٹکے سے اٹھا۔

''کیا ہوا تمہیں؟''

''یار میرا دل۔'' اس کا چہرہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ واصف اور سفیان نے تشویش سے اسے دیکھا۔ جو سامنے پڑی چابی کو گھور رہا تھا پھر چابی اٹھائی جو ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی کلائی سے ہوتا درد پورے وجود میں سرایت کر گیا۔

''ازلان پلیز!'' واصف نے اسے جھنجھوڑا۔ وہ واصف کا ہاتھ ہٹاتے اندھا دھند باہر بھاگا وہ نہیں جانتا تھا اسے کہاں جانا ہے۔ مگر پچیس منٹ بعد واصف اسے ہاسپٹل لے آیا تھا۔ جہاں احسن بھائی اور عثمان احمد پہلے سے موجود تھے۔ ازلان نے بائیں ہاتھ کی کلائی کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا، شدید تکلیف کا احساس رگوں کو کاٹ رہا تھا۔

☆☆☆

اس کے سر پر گہری چوٹ تھی اگر چوبیس گھنٹوں میں اسے ہوش نہیں آیا تو وہ کوما میں چلی جاتی۔ وہ یعنی سیرت عبدالمنان اور ازلان احمد لاشاری کی سیرت فاطمہ، آفس سے واپسی پر اس کی گاڑی ایک دم اسی سنسان جگہ رکی تھی جہاں وہ اس کے پاس آتا تھا، دار کھولتے باہر نکل کر بونٹ اٹھایا تبھی تیز رفتار بائیک اس سے ٹکرائی تھی وہ لہرا کر پورے قد سے سڑک پر سر کے بل گری تھی اس کی بائیں نازک سی کلائی پر موٹر سائیکل دوبار گزری تھی۔ کلائی کی ہڈی چکنا چور ہو گئی تھی۔ خوش قسمتی ہمااس کے پیچھے ہی تھی اسی نے احسن بھائی کو کال کی تھی، جب اسے ہاسپٹل لایا گیا تب عثمان اپنے کولیگ کی عیادت سے فارغ ہو کر پارکنگ میں آئے تھے لیکن سیرت کو دیکھتے وہیں رک گئے اور اس وقت وہ آئی سی یو میں زندگی موت کی جنگ لڑ رہی تھی ـــــ باہر کتنے ہی ہاتھ صدق دل سے اس کے لیے دعا گو تھے۔ ازلان احمد لاشاری خود فراموشی کی سی کیفیت سے باہر نکل آیا۔ واصف بھی اس کے پیچھے ہی نکلا کہ ازلان کی ذہنی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ پارکنگ سے نکلتے ابھی وہ فٹ پاتھ پر دو قدم ہی چلا تھا کہ جب ایک بچے نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے بچے کو دیکھا۔

''صاحب بھوک لگی ہے کچھ پیسے دے دو۔'' وہ پنجوں کے بل بچے کے سامنے بیٹھا اور جیب میں ہاتھ ڈال بنا گنے سارے نوٹ اس کے کاسہ میں ڈال دیے۔ بچہ ہکا بکا کبھی نوٹوں کو دیکھتا تو کبھی سامنے بیٹھے وجیہہ شخص کو، واصف نے بے دردی سے لب کچلے جبکہ ازلان کہہ رہا تھا۔''تم دعا کرو میرا ہاتھ (اس نے بایاں ہاتھ بچے کے سامنے پھیلایا۔) سلامت رہے دعا کرو مجھے شفا ملے۔ بہت تکلیف ہے یہاں۔'' وہ رو نہیں رہا تھا مگر انداز دوسروں کو رلانے والا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بچہ ابھی تک حیران پریشان کھڑا تھا کبھی قریبی مسجد سے اللہ اکبر کی صدا ابھری، وہ بچے کو چھوڑ کر مسجد کی طرف بڑھ گیا کیونکہ اللہ سب سے بڑا ہے، نماز عصر کا وقت ہوا چاہتا تھا اذان ابھی ہوئی تھی۔ جماعت میں ابھی کچھ وقت تھا۔ وضو کر کے رومال نکال کر سر پر باندھتے اس

صدق دل سے ہاتھ اس ذات اقدس کے سامنے اٹھائے جو قادر مطلق ہے دنیا کی ہر چیز جس کے کُن کی محتاج ہے۔

وہ با آواز بلند اللہ کی بارگاہ میں دعا گو تھا۔ اس کے گرد نمازیوں کا ہجوم اکٹھا تھا مگر وہ ان سے غافل گڑگڑا رہا تھا۔ چونکا تب جب سب نے یک زبان آمین کہا۔ اس نے بے ساختہ چہرے پر ہاتھ پھیرے جو آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ نگاہ امام صاحب سے ملی جن کے باریش چہرے پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے اسی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''اٹھو، با جماعت نماز ادا کرو۔ ہم سب تمہاری دعا پر آمین کہیں گے۔'' واصف نم آنکھوں سے اس چھ فٹ کے جوان کی پشت کو دیکھ رہا تھا جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا لیکن جس کی شخصیت میں درویشی تھی۔

''محبت کا کوئی ترازو نہیں ہوتا
پروا بتاتی ہے خیال کتنا ہے''

دعائیں رنگ لائی تھیں۔ اسے ہوش آ گیا تھا مگر ہاتھ کاٹے بنا چارا نہیں تھا۔ وہ قلم تھامنے والے ہاتھ سے معذور ہو چکی تھی۔ ☆☆☆

کیا سیرت بھی عام لڑکیوں کی طرح اچھی صورت سے متاثر ہوئی تھی۔ وہ صرف ایک مذاق تھا۔ اس نے ازلان کو سنی داور کے نام سے متعارف کروایا تھا سیرت سے۔ ازلان کا بولا اسکرپٹ بھی واصف نے ہی لکھا تھا ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ ذرا سا مذاق یا پھر غلطی اس قدر سنگین صورت حال اختیار کر جائے گی۔ ازلان لاشاری سیرت عبدالمنان سے پہلی نظر میں محبت کر بیٹھا تھا جبکہ سیرت کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔ ازلان نے اپنی فیلنگز واصف تک سے مخفی رکھی تھیں۔ اس نے اپنے دل کی خواہش پر اسے سیرت فاطمہ پکارنا شروع کیا تھا۔ اسے بہت اچھا لگتا تھا سیرت کا جھنجلایا انداز۔ وہ نہیں چاہتا تھا واصف اس کی فیلنگز سے واقف ہو کر اس ڈرامے کا ڈراپ سین کر دے کیونکہ سیرت، واصف کو بہنوں کی طرح عزیز تھی وہ صرف اسے چڑانے کی خاطر سنی داور بن کر اس سے ملتا رہا اسے خبر نہیں تھی کہ اس کی یہ بے ضرر سی خواہش سیرت کے لیے کس قدر اذیت کا باعث تھی۔ وہ ایسے انسان سے محبت کر بیٹھی تھی جو اس کے باپ کے قاتلوں میں سے تھا، وہ نازک سی لڑکی بیک وقت کتنے محاذوں پر نبرد آزما تھی اس کا اگر ذرا سا بھی ازلان کو پتا ہوتا تو وہ کبھی اس سے اپنی شناخت نہ چھپاتا۔ وہ اس کے سامنے اپنی بے اختیاری بھی ظاہر نہ ہونے دیتا کیونکہ وہ جانتا تھا اگر سیرت کو اس کی فیلنگز پتا چل گئیں تو وہ اس کے سامنے نرم پڑ جائے گی جبکہ اسے تو سیرت چڑتی، جھگڑتی ہی بہت اچھی اور اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

وہ اپنی کیفیت میں مسرور تھا جب عثمان نے اسے بتایا وہ سیرت کو بہو بنانا چاہتے ہیں اسے کس قدر حیرت ہوئی تھی اپنے باپ پر جس نے پہلی نگاہ میں اسے پسند کر لیا تھا ـــــ اس کے لیے تو سیرت فاطمہ کا ازلان کی زندگی میں آنا اللہ کی طرف سے اشارہ تھا، وہ بہت ریلیکس تھا۔ واصف کو سیرت سے معلوم ہوا تھا ازلان اس سے اکثر ملتا ہے اور وہ اس کے بار بار سامنے آنے سے ٹینشن میں تھی اسی لیے اس نے ازلان کو سیرت کے پاس بھیجا تھا کہ وہ اسے اپنی اصل شناخت بتا دے اور وہ اس کے آفس آ گیا تھا، ایک روز قبل وہ اس کے لیے گفٹ بھی لایا تھا لاکٹ، وہ سوچ کر مسکرایا تھا کیونکہ انگوٹھی تو اسے اس کے والدین پہنانے کا سوچ رہے تھے حسن اتفاق تھا اس نے جو لاکٹ لیا تھا اس میں میرون رنگ تھا اور وہ کس قدر پیاری لگ رہی تھی لائٹ سے میک اپ میں یوں لڑتی جھگڑتی، اس نے اس مذاق کو چند دن مزید طول دینے کا فیصلہ کیا البتہ اسے تسلی دے آیا تھا وہ یوں راستوں میں اس کے سامنے نہیں آئے گا اور وہ واقعی نہیں آیا تھا۔ گاؤں سے ملنے والی اطلاعات نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ داور ملک سیرت کے بارے میں کچھ پلان بنا رہا ہے یہ خبر پریشان کن تھی تو دوسری

پریشانی سیرت کے پیغام سے ہوئی تھی۔ وہ گاؤں جا رہی تھی او خدا وہ کیوں آج شہر سے باہر آیا کیوں اس روز اس نے حقیقت سیرت سے چھپائی اگر آج سیرت کو کچھ ہو جاتا تو وہ زندگی بھر خود کو معاف نہ کر پاتا۔ اس کی ڈھیروں کالز سیرت نے مس کی تھیں تو میسج بھی بنا پڑھے ڈیلیٹ کر دیے تھے، ایسے میں صرف واصف تھا جو کچھ کر سکتا تھا مگر وہ واصف کی کال آنے تک گاؤں پہنچ چکی تھی۔ واصف چونکہ تمام حالات سے بے خبر تھا اسی لیے مطمئن تھا۔ اسے لگا اذلان نے تمام حقیقت سیرت کو بتا دی ہو گی اور اس کی غلط فہمی سیرت نے ہی دور کی تھی کہ وہ جب حویلی گیٹ کے سامنے پہنچی تو آنے والا گارڈ وہ نہیں تھا جو پہلی بار آنے پر ملا تھا، جب اس نے سنی داور سے ملاقات کرنے کا کہا تو وہ کس قدر حیران تھا۔

''سائیں آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی یہاں ملک نہیں رہتے۔''

''میں ابھی مہینہ قبل ان سے مل کر گئی ہوں سنی داور سے لینڈ کروزر ہے نا ان کے پاس۔'' اس نے بے یقینی سے گارڈ کی بات سنتے ہوئے گاڑی کا نمبر بتایا تو گارڈ نے سر نفی میں ہلایا۔

''سائیں یہ نمبر اذلان صاحب کی گاڑی کا ہے اور یہ حویلی عثمان لاشاری صاحب کی ہے۔ ابھی مہینہ پہلے ان کے رشتے دار آئے تھے نا حویلی تو ساتھ اذلان صاحب بھی تھے الیکشن لڑ رہے ہیں نا عثمان لاشاری صاحب اسی لیے تو یہ رنگ روغن کروایا ہے۔''

اور سیرت بت بنی ساکت رہ گئی۔

وہ جس ذہنی اذیت کا شکار تھی وہ تو سرے سے تھی ہی نہیں، اسے آپی نے بتایا تھا عثمان لاشاری نے اس کے لیے اپنے بیٹے اذلان کا پروپوزل دیا ہے اور انہیں وہ بہت پسند بھی ہے تو کیا اسے بے وقوف بنایا گیا تھا، اسے پرکھنے والے واصف اور اذلان کون ہوتے تھے، اس کی پچھلے ایک ماہ کی اذیت کا ذمہ دار کون تھا واصف یا اذلان لاشاری؟ اگر اس نے ذہنی اذیت سہی ہے تو اس سے اذلان احمد اور واصف کو بھی گزرنا ہو گا۔ اس نے رشتے سے انکار کر دیا۔ عثمان حیران تھے اس انکار پر اور اذلان اور واصف اس انکار کے محرک سے بخوبی آگاہ تھے لیکن فی الحال سیرت کی جان کو خطرہ تھا اور اذلان نے اس کا حل نکال لیا تھا مگر سیرت نے اسے اپنے معاملات سے بے دخل کر دیا تھا۔ وہ دوہری اذیت میں تھا۔

ہاتھ کا آپریشن ہو چکا تھا چوٹیں بھی ٹھیک تھیں ہاسپٹل میں ہی واصف نے اسے حقیقت بتا کر معافی مانگی تھی اور اذلان کی کیفیت بھی کہ وہ کس قدر پریشان ہے عثمان اور صوفیہ بھی متواتر آتے رہے تھے اس کے پاس نہیں آیا تھا تو صرف اذلان لاشاری مگر وہ جانتی تھی اذلان ہاسپٹل کے آس پاس ہی ہو گا وہ تمام حقیقت جان کر اذلان کو معاف کر چکی تھی لیکن وہ تھا کہ چھپ کر بیٹھ گیا تھا، وہ گھر آ گئی تھی اور اکثر دائیں ہاتھ سے لکھنے کی پریکٹس کرتی رہتی تھی پانچ ماہ کی مسلسل کوششوں سے وہ سیدھے ہاتھ سے روانی سے لکھنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

ڈیڑھ ماہ قبل داور ملک اور سنی داور کا ایسا ہی خوف ناک ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں بیٹا موقع پر جاں بحق ہو گیا تھا اور داور ملک دونوں ٹانگوں سے معذور، یہ قدرت کا انصاف تھا دوسروں کو معذور دیکھنے والا خود لاچار پڑا تھا۔ جواں سالہ بیٹے کی جدائی اسے خون کے آنسو رلاتی تھی۔ ہر عمل کا مکافات عمل ہوتا ہے اور یہی بے بسی اور اذیت داور ملک کا مکافات عمل تھی۔ عثمان لاشاری واصف کے منہ سے سیرت کے انکار کی وجہ سن کر اس قدر حیرت میں ڈوبے کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہے تھے۔ انہوں نے انتہائی بے یقینی سے سر جھکائے بیٹھے بیٹے کو دیکھا تھا انہیں یقین نہ آیا جو انہوں نے سنا کیا وہ سچ تھا کیا اذلان ایسی کوئی حرکت کر سکتا تھا؟

''کیا یہ سچ ہے اذلان؟'' ان کے لہجے سے بے یقینی جھلکی۔ مجرموں کی طرح جھکا سر ان کے لیے اذیت کا باعث تھا انہیں بے انتہا غصہ آیا۔

''اسٹینڈ اپ اذلان لاشاری۔'' وہ بوکھلا کر کھڑا ہوا وہ باپ جنہوں نے بچپن سے آج تک کبھی اس سے بلند آواز سے بات نہیں کی تھی آج وہ گرج اٹھے تھے۔ اس کا ردعمل فطری تھا۔ واصف بھی اٹھ کر ان کے سامنے اذلان کے ساتھ سر جھکا کر کھڑا ہوا۔ ''تم اتنی بری حرکت کیسے کر سکتے ہو؟ شرم آ رہی ہے مجھے یہ سوچ کر کہ میرا بیٹا ایک نازک سی لڑکی کے جذبات سے کھیلتا رہا ہے۔'' صوفیہ بھی بے یقینی سی بیٹھی یک ٹک اذلان کو دیکھ رہی تھیں جس نے باپ کی بات پر تڑپ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا بابا یقین کریں میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں خود سے بھی بڑھ کر۔''

''اگر عزت کرتے تو اسے یوں اذیت نہ دیتے اذلان تم تصور نہیں کر سکتے جب آنکھوں کے سامنے جان سے پیارے رشتے بچھڑتے ہیں تو یہ کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔'' اذلان نے سختی سے لب بھینچے اذیت اس سے بہتر کون جان سکتا تھا وہ دل کھول کر آپ کو نہیں دکھا سکتا تھا نم آنکھیں باپ سے چھپانے کی خاطر اس نے سر جھکا لیا۔

''اس نے اپنے والد کو کھویا تھا ان لوگوں کی وجہ سے جو تم بن کر اس کے سامنے ڈھٹائی بلکہ بے حسی سے جاتے رہے ہو۔''

''انکل پلیز اذلان کا اس سب میں کوئی قصور نہیں قصوار میں ہوں پلیز آپ کو جو بھی کہنا ہے مجھ سے کہیں۔'' واصف جو اس کی محبت کا گواہ تھا، بولے بنا رہ نہ سکا۔ عثمان نے اسے گھورا۔

''ٹھیک ہے میں کچھ نہیں کہتا اذلان سے اور تم سے بھی جو ہوا اسے بھول کر نئی شروعات کرتے ہیں اور نئی شروعات کے آغاز پر میں سیرت کے انکار کو تسلیم کرتے اپنی خواہش سے دستبردار ہوتا ہوں۔'' اذلان نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا اس آنکھوں سے جھلکتے جذبوں کی شدت سے ایک پل کے لیے تو عثمان خائف سے ہو گئے۔ بے اختیار نگاہ چرا کر واصف کی طرف دیکھا جو خود سکتے میں کھڑا تھا۔

''میں نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے نا واصف تم لوگوں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-
زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

میرے خواب لوٹا دو — نگہت عبداللہ — قیمت -/400 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کی حرکت کا یہی جواب ہے۔''

''بابا۔'' ازلان نے ان کی طرف دیکھا اور ان کے قدموں میں آبیٹھا۔

''مجھے اتنی بڑی سزا نہیں دیں پلیز۔'' اس نے عثمان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچا۔ دونوں میاں بیوی بیٹے کی کیفیت پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے اس کی حالت گواہ تھی سیرت عبدالمنان اس کی زندگی میں کیا مقام لے چکی تھی۔

''آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا لیکن پلیز سیرت فاطمہ والی خواہش سے دستبردار نہ ہوں میں سب سے معافی مانگ لوں گا۔'' صوفیہ نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

''ہمارے بیٹے کی خوشی اگر سیرت سے مشروط ہے تو ہم دوبارہ جائیں گے احسن کے گھر میں خود بات کروں گی سیرت سے اور دیکھنا اس بار وہ انکار نہیں کرے گی۔''

☆☆☆

انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا تھا جس کے نتیجے میں ڈیڑھ ماہ بعد سیرت عبدالمنان، ازلان احمد لاشاری کے سنگ لاشاری ہاؤس میں موجود تھی، ماسٹر بیڈروم ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔ کمرے کی سجاوٹ میں تازہ گلاب استعمال کیے گئے تھے پھولوں اور ایئر فریشنر کی خوشبو ماحول کو معطر کیے ہوئے تھی تبھی آہٹ پر سیرت نے سر جھکاتے ہوئے گھونگھٹ ناک تک کھینچ لیا آنے والا چند سیکنڈز وہیں رکا رہا پھر اس کے سامنے بیڈ پر آبیٹھا، جھکے سر اور گھونگھٹ کے باعث وہ اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا، مگر سیرت کے بائیں مصنوعی ہاتھ کو دیکھ کر اس کی پلکیں نم ہوئی تھیں مگر اس نے آنسو اندر اتار کر نازک سے وجود کو دیکھا جو اس کے منتخب کردہ لباس میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اسے یاد آیا جب اس نے ماں کے سامنے فون پر ویڈنگ ڈریس دکھایا تو انہوں نے کس قدر حیرت سے اسے دیکھا تھا میرون چوڑی دار پاجامہ اسکن کلر شرٹ اور دوپٹہ پر میرون کامدار پٹیاں لگی تھیں بلاشبہ وہ خوب صورت ڈریس تھا مگر دلہن کے لیے اتنا سادہ لباس۔

''ازلان یہ تو بالکل سادہ ہے بیٹا لوگ کیا کہیں گے عثمان لاشاری نے اکلوتی بہو کے لیے کیا ڈریس بنوایا ویسے بھی لہنگا لے لیا ہے میں نے۔''

''کہنے دیں مما جو کوئی بھی کہتا ہے مگر دلہن کا ڈریس یہی چاہیے مجھے، ولیمے کے لیے جو آپ مناسب سمجھیں۔'' اور ماں نے اس کی بات مان لی تھی۔ وہی کلر کمبینیشن آج سیرت نے زیب تن کیا تھا مگر فرق یہ تھا کہ اس روز لباس میں کامدار پٹیاں تھیں لیکن آج شیفون کا دوپٹہ شرٹ مختلف اسٹونز ورک سے جھلملا رہا تھا، اس نے خود بھی اس وقت شیروانی کے بجائے سفید کاٹن کا کڑکڑاتا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور سفیان، واصف، ریحان کے اصرار کے باوجود شیو نہیں بنوائی تھی کیونکہ اسی رنگ اور بڑھی شیو میں سیرت نے اس کی بے ساختہ تعریف کی تھی اور اس وقت وہ اس کے پسندیدہ روپ میں اس کے سامنے بیٹھا تھا ہلکا سا کھنکارتے ہوئے اس نے سلام کیا تھا۔ جس کا جواب حسب توقع نہیں آیا تھا دلکش سی مسکان لبوں پر سجائے اس محبت سے گھونگھٹ اٹھایا تو مبہوت ۔۔۔ رہ گیا، گولڈ کا نازک سا جیولری سیٹ اور ڈارک میک اپ میں وہ اس کی توقع سے بڑھ کر خوب صورت لگ رہی تھی۔

''دیکھنے میں وہ گلابوں کا شجر لگتا ہے
باوضو ہو کر بھی چھونے سے ڈر لگتا ہے''

سیرت نے اس کی نگاہوں کے ارتکاز پر چہرہ مزید جھکاتے گھٹنے سمیت کران پر ٹکا لیا۔ ازلان اسی کی طرف متوجہ تھا جو بری طرح نروس تھی۔

نرمی سے اس کا نازک سا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے اس نے جذب سے سیرت کا چہرہ دیکھا۔

''کچھ کہیں گی نہیں؟'' سیرت کا سر نفی میں ہلا۔

''مطلب مجھے معاف کر دیا آپ نے؟'' وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ بندہ پوچھے بھی اس قدر دوسرے کو کنفیوژ کر کے کون معافی مانگتا ہے۔

''میں ہر اس حرکت کے لیے معذرت خواہ

ہوں جس کی وجہ سے آپ کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچی ہو میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ زندگی میں آپ کو اپنی ذات سے اتنی خوشیاں دوں گا کہ آپ تمام دکھ بھول جائیں گی ان شاء اللہ۔'' ہاتھ چھوڑتے نرمی سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں سمیٹا۔ لرزتی پلکوں کا رقص مبہوت کر دینے والا تھا اور وہ مبہوت ہی ہو رہا تھا کچھ دیر بعد اس کے لبوں کو مسکان چھو گئی تو اس کی بندیا چھوتے قدرے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''سو جب آپ نے مجھے معاف کر ہی دیا ہے تو دوستی پکی؟'' دایاں ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا۔ سیرت نے سرخیاں چھلکاتے مضبوط ہاتھ سے بے ساختہ نگاہ چرائی۔

''بتائیں نا دوستی سیرت فاطمہ!''

''فار گاڈ سیک میرا نام سیرت عبدالمنان ہے۔'' اس بار سیرت خفگی سے بولے بنا رہ نہ سکی تو ازلان اس کی حرکت پر محظوظ ہوتا قہقہہ لگا کر ہنس دیا سیرت نے لب دانتوں تلے دبائے کیونکہ ازلان کی شرارت وہ سمجھ چکی تھی پھر ازلان کے متبسم چہرے کو دیکھتے خود بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

پانچ سال بعد!

سفید کلیوں والی فراک پہنے لائٹ سے میک اپ اور جیولری میں ملبوس سیرت دو ماہ کے جبریل کو گود میں لیے دروازہ بند کر کے پلٹی تو نگاہ سامنے تین سالہ آیت کو گود میں لیے اپنی طرف متوجہ ازلان سے ٹکرائی تو اس کے لبوں کو دلکش سی مسکان چھو گئی، وہ شخص اپنی محبت کے سب ہی وعدوں میں سچا تھا گزشتہ پانچ برسوں میں اس نے اپنی ذات سے سیرت اور ازلان کو اتنی خوشیاں اور محبتیں دی تھیں کہ وہ بلاناغہ شکرانے کے نوافل پڑھتی تھی۔ تبھی ازلان کے فون کی رنگ ٹیون پر وہ چونکا کال کرنے والا واصف تھا۔

''تمہیں چین نہیں آتا بدتمیز ہمیشہ غلط وقت پر کال کرتے ہو؟'' ازلان نے مصنوعی خفگی سے اسے ڈپٹا۔ سیرت اس کے انداز پر مسکرا دی۔ واصف کی شادی بھی ازلان کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا فہد جس کی چوتھی سالگرہ تھی اس روز وہ لوگ وہیں جا رہے تھے مگر واصف کو دن میں بیسیوں کالیں کرنے کی عادت تھی اکثر ازلان اس کی عادت سے چڑ جاتا۔ اس نے صحیح معنوں میں سیرت کو بھائی بن کر دکھایا تھا۔

''تم ہمیشہ سے خوش فہم رہے ہو ازلان لاشاری میں تمہارے لیے نہیں اپنی بہن اور بھانجی بھانجے کے لیے کال کرتا ہوں۔'' واصف نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

''تو ڈائریکٹ بہن کا نمبر ہی ملا لیا کرو۔''

''وہ کیا ہے نا ازلان! میں نے تمہیں اپنی بہن کا سیکریٹری بنایا ہوا ہے، تم جب میری کال اٹینڈ کر کے سیرت کو بتاتے ہو کہ تمہارا فون ہے تو مجھے بڑی زبردست سی فیلنگ آتی ہے۔''

''کون سی فیلنگ؟'' ازلان حیران ہوا۔

''وہی صاحب بی بی والی۔'' واصف اپنی بات انجوائے کرتے خود ہی ہنس دیا تو ازلان بھی مسکرا دیا۔ پھر سامنے دیکھا سیرت اسی کی طرف متوجہ تھی۔

''بہت اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا آئندہ ڈائریکٹ اپنی بہن کے نمبر پر کال کرنا، اللہ حافظ۔'' کال کاٹ کر فون جیب میں ڈالتے سیرت کو چلنے کو کہا۔

''کیا کہہ رہے تھے واصف بھائی؟'' ازلان کے ہم قدم ہوتے اس نے نرمی سے پوچھا ازلان نے ایک نظر اسے دیکھا۔

''ہاں تمہیں بتا دوں تاکہ دونوں بہن بھائی میری بینڈ بجا دو، ابھی اتنا عقل سے پیدل نہیں ہوا میں۔''

آیت کی پیشانی چومتے اپنے پاس ڈرائیونگ سیٹ پر سیرت اور اپنے درمیان بٹھایا۔ انداز اس قدر دلچسپ تھا کہ سیرت بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ازلان نے بہت محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''میری آنکھوں میں بھر گیا ہے وہی
ہاں وہی جس سے جی نہیں بھرتا''

☆☆

گل ناز

مقید ذات

"سنا ہے رقیہ نے اپنے بیٹے کا رشتہ کردیا ہے۔" ثمینہ نے اپنی دیورانی کو اطلاع دی تھی۔

"اچھا...... کب؟ کس سے؟ کہاں؟ لڑکی کیسی ہے؟" نازیہ کو تعجب نے گھیرا تو حسب عادت سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ اس کی جلد بازی پر ہمیشہ کی طرح ثمینہ جہاں بیگم جھنجھلا گئیں۔

"افوہ...... ایک تو تمہاری یہ عادت بڑی خراب ہے۔ ایک دم شروع ہوجاتی ہو۔ بندہ صبر رکھتا ہے کچھ......"

"اب خبر ایسی ہو تو صبر کیسا؟" جیٹھانی کی ناگواری پر بھی نازیہ باز نہیں آئی۔

"اچھا...... اب بتا بھی دیں؟"

"وہ جو ماڈل ٹاؤن والے اقبال صاحب تھے ناں...... ان کی چھوٹی بیٹی سے کیا ہے؟"

"ہائے اللہ...... یہاں کہاں پھنسا دیا آپا نے جنید کو۔ وہ تو بہت عجیب سی لڑکی ہے۔" نازیہ کو بے صبرے پن کے ساتھ ساتھ منہ پھٹ ہونے کی بیماری بھی تھی، سو فوراً کہہ دیا۔

"اس میں کون سی عجیب بات دیکھ لی، تم نے اچھی بھلی لڑکی ہے۔ آپا کو کچھ مناسب لگا ہوگا، تب ہی رشتہ مانگا ہے۔"

اندر آتے شرجیل نے بیوی کا آخری جملہ سنا تو کہے بغیر نہ رہ سکا۔ نازیہ شوہر کو دیکھ کر گڑبڑا گئی۔

"میرا مطلب تھا کہ جنید اتنا اچھا قابل بچہ ہے، اس کے جوڑ کی دیکھ لیتیں کوئی۔"

"جنید اگر اچھا بچہ ہے تو وہ بچی بھی پیاری ہے۔ خبردار اب تم ایسی کوئی بات کسی کے سامنے مت کرنا، دل خراب ہوگا آپا اور جنید کا۔" شرجیل کو بیوی کا پتا تھا، پہلے ہی خبردار کردیا۔

"اور ہاں...... اس اتوار کو آپا باقاعدہ منگنی کی رسم کرنے جائیں گی...... تم لوگ بھی تیاری کرلینا۔"

"ہاں ہاں...... بس بھائیوں سے تعلق ہے آپا کا۔ بھابیوں سے تو جھوٹے منہ بھی جانے کا نہیں کہا...... بلکہ تاریخ طے کرتے وقت بھی نہ پوچھا دعوت بھی بھائیوں کو دے دی، جب سارے کام بھابیوں کے بغیر ہورہے ہیں تو منگنی میں بھی ہماری شرکت اتنی ضروری نہیں ہے۔"

ثمینہ جہاں کو دیور کی بات پر خوب تپ چڑھی تھی۔

"اور نہیں تو کیا، ہم کیا اتنے گرے پڑے ہیں جو بن بلائے، منہ اٹھا کر چل دیں۔" شرجیل کے کمرے میں جاتے ہی نازیہ بھی جوش میں آگئیں۔

"ارے آپا ہمیشہ ہی ایسے کرتی ہیں، ادھر بھائیوں کا سانس نہیں آتا بہن کے بغیر اور بہن کو پروا ہی نہیں۔ دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا ہمیں تو......"

اب دونوں دیورانی جیٹھانی نند کی کردہ ناکردہ کوتاہیوں کو گنوانے لگیں۔

☆☆☆

رقیہ آپا، شرجیل اور نبیل سے بڑی تھیں۔ نبیل سے چھوٹے پانچ بہن بھائی، کم سنی میں ہی فوت ہوچکے تھے۔ اسی لیے شرجیل ان دونوں بھائی، بہن

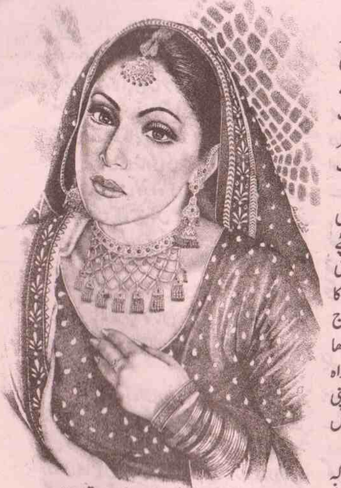

کافی چھوٹا تھا۔ ابا کی وفات حرکت قلب بند ہوجانے سے ہوگئی تھی جب شرجیل دو ماہ کا تھا۔ اماں ابھی سلامت تھیں مگر چونکہ ان کو بہوؤں کے ساتھ رہنا تھا۔ زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھیں۔ ایک چپ سو سکھ کے مصداق...... گوکہ وہ سکھ بھی ان کو خاطر خواہ نہیں ملتے تھے۔ بہرحال ان کی کم گوئی کے باعث کافی حد تک سارے معاملات ٹھیک چل رہے تھے۔

نبیل کی بیوی ثمینہ جہاں، ابا کے دوست کی بیٹی تھیں۔ جس کا رشتہ وہ ثمینہ بیگم کی پیدائش پر اپنے بیٹے کے لیے مانگ چکے تھے۔ ثمینہ جہاں جوانی میں کافی ہوشیار طبیعت کی تھیں اور رقیہ آپا پہلی نظر میں ہی ان کا مزاج بھانپ چکی تھیں۔ وہ نبیل کی طبیعت اور مزاج بھی اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ سادہ مزاج کا سیدھا سادہ سا لڑکا تھا۔ چودہ جماعت پڑھ کر جب خاطر خواہ نوکری نہ ملی تو کچھ جوڑ توڑ کیا اور کچھ ادھار لے کر اپنی دکان کھول کر بیٹھ گیا۔ جو چند سال بعد سپر اسٹور میں تبدیل ہوگئی تھی۔

اتنے پیارے بھائی کے لیے وہ چاہتی تھیں کہ ان کے مزاج کی لڑکی ملے مگر ابا چونکہ بچپن میں زبانی ہی کہہ چکے تھے سو بارات لے جانا پڑی اور وہی ہوا۔ اماں، نبیل اور شرجیل سیدھے سادے سے تھے اور ان کی مٹھی میں چلے گئے۔ رقیہ آپا سیدھی ضرور تھیں مگر بے وقوف نہیں تھیں۔ اچھی خاصی سمجھ دار اور بردبار خاتون تھیں۔ شوہر بھی ہم مزاج ملا تو سمجھ داری گویا سوا سیر ہوگئی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ بھابی کو تگنی کا ناچ نچاتی تھیں بلکہ وہ ان کی چال بازیوں کو بہت سہولت سے رفع دفع کرتیں۔ وہ بھی ان کے جھانسے میں نہیں آئی تھیں۔

ثمینہ جہاں اپنی فطرت سے مجبور کچھ نہ کچھ ہنگامہ کیے رکھتی تھیں مگر رقیہ آپا نے کبھی ان کے فساد کو بڑھاوا نہیں دیا۔ ہمیشہ بات کو دبا جاتیں۔

ثمینہ کے دو بیٹے اوپر تلے کے تھے اور دونوں رقیہ آپا کے اکلوتے بیٹے جنید سے پانچ، چھ سال چھوٹے تھے۔ رقیہ آپا کا ایک ہی بیٹا جنید تھا۔ اس کے بعد دو بیٹیاں ہوئیں مگر وہ دونوں پیدائش کے بعد جانبر نہ ہوسکی تھیں تو انہوں نے جوان بیوہ نند کی بیٹی کو گود لے کر، نند کا نکاح کروادیا تھا (اب اس نند کے بھی تین بچے تھے) اور یوں رقیہ آپا دو بچوں والی ہوگئیں۔ بیٹا جنید اور بیٹی ماہم......

شرجیل کے رشتے کی باری آئی تو رقیہ آپا اپنی نند کی جیٹھانی کی بہن کو پسند کرچکی تھیں۔ مہوش، بہت خوش شکل اور خوش مزاج لڑکی تھی مگر ثمینہ اسے ہرگز ہرگز دیورانی نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ وہ دیور کے لیے اپنی پسند کی بیوی لانا چاہتی تھیں۔ جو ان کی ہاں میں ہاں ملائے اور ان کے لیے بھی دردسر نہ بنے۔ اس لیے وہ اپنی خالہ زاد پر زور دے رہی تھیں اور وہی ہوا۔ رقیہ آپا کے لاکھ اعتراض کے باوجود وہ چپکے چپکے خود ہی رشتہ طے کرآئیں۔ اماں، رقیہ آپا، شرجیل اور نبیل کو رشتہ پکا ہونے کے بعد پتا چلا تو وہ سب ہکا بکا رہ

گئے۔

اماں اور رقیہ آپا کڑوا گھونٹ پی کر رہ گئے، رہ گیا شرجیل تو وہ لا ابالی سا لڑکا تھا۔ نازیہ کی ظاہری خوب صورتی دیکھ کر ہی فدا ہو گیا۔ (نازیہ کے اندر کی خوبیاں ہر شادی کے بعد ظاہر ہوئے۔)

شرجیل کی شادی کی تیاری بھی ثمینہ بیگم نے خود ہی کی تھی۔ ساس کو تو وہ کسی خاطر میں لاتی ہی نہ تھیں، نند سے بھی کسی چیز میں مشورہ نہ لیا۔ بری میں کتنے سوٹ ہوں گے، زیور کیسا ہوگا۔ وہ سب اپنی مرضی سے کر رہی تھیں۔

رقیہ آپا سمجھ دار تھیں۔ جانتی تھیں اگر بھابھی سے بیر باندھ لیا تو ماں کے لیے مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ دوسرا ان کے لیے میکے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

لیکن اب وہ ان دونوں سے کترانے لگی تھیں۔ خاندانی معاملہ ہو یا گھریلو...... وہ ان کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی تھیں۔ بس چپکے سے دونوں بھائیوں سے بات کر لیتیں۔ رفتہ رفتہ وہ دونوں بھی اپنی اپنی بیگمات کی فطرت کو جان چکے تھے۔

نبیل کے دو بیٹے تھے۔ اسامہ اور زین...... جبکہ شرجیل کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹا بڑا تھا اور بیٹیاں سات سال بعد جڑواں ہوئی تھیں۔

عمروں کے فرق کے باعث ماموں اور پھوپھو کے بچوں میں خاص دوستی بھی نہ تھی۔ رقیہ آپا کا جنید ان سب میں بڑا تھا اور اب تعلیم مکمل کر کے نوکری کر رہا تھا جبکہ اوروں کے بچے ابھی زیر تعلیم تھے۔ رقیہ آپا کے دل میں بیٹے کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ لڑکیاں پسند کرنے کی باری آئی تو رقیہ آپا کے سسرال میں صنف نازک کا کال تھا۔

ویسے تو انہیں اپنی بھتیجیاں جان سے پیاری تھیں لیکن بھابیوں کی فطرت کے پیش نظر، شاید وہ کبھی اپنی بھتیجیوں کو بہو نہ بناتیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ جنید سے بہت زیادہ چھوٹی تھیں۔ بہر حال لڑکی دیکھنے جانے لگیں تو ماں بولیں۔

"ایک بھاوج کو ساتھ لے لو۔ بعد میں جھگڑا کریں کہ ہم سے تو پوچھا نہیں۔"

رقیہ آپا ماں کے کہنے کے احترام میں ثمینہ بھابھی کو لے کر چل پڑیں۔ لڑکی مناسب تھی، درمیانے قد کی درمیانی سی لڑکی تھی۔ مزاج بھی نرم تھا اور شاید مزاج کی ہی حلاوت چہرے پر بھی تھی جس سے وہ کم عمر دکھ رہی تھی۔

اس کے سارے انداز بڑے سبک تھے اور ٹھنڈے بھی۔ کہیں جوش اور جذباتی پن نظر نہیں آ رہا تھا۔ آپا کو لڑکی دل و جان سے پسند آئی تھی، مگر ثمینہ بیگم کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

"یہ ہمارے جنید کے قابل تو نہیں۔"

ایک تو ان کا گھرانہ متوسط تھا۔ باپ کالج کا لیکچرار تھا۔ ماں گھریلو سادہ مزاج تھیں۔ بڑی دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اب یہ رہتی تھی، بھائی اس سے چھوٹا اور زیر تعلیم تھا۔

بناوٹ سے دور صاف ستھرا اور وضع دار سا گھرانہ تھا ان کا۔ ثمینہ بھابھی کو سب سے پہلا اعتراض لڑکی پر ہوا۔ وہ بالکل (حقیقتاً) دھلے منہ کے ساتھ ان کے سامنے آئی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کا لان کا سوٹ، سیدھی مانگ جو آدھی دوپٹے میں چھپ گئی تھی۔ باقی دوپٹا پورے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ فطرتاً خاموش اور با ادب...... تیزی طراری نام کو بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

"آپا...... آپ کو یہی ایک لڑکی ملی ہے ہمارے جنید کے لیے۔ ارے اس کو لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔ لاکھوں نہ سہی ہزاروں میں تو ایک ہے۔ اس کے ٹکر کی لڑکی تو ہو کم از کم...... یہ کیا چیز تھی۔ اتنی ست الوجود، اس کو پکارو بھی تو ایک سال بعد جا کر اسے سنائی دے گا۔"

گھر واپسی پر وہ نند پر الٹ پڑیں۔ رقیہ آپا نے ان کی بے سروپا باتیں بڑے تحمل سے برداشت کی تھیں۔

"خیر...... ایسی بات کرنا تو ہمیں زیب نہیں دیتا۔ کیا پتا کون کس کے قابل ہے؟ یہ تو ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم کس چیز کے قابل ہیں؟ اور کسی چیز کے قابل ہیں بھی کہ نہیں؟"

"میرا وہ مطلب نہیں تھا......" نند کے ٹھنڈے لہجے پر ثمینہ بیگم گڑبڑا گئیں۔

"مگر آپ دیکھیں تو جنید کی کتنی اچھی جاب ہے۔ ایک سرکل ہے اس کا۔ ایک نام ہے۔ اس لڑکی میں تو ذرا بھی تیزی نہیں ہے۔ کیا یہ ساتھ دے پائے گی اس سب کا...... بہر حال آپ کی مرضی ہے؟"

اپنی بھڑاس نکال کر آخر میں انہوں نے خود کو بری الذمہ کرنا چاہا۔

رقیہ آپا نے کچھ روز کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔ بھاوجیں سمجھیں کہ ناں ہو گئی ہے۔ اگلے روز نازیہ اپنے ددھیالی رشتہ داروں میں سے ایک رشتہ لے آئیں۔ نا صرف لے آئیں بلکہ زبردستی لڑکی کے گھر بھی لے گئیں۔ رقیہ آپا بے چاری پھنس کر رہ گئیں۔ لڑکی خوب صورت تھی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی اس خوب صورتی میں اس نے کتنا پیسہ اور محنت ضائع کی ہوگی۔ رقیہ کو ایسی بناوٹی ہرگز نہیں چاہیے تھی۔ وہ خود پر خلوص طبیعت کی تھیں اور مخلص لڑکی کی ہی خواہاں تھیں تاہم آپا نے لڑکی والوں کو کوئی مثبت اشارہ بھی نہ دیا۔ وہ خاموشی سے چائے پی کر واپس آ گئیں۔ نازیہ البتہ خوب چہک رہی تھی۔

اپنی دانست میں وہ رقیہ آپا کی خاموشی کو رضا مندی سمجھ رہی تھیں۔ وہ تو اگلے ہفتے اس کے فون کرنے پر جب آپا نے انکار کر دیا تو اس کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔

اس کے بعد ناراضی کے طور پر وہ نند سے قطع تعلق کیے رہی مگر ثمینہ بھابھی کی بدولت ان کے پل پل کی خبر تھی اسے۔ اب بھی جب بقول ان کے آپا نے ہمیں پوچھا تک نہیں تو ہم بھی کسی سے کم نہیں کے مصداق منگنی کی تقریب میں جانے سے انکار کر دیا۔

ان کے شوہر حضرات تو خس کم جہاں پاک کے مصداق ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف ہو رہے لیکن رقیہ آپا اگلے روز مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ خود ان کو منانے پہنچ گئیں۔ تو بظاہر ان پر احسان عظیم کرتے ہوئے دونوں بھابیوں نے اپنے آنے کی آمادگی ظاہر کی تو اماں اور رقیہ آپا نے سکھ کا سانس لیا۔

☆☆☆

منگنی کی تقریب سادگی سے انجام پائی تھی۔ بس گھر کی چند خواتین کے ساتھ دونوں بھائی اور شوہر کے ہمراہ وہ سادگی سے انگوٹھی پہنا آئیں۔

بھابیوں نے حسب عادت وفطرت ٹوکرے بھر بھر کر اعتراضات کیے مگر رقیہ آپا نظر انداز کر گئیں۔

شادی چھ ماہ بعد اسی طرح ہوئی کہ زیادہ ہنگامہ جنید کو بھی پسند نہیں تھا۔ مسجد میں نکاح کر کے جنید نے ولیمہ "لال قلعہ" میں کیا تھا۔ اپنے سارے دوست، احباب کو اس نے ولیمے کی دعوت دی تھی۔ بارات میں وہ گنے چنے لوگ لے کر گئے تھے تاکہ لڑکی والوں پر بوجھ نہ پڑے مگر شان دار ولیمے کی دعوت نے سب کی بولتی بند کروا دی تھی۔

☆☆☆

دلہن بن کر حریم پر بہت روپ آیا تھا۔ نکاح پر وہ سادگی و پرکاری کی مثال لگ رہی تھی تو ولیمے پر اس کا حسن غضب ڈھا رہا تھا گویا دونوں چندے آفتاب، چندے ماہتاب لگ رہے تھے۔ سب کی تعریفیں رقیہ آپا نے ماشاءاللہ کہہ کر وصول کی تھیں۔ نازیہ نے البتہ دل کے خار کی وجہ سے جھوٹے منہ بھی نہ کہا لیکن سچ تھا کہ ایک پل کو تو وہ بھی حریم کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

"اسے پہلی بار دیکھا، جب تو واجبی سی لگی تھی بس۔ اب کون سا سرخاب کے پر لگ گئے اس کو۔"

اس نے حسب عادت منہ پھٹ انداز میں ثمینہ جہاں کے آگے منہ بنایا تھا۔ وہ خود سب کی تعریفیں سن سن کر جلی بیٹھی تھیں۔

"جنید اتنا ہیرا ہے کہ اس کا نام جس لڑکی کے نام کے ساتھ لگ جائے تو اس پر خود بخود ہی روپ

آجائے گا۔"

نازیہ "ہونہہ" کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

رقیہ آپا کے خاندان کے لیے حریم بہت اچھی ثابت ہوئی تھی۔ جنید کے خیال میں وہ ایک آئیڈیل بیوی تھی۔ رقیہ آپا کے شوہر اسے ماہم سے کم نہیں سمجھتے تھے، خود رقیہ آپا اسی کی گرویدہ تھیں۔

لیکن درحقیقت ان کی خوش گوار زندگی کا راز اس میں تھا کہ جنید بیوی کی ہر ضرورت اور خواہش کا خیال رکھتا تھا تو حریم بھی اپنے شوہر سے وابستہ تمام رشتوں کا احترام کرتی تھی۔ یوں ان کی زندگی بہت پرسکون گزر رہی تھی۔ ان کا گھر گویا جنت کا نمونہ بن گیا تھا۔ شادی کی پہلی سالگرہ پر ڈھائی ماہ کی عنایہ ان کی خوشیوں کو دوبالا کرنے پہنچ چکی تھی۔

ثمینہ بھابھی اور نازیہ دل میں حریم کے حسن سلوک کی معترف ہونے کے باوجود شگوفے چھوڑتی رہتی تھیں اور رقیہ آپا ہمیشہ کی طرح بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئی تھیں، وقت اسی کوش گواری سے آگے بڑھا اور حریم کی جھولی میں دو نعمتیں ڈال گیا۔

☆☆☆

ثمینہ جہاں کا بڑا بیٹا تعلیم مکمل کر کے برسر روزگار ہو گیا تو اس کے رشتے کی تلاش شروع ہوئی۔ چھوٹے بیٹے کے لیے انہوں نے نازیہ کی بڑی بیٹی مانگ لی تھی، مگر اسامہ کے لیے وہ کوئی چاند کا ٹکڑا لانے کی خواہاں تھیں۔

گو کہ رقیہ آپا کی ماہم اسامہ کے جوڑ کی تھی لیکن ثمینہ بیگم کی دلچسپی نہ ہونے پر حریم نے اپنے ماموں زاد کے لیے ماہم کا رشتہ مانگ کر منگنی کی رسم کر دی۔ رقیہ آپا بہو اور داماد کے معاملے میں خوش قسمت تھیں۔

ثمینہ جہاں نے پہلے لڑکی خود پسند کی۔ پھر نند سے پوچھا کہ ساس کے مرنے کے بعد پورا گھر ان کے قبضے میں تھا، سو اپنی مرضی کرتیں بہر حال......

رقیہ آپا لڑکی کو دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ لڑکی بلاشبہ خوب صورت تھی۔ گھرانا بھی ماڈرن لگ رہا تھا۔ باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماں کا اپنا بیوٹی پارلر اور عروہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔

دو چار ملاقاتوں کے بعد رشتہ منظور کر لیا گیا اور منگنی کے بجائے شادی کی تاریخ طے کر دی، جو پورے ایک ماہ بعد کی تھی۔

ثمینہ جہاں نے شادی کی تیاری میں پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ ان کے خاندان میں بہو کا نکاح والے کا جوڑا سسرال کی طرف سے ہوتا تھا۔ ثمینہ بیگم نے بغیر کسی مشورے کے دونوں جوڑے خوب مہنگے اور خوب صورت خرید لیے۔

عین نکاح کے دن عروہ نے جامنی شرارہ پہننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کے خاندان میں نکاح کا جوڑا ماں کے گھر کا ہوتا تھا۔ ثمینہ بیگم نے اپنی سمدھن سے چونکہ ایسی کوئی بات یا مشورہ نہ کیا تھا، غلطی ان کی بھی نہیں تھی اور عروہ سرخ اور سنہری میکسی پہنے دلہن بن کر (بقول ثمینہ جہاں) کے چاند بن کر ان کے آنگن میں اتر آئی۔

دلہن پیاری تھی، سب نے تعریف کی مگر ساٹھ ہزار کے شرارے کا غم ثمینہ جہاں کو لے ڈوبا۔ ان کا بی پی بے حد لو ہو گیا تھا۔ ولیمہ دو روز بعد تھا۔ ان دو روز میں دوائی، ڈرپ اور خوراک دے دے کر ثمینہ جہاں کو بھلا چنگا کیا گیا مگر ولیمے پر پھر بدمزگی ہو گئی۔ دلہن صاحبہ کے لیے ایک اچھے خاصے مہنگے پارلر سے ٹائم لیا ہوا تھا۔ عروہ اس پارلر کو چھوڑ کر اپنی پسند کے پارلر چل دیں۔

ثمینہ جہاں بیگم کو صدمہ تو بہت ہوا۔ پر صبر کرنا پڑا۔ نہ کرنے کی صورت میں ولیمے کی تقریب سے خارج ہونا پڑتا۔ اللہ اللہ کر کے فنکشن تمام ہوئے۔

"دلہن ہے تو خوب صورت مگر مزاج ٹھیک نہیں لگ رہے بی بنو کے۔"

ثمینہ جہاں نے دبی دبی سرگوشیاں سن لی تھیں۔

☆☆☆

اب دولہا، دلہن کے ہنی مون پر جانے کا معاملہ تھا۔ بجٹ کے حساب سے ثمینہ جہاں بیٹے کو پہلے ہی سمجھا چکی تھیں کہ صرف اندرون ملک ہی چاند اور شہد (ہنی مون) کر لینا۔ پرائے ملک جا کر نہ دریافت

کرنے لگ جانا۔ عروہ بھی ان ہی کی بہو تھی۔ ساس کی بات سن کر ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"میں تو ملائیشیا جاؤں گی۔ پاکستان تو سارا دیکھا ہوا ہے۔"

"تو ایک بار اور دیکھ لو۔" شوہر نے پیار سے پکارا تھا مگر اس کی نہ ہنوز برقرار رہی تھی۔

"ہرگز نہیں...... میں اپنی ساری دوستوں کو پہلے ہی انفارم کر چکی ہوں۔" وہ اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ اسامہ کو بادل نخواستہ رضامند ہونا پڑے۔ نئی نویلی بیوی کو وہ ناراض نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ کچھ دوستوں سے ادھار پکڑا اور کچھ ماں سے (شدید پھٹکار کے بعد) کہ اپنا جمع جتھا تو وہ پہلے ہی ڈائمنڈ رنگ پر لگا چکا تھا۔ جس کی فرمائش عروہ نے شادی کی پہلی رات ہی کر دی تھی۔

وہ دونوں دو ہفتے کے ٹور پر ملائیشیا سدھارے تو ثمینہ جہاں غصے سے بل کھا کر رہ گئیں کہ لاڈلی بہو نے آتے ہی اپنی منوانا شروع کر دی تھی۔

عروہ براہ راست بدتمیزی نہیں کرتی تھی مگر جو بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے منوا لے۔ اس کی ماں، بیٹی کو بیاہ کر بیرون ملک جا بسی تھی، اب اس کا میکہ، سسرال سب یہی تھا۔

ثمینہ بیگم کو وہ صحیح معنوں میں ناکوں چنے چبوا رہی تھی۔ اسامہ کو اس نے پوری طرح اپنی مٹھی میں کیا ہوا تھا۔ بیوی کی غلطی پر بھی جب وہ اسی کی سائیڈ لیتا تو ثمینہ جہاں کا دل کرتا، وہ پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔

"اپنا خون ہی جب بے وفا نکلے، تو پرائے سے کیا امید۔"

اب وہ برملا کہتی تھیں۔ عروہ نازوں پلی تھی۔ کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تو بہو کی ضد میں ثمینہ جہاں بھی ہاتھ کھینچ لیتیں۔ تو گھر میں گویا دنگل کا سماں ہو جاتا۔ ثمینہ جہاں اپنے کمرے میں روتیں، بڑبڑاتیں تو عروہ اپنے میں اور کچن میں بلیاں منہ مارتی پھرتی تھیں۔ کچھ دن تو باپ بیٹے نے برداشت کیا۔ پھر باہمی مشورے سے ماسی رکھ دی، مگر ماسی رکھوا کر بھی کچھ کام خود کرنے ہوتے تھے جو دونوں ہی ایک دوسرے کی ضد میں نہ کرتیں، نتیجتاً گھر کا ماحول از حد خراب رہنے لگا تھا۔

☆☆☆

شادی کو دو سال گزر چکے تھے مگر عروہ کی گود خالی تھی۔ وہ ابھی بچے جیسی ذمہ داری کو نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔

"ابھی تو میں خود بچی ہوں۔" شوہر کے استفسار پر وہ معصومیت سے گویا ہوئی۔ شوہر تو اس ادا پر نثار ہو گیا۔

ثمینہ جہاں نے سنا تو کلس کر رہ گئیں۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔ بیٹا بیوی کا بے دام غلام بنا پھرتا تھا جو بھی تھا، اسے اپنی بیوی سے حد درجہ پیار تھا اور بیوی اپنے شوہر کے علاوہ ہر قسم کی ذمہ داری سے خود کو مبرا سمجھتی تھی اور مسائل کی جڑ یہ ہی بات تھی۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے پر باہم اعتماد کرتے، ایک دوسرے سے وابستہ رشتوں کا خیال رکھتے تو حالات یہ نہ ہوتے۔ اسامہ کو بیوی زیادہ پیاری تھی، وہ بیوی اور ماں میں انصاف نہیں کر پاتا تھا۔ اس کا پلڑا بیوی کی طرف جھکتا تھا۔

شادی کے تیسرے سال ایک معمولی سی بات پر شدید جھگڑے کے بعد عروہ نے علیحدگی کی بات کی، تو اسامہ کی جان پر بن آئی۔ اسے عروہ عزیز تھی اور آج کل وہ ماں بننے والی تھی تو اسے اور زیادہ پیاری لگتی تھی۔

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔"

"پھر ٹھیک ہے...... مجھے الگ گھر میں رکھو۔ میں نہیں رہ سکتی تمہاری ماں کے ساتھ۔ تمہاری ماں مجھے پاگل کر دے گی۔" اس نے دوٹوک مطالبہ کر دیا۔

اس کی جاب اچھی تھی۔ وہ باآسانی الگ گھر افورڈ کر سکتا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کویت سے ان کے لیے ویزے آ گئے تھے، عروہ کی امی نے اسامہ کے لیے جاب کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ ماں کے پاس جانے کا یہ موقع بہترین تھا۔ وہ پریگننٹ تھی، اگر بچے کی پیدائش وہیں ہوتی تو اسے وہاں کی نیشنلٹی مل جاتی۔ اسامہ نے وہی کہا، جو اس نے کیا

اور جانے سے دو ہفتے قبل اس نے ماں کو اطلاع دی تھی۔ جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔

ثمینہ جہاں ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ نبیل صاحب الگ چپ ہو رہے۔ جانتے تھے جوان اولاد جب اپنے فیصلے خود کرنے لگے تو کسی کی نہیں سنتے۔ ثمینہ جہاں نے البتہ واویلا فرض سمجھ کر کیا۔

"امی...... اب بس کردیں۔ عروہ کی ہر بات پر تو آپ کو اعتراض ہوتا ہے۔ کبھی...... کبھی وہ...... حقیقت یہ ہے کہ آپ اسے پسند ہی نہیں کرتیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔ ایسے آپ بھی سکون سے رہیں گی اور ہم بھی......"

اسامہ نے آنکھیں ماتھے پر رکھی ہوئی تھیں۔

"تو ٹھیک ہے، تم اسے چھوڑ دو...... میں تمہاری دوسری......"

"امی...... آپ ہوش میں تو ہیں؟ میں اسے کیسے چھوڑ دوں جبکہ آپ جانتی بھی ہیں کہ......" لب بھینچ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"دادی نے تو کبھی ابو کو ایسے مشورے نہیں دیئے حالانکہ کتنا برا سلوک کرتی تھیں آپ ان کے ساتھ؟"

جوان بیٹے کے منہ سے طعنہ سن کر وہ یک دم نظریں چرا گئیں۔ اسامہ سر جھٹکتا آگے بڑھ گیا اور ان میں اب اتنی بھی ہمت نہیں رہی تھی کہ رخ پھیر کر شوہر سے شکوہ کرتیں۔

☆☆☆

ان کے جانے کے بعد گھر یک دم سونا سونا لگنے لگا تھا۔ نازیہ پانچ سال قبل شوہر کی جاب کی وجہ سے اسلام آباد شفٹ ہو چکی تھیں۔ ان سے تعلق بس فون تک ہی رہ گیا تھا۔

گھر کے سونے پن کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے نازیہ سے بات کی اور زین کی شادی کی تاریخ پکی کر دی۔

اسامہ کے برعکس زین کی شادی سادگی سے ہوئی تھی۔ ثمینہ جہاں کا جوش بھی کچھ کم تھا اور نازیہ نے اس کمی کو بخوبی جتا بھی دیا تھا۔ ثمینہ جہاں چپ کر کے (پہلی بار) بہو کو گھر لے آئیں۔ اسامہ نے شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ پہلی بہو سے دل اتنا کھٹا ہوا تھا کہ نئی بہو کی کوئی رسم کرنے کو دل ہی نہ چاہا۔

بہو بیگم نے اسی بات کو دل سے لگا لیا اور پھر کبھی بھی نہ بھولی۔ ہر پل اپنی شادی کی کمی اور ثمینہ جہاں کا رویہ جتاتی۔ زین بھی آہستہ آہستہ بدل رہا تھا۔ ثمینہ بیگم کو اب اپنی حیثیت کا ادراک ہونے لگا تھا۔

وہ نازیہ جس کی سب سے زیادہ اپنی جیٹھانی (کزن) سے بنتی تھی، اب وہی نازیہ بیٹی کی معمولی سی بات پر گھنٹوں ان کو باتیں سناتی تھیں۔ ان کی آدھی ہمت اسامہ ختم کر گیا تھا، جو رہ گئی تھی اسے چھوٹا بیٹا، بہو کر رہے تھے۔ وہ اب زیادہ تر اپنے کمرے میں رہنے لگی تھیں۔ دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی وہ کب کی چھوڑ چکی تھیں کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اسامہ کی طرح زین بھی ان کو چھوڑ کر چلا جائے۔ اب ان کی حیثیت ایک معزول ملکہ کی سی تھی، ان کی اس قدر احتیاط کے باوجود اریبہ کوئی نہ کوئی بہانا ڈھونڈ لیتی تھی۔

انہیں آج کل بہت شدت کے ساتھ احساس ہوتا تھا کہ خود ان کا رویہ بھی اپنی ساس کے ساتھ بے حد نامناسب تھا بلکہ وہ تو اس سے بھی زیادہ صبر کرنے والی خاتون تھیں مگر ثمینہ جہاں کے اندر شاید صبر نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔

☆☆☆

اریبہ ان کے ٹوکنے کے باوجود اکثر سالن میں نمک زیادہ کر دیتی تھی، اس روز بھی یہی ہوا۔ سالن میں نمک زیادہ تھا اگر وہ یہ سالن کھا لیتیں تو شام کو لازماً ڈاکٹر کا چکر لگتا تھا جس پر اریبہ بھی کو اعتراض بڑبڑانا تھا۔

انہوں نے کھانا کھانے سے ہی انکار کر دیا۔ ایک آخری حل یہی سمجھ میں آیا تھا ان کے۔ اریبہ کو ان کا انکار بھی ناگوار گزرا۔ پہلے تو اپنے دل کی بھڑاس نکالی پھر بیٹی کو تھپڑ جڑا۔ آخر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ

کر اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی۔ صرف دس منٹ میں گھر کا ماحول سہم گیا اور ثمینہ جہاں کا دل اچاٹ ہو گیا۔ انہوں نے چادر سر پر لی، رکشہ کیا اور سیدھا نند کے گھر آ گئیں۔

دروازہ جنید کے چھوٹے بیٹے نے کھولا تھا۔ صاف ستھرا، خوب صورت سا گھر...... پر امن فضا...... ان کی گویا تھکن ہی اتر گئی۔

رقیہ آپا اپنی بہو، پوتا اور پوتی کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں۔ بھاوج کا چہرہ دیکھا تو لپک کر ان کے استقبال کو آگے بڑھیں، حریم نے سلام کر کے پانی پیش کیا پھر کھانے کی دعوت دی۔

وہ صبح ناشتے میں ایک پاپا کھائے ہوئے تھیں۔ تازہ ترین ہنگامے کی وجہ سے سر الگ درد کر رہا تھا۔ وہ فوراً کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ سادہ دال چاول، چٹنی، اچار اور سلاد نے کھانے کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد حریم نے چائے بنا کر پیش کی، پھر بچوں کو سلانے کے لیے اپنے کمرے میں لے گئی۔

رقیہ آپا انہیں ساتھ لیے لاؤنج میں موجود تخت پر براجمان ہو گئیں۔

"کیا بات ہے ثمینہ! آج تم ٹھیک نہیں لگ رہیں؟"

ان کے پوچھنے کی دیر تھی کہ ثمینہ جہاں پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ آنسوؤں کے درمیان انہوں نے سارا قصہ اپنی نند کو سنایا تھا۔ رقیہ آپا کو بے ساختہ اپنی ماں یاد آ گئیں۔ وہ بھی تو اس بہو سے اتنا ہی ڈرتی تھیں مگر ان کے لبوں پر کبھی حرف شکایت نہ آیا تھا۔

"آپا...... آپ کتنی خوش قسمت ہیں، کیسی ہیرا بہو ملی ہے آپ کو۔ گھر کو گویا جنت بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک میں ہوں کہ دو دو بہوویں لائی، دونوں سے سکھ نہ ملا۔ میں نے ہمیشہ حریم کو کمتر سمجھا، مگر وہ بچی کتنی نیک اور سلجھی طبیعت کی ہے۔ میں تو ہیرے کے چکر میں پتھروں سے جھولی بھر بیٹھی۔ کاش میں بھی آپ سے مشورہ کر لیتی تو میرے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔" وہ دلگیر لہجے میں گویا تھیں۔

رقیہ آپا ان کی آخری بات پر مسکرا دیں۔

"کسی کے مشورے سے کچھ نہیں ہوتا ثمینہ! ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ رشتے تو نصیبوں سے جڑتے ہیں۔ تیرے میرے مشورے سے نہیں...... ہاں لیکن اللہ سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے۔"

"اللہ سے مشورہ...... کیا مطلب؟" نند کی بات پر وہ الجھیں۔

"اللہ سے مشورے کا مطلب ہے استخارہ کرنا۔ اپنے کیے گئے فیصلے میں اللہ کی رضا کو شامل کرنا۔ تمہیں یاد ہوگا حریم کو دیکھ کر تم دونوں نے کتنے منہ بنائے تھے؟ کتنا مجھے منع کیا تھا؟ مگر میں نہیں مانی، جانتی ہو کیوں؟" ثمینہ استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھ رہی تھیں۔ جن کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

"کیونکہ اس رشتے میں میرے رب کی رضا شامل تھی۔ میں نے حریم کے لیے صرف اللہ سے مشورہ کیا تھا اور اس کا مثبت اشارہ ملنے کے بعد میں نے کسی کی نہیں سنی اور نتیجہ تم خود دیکھ رہی ہو۔"

"تم کسی سے نہ پوچھتیں۔ بس اس رب کریم کی رضا جان لیتیں تو شاید حالات آج مختلف ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ہی ہر فیصلے سے قبل استخارہ کرنے کو نہیں کہا، اس میں یقیناً اللہ نے اپنے بندوں کے لیے بہتری رکھی ہے۔"

وہ سر جھکائے رقیہ آپا کی بات سن رہی تھیں اور اشک ندامت ان کا چہرہ بھگو رہے تھے۔

انہوں نے تو ہمیشہ اپنے فیصلوں کو صحیح جانا تھا۔ ہر بات میں اپنا مشورہ منواتی تھیں۔ کسی دوسرے کو وہ اس قابل نہیں سمجھتی تھیں، مگر کاش...... کاش وہ ایک بار اس ذات پاک سے رجوع کر لیتیں تو شاید...... شاید......

آج نادم نہ ہونا پڑتا۔ وہ مالک ہے دو جہانوں کا، وہ رب کائنات ہے...... کل اختیار ہے...... پھر ہم اپنے اوپر اتنا زعم کیوں کرتے ہیں؟

☆☆

مکمل ناول

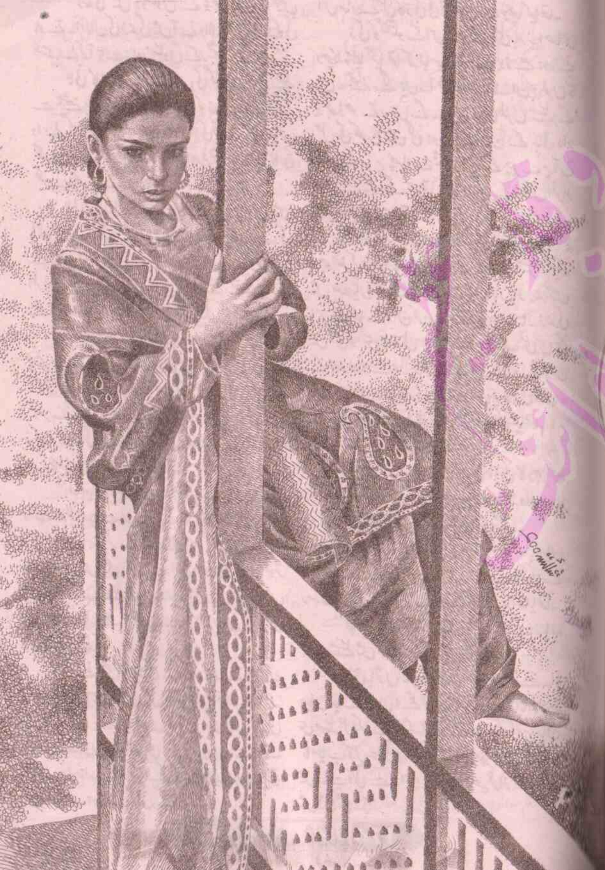

منشا محسن علی

شاماں پے گیاں

''میں نہیں چاہتا کہ سب اس طرح ہو آخر ہم تینوں اپنی زندگی کے اس موڑ پر اداکاری کرنے میں کیوں مصروف ہو گئے ہیں۔ کہیں ہم نے اپنا اصل کھو تو نہیں دیا......؟''

ان تینوں نے اپنی زندگی کے بہت سارے مسائل اس میز کے گرد بیٹھ کر سلجھائے تھے مگر یہ پہلی بار تھا کہ آج وہ تینوں کھانے کی میز پر بیٹھ کر بھی اپنے مسائل نہیں سلجھا پائے تھے۔ اصل کی گمشدگی تو سوہان روح تھی ہی مگر وہ تو سوچ کی اس حقیقت کا شکار تھے کہ مستقبل قریب میں آخر وہ کیا کیا گم کرنے والے تھے۔ کھونے والے تھے۔ زندگی کے سانپ سیڑھی کے اس خطرناک کھیل میں وہ جیسے موت کے دہانے پر آن کھڑے ہوئے تھے، کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تینوں کے سامنے پڑے کپوں میں چائے تقریباً سوکھ چکی تھی۔ وہ ٹھہرے پانیوں میں ڈھل رہے تھے۔

ابا میاں نے زندگی میں کتابوں، فلسفوں، تھیوریوں سے ہر ممکن استفادہ کیا تھا مگر آج وہ پہلی بار اپنے آپ کو بے بس پا رہے تھے۔ ڈائننگ ہال کی دیوار پر ٹنگا وال کلاک انہیں کسی جوکر سے کم تو ہرگز ہرگز نہیں لگتا تھا۔ اسے تو جیسے آواز لگ گئی تھی۔ پھبتیاں کستا تھا، آوازیں لگاتا تھا۔ اور وہ سب سننے، اور برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

زندگی کے کورٹ میں ہر کیس نہیں جیتا جاتا...... زندگی سے بڑھ کر کوئی عیار، چالاک دیکھنے میں نہیں آیا۔ پچھلے آدھے گھنٹے اور تیرہ منٹ سے ثانی مہاتما گوتم بدھ کے سانچے میں ڈھلی پتھرائی ہوئی نظروں سے کارنس پر سجے کرسٹل کے گلدان کو دیکھے جا رہی تھی جس کے پھول بدلنے کی اشد ضرورت تھی۔

ابا میاں کی دھیان کی کھڑکی آخر کار کھل ہی گئی تھی اور انہیں یاد آیا تھا کہ وہ چینی کا سرخ اور نیلے رنگ کے امتزاج والا گلدان ان کا جرمن دوست لیری کارمن لایا تھا۔ کتنا شوق تھا انہیں باہر کے ملکوں کے لوگوں سے دوستیاں کرنے اور ان سے گپیں ہانکنے کا...... مگر اس وقت جب لمحۂ موجود میں ڈائننگ ہال

کی اس کبیدہ اور دورنگی فضا میں بیٹھے انہیں شدت سے ایک بات کا احساس ہوا تھا۔

''زندگی میں دوستوں کے ڈھیر ضروری نہیں ہوتے۔ انسان کی زندگی میں آنے والا ہر فرد کوئی نہ کوئی مسئلہ لے کر آتا ہے۔ اور مسئلوں کے ریشم سلجھتے نہیں۔''

ثانی کا ارتکاز مانو کے اس کی گود میں آکر چپکے سے بیٹھنے پر ٹوٹا تھا ورنہ ابا میاں کو خدشہ تھا کہ آنے والے کچھ منٹوں میں شاید وہ ارتکاز کی قوت سے جرمن گلدان ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتا اور فرش پر جا بجا کانچ ٹکڑے بکھر جاتے۔

ثانی نے مانو کے لمبے، گھنے سفید بالوں میں ہاتھ پھیرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ سفید رنگ کی لمبے بالوں والی بلی خاموشی سے اس گھر کے ان تینوں افراد کو بغور دیکھ رہی تھی۔ انہیں کیا مسئلے تھے؟ کیا دکھ تھے؟ کیا وہ واقعی اپنا اصل کہیں گم تو نہیں کر بیٹھے۔

''تمہارے لیے لزانیہ بنوادوں؟ تمہیں بہت پسند ہے ناں......؟'' ابا میاں کی اس آفر پر بلی سے کھیلتی ثانی نے تو سر نہیں اٹھایا تھا مگر ہاں اس گھر کے تیسرے کردار کے بت میں لازمی جان پڑ گئی تھی۔ ذکیہ عرف ذکی نے اپنے ناخنوں سے پالش کو کھرچتے ہوئے ابا میاں کو بغور دیکھا تھا۔

''ابا میاں! شاید آپ بھول رہے ہیں کہ اس وقت ہم لزانیہ سے بڑے مسئلے میں گرفتار ہیں۔ کبوتر کے آنکھیں بند کرنے سے بلی بھاگ نہیں جاتی۔ وہیں تاک میں بیٹھی رہتی ہے، اس وقت ہم تینوں کبوتر ہیں اور ہمارے مسئلے بلیاں۔ یہ یہیں ہیں شاید انہیں ایسا ہی تو ہونا ہوگا۔ مسئلوں سے فرار انسان کو ساری زندگی سفر میں رکھتا ہے۔''

ذکی نے تیکھی نظر ثانی کے رنگ بدلتے چہرے پر بھی ڈالی تھی جو سفیدی میں بدلتا جا رہا تھا۔ جیسا کہ چونے کا کوئی بت، ابا میاں کو آج پہلی بار ذکیہ کی حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی جیسی خوبیوں سے خوف آیا تھا۔ وہ نقاب اتار کر اگلے کو ننگا کر کے رکھ دیتی تھی۔ سفاک ہونا اسے نہیں کہتے۔

ثانی کے ہاتھوں پھسلتی مانو خراماں خراماں فرش پر چلتی۔ لوٹنیاں لگاتی دروازے سے باہر نکل گئی تھی اور اس سارے عمل کا ذکی کی آنکھوں نے پیچھا کیا تھا۔

ذکی کو گفتگو کے اس حصے میں پہلی بار یہ احساس دھچکا پہنچا گیا تھا کہ ابا میاں تو اب بوڑھے ہو رہے ہیں۔ جھکنے لگے ہیں۔ آخر وہ کب تک ان دونوں کا بوجھ ڈھوتے رہیں گے۔ وہ کسی نہ کسی طرح مسئلے کے حل کی کھوج میں لگی ہوئی تھی۔ لان کے جالی دار دوپٹے کو سر پر پھیلائے بیٹھی ثانی کے چہرے پر آج ہمیشہ سے کچھ الگ ہی تھا۔ جو اس گھر کے دونوں افراد نہیں دیکھ پائے تھے۔

''ثانی، تم ٹھیک ہو ناں......؟'' سارے وجود کا بوجھ سفر کرتا ہوا پلکوں پر آکر ٹھہر گیا تھا۔ پلکیں جھپکنے میں صدیاں لگی تھیں۔ دریاؤں پر بار بار بند نہیں باندھے جاتے۔ تن کر سینہ سپر نہیں ہوا جاتا۔ زندگی میں کبھی تو کسی ناقابل تلافی نقصان پر ایک لمبی سی چیخ کے بعد اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ رونے کو من کرتا ہے ناں۔ یہ ساری کیفیات اس پر طاری تھیں۔ وہ ڈبڈبایا ہوا لہجہ ذکیہ فراز کو پتھر میں ڈھال گیا تھا۔

''میں ٹھیک نہیں ہوں۔''

ابا میاں کے ہاتھوں کی لرزش، ذکی کا دھڑکن روکتا دل، کمرے کی دیواریں سارے رازوں سے بخوبی واقف تھیں اور صد شکر کہ چپ بھی تھیں۔

''ثانیہ! اسپیگھٹی بنوادوں کھاؤ گی؟'' ابا میاں کے منہ سے بے ربط فقرے پھسل رہے تھے۔ ذکی نے رسٹ واچ کا ہک بند کرتے ہوئے جھنجلا کر سر اٹھایا تھا۔

''ابا میاں! ہم زندگی میں اسپیگھٹی سے زیادہ بڑے مسئلے میں گرفتار ہو گئے ہیں۔''

وہ اپنی باتوں میں ہمیشہ کی طرح الجھے تھے۔ ابا میاں جانے کیوں اگلے کو اس کا پسندیدہ کھانا کھلا کر ہی مسئلہ حل کرنے پر اکساتے تھے۔ زندگی کی ہر چال کامیاب نہیں ہوتی۔ شطرنج کے ہر مہرے کے حصے میں مات آتی ہے۔ اس بار مات ثانیہ فراز کے حصے میں آئی تھی۔!!

''اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔''

☆☆☆

''آپ نے ابا سے طلاق کیوں لی تھی؟ کیا وہ ایک اچھے انسان نہیں تھے؟

رافیہ بیگم کو ساری زندگی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ وہ یہ سوال ہر روز اور ہر بار کھانے کی میز پر ہی کیوں کیا کرتی تھی۔

''تم اس سوال کے جواب کے لیے ابھی بہت کم عمر ہو۔''

''میں بچی نہیں رہی امی۔''

''میں جانتی ہوں۔ ماں ہوں تمہاری۔''

باقی بہن بھائی اپنے اپنے ہوم ورک کی کاپیاں کھولے بیٹھے۔ پراٹھے کے نوالے لیتے ہوئے پائے جاتے تھے اور وہ اس بات سے بخوبی واقف بھی تھے کہ ان کی بڑی بہن کا اکثر دماغ چل جاتا ہے اور اسے الٹے سیدھے سوال کرنے کی بیماری ہے۔ وہ جب تک کھانے کی میز پر بیٹھی ہوتی تھی، یونہی اپنے سوال و جواب سے اپنی ماں کا جینا حرام کیے رکھتی تھی۔ شاید اس کے ان ہی سوالوں کی وجہ سے ابھی تک رافیہ اپنا ماضی بھلانے میں کسی بھی حد تک کامیاب نہیں ہو پائی تھیں۔

نرم و نازک سراپے، دلکش انداز، اور مادیت پرست سوچ والی وہ ایک شان دار عورت تھیں۔ زندگی، شادی اور دولت کو وہ ایک تکون کی طرح جوڑے رکھتی تھیں۔ اور اکثر اوقات انہیں ایسے جملے سننے کو ملتے تھے۔

''رافیہ......تم زندگی کو اس نظریے سے کیوں دیکھتی ہو......؟'' تب وہ ایک بلند و بانگ قہقہے سے اگلے کو چپ کروا دیتی تھیں۔

''زندگی ایک بار ملتی ہے۔ شادی بھی ایک بار ہوتی ہے۔ اس جوے میں ذات ہارتی ہے تو ترازو میں دولت لازمی ہے۔'' فراز احمد کو چھوڑ کر وہ ابھی تک کسی بھی پچھتاوے کا شکار نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اپنے حق کے لیے لڑنے کو حق بجانب سمجھتی تھیں۔

''تم سوالوں سے زیادہ اپنی پڑھائی پر توجہ کیوں نہیں دیتیں ثانیہ؟''

''میں اپنی کلاس کی سب سے ذہین لڑکی ہوں۔''

ٹھیک پٹتی ہوئی وہ اچھا خاصا برا مان گئی تھی۔ اسے اپنے راز چھپانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ اپنی اکیلی خود ہی دوست تھی۔

لمبی دوپہروں میں اس کا زیادہ تر وقت گھر کے پچھلے حصے میں بنے باغیچے میں گزرتا تھا۔ جھولے پر بیٹھے بیٹھے کبھی تو وہ نیند میں بھی چلی جاتی تھی۔ باغیچے کے سارے پھولوں کی گنتی اسے ازبر تھی۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھی کہ باغ میں کتنے گھونسلے تھے......؟ کن کن پرندوں کے تھے؟ اور ان گھونسلوں میں پڑے ننھے بچوں اور انڈوں کی صحیح تعداد تک سے بھی وہ واقف تھی۔ زندگی اس کے لیے سراپا حیرت تھی اور وہ حیرت کی دلدادہ، شیدائی۔

اسکول سے واپسی پر وہ سڑکوں کے پتھر اڑاتی ہوئی آتی تھی۔ وہ بے شک ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہی تھی، جانے کیوں اور کیسے اس میں کمپلیکسز بڑھنے لگے تھے۔ جن کی نوعیت اور گہرائی سے وہ قطعاً انجان تھی۔ سائنس اسے بور اور عجیب سی مشینی تاثر والی لگتی تھی۔ رنگوں، بارشوں اور شاعری میں اس کی جان تھی۔ انٹر میں کالج میں داخلہ سے پہلے گھر میں گھمسان کا رن پڑا تھا۔ جب اس نے اطمینان اور سکون سے کی ہمیشہ کی طرح اپنی ماں کی خوشی کو غارت کیا تھا۔

''میں انٹر میں سائنس نہ لینے کا سوچ چکی ہوں۔'' فیاض صاحب جو کبھی رافیہ اور اس کی بیٹی کے معاملوں میں نہیں پڑتے تھے، وہ بھی سر اٹھا کر دیکھنے لگے تھے۔ چلی ساس کا ڈبہ اٹھاتی رافیہ پل بھر کو جیسے تھم سی گئی تھیں۔

''کیا کہہ رہی ہو تم......؟ میں نے کچھ ٹھیک سے سنا نہیں۔''

وہ سرد لہجہ ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا کر رکھ دینے والا تھا مگر ثانیہ فراز پر اس کا چنداں اثر نہ ہوا تھا۔

"مجھے آگے آرٹس پڑھنا ہے۔"

یہ اس کا اطمینان اور سکون بھرا فیصلہ کن لہجہ رافیہ کا اطمینان تباہ کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ فیاض صاحب کو مخاطب کرنے پر مجبور ہوئی تھیں، جو کھانے کی میز پر ہمیشہ ہی خاموش پائے جاتے تھے۔

"فیضی! ذرا اس لڑکی کو دیکھیں تو یہ کیا کہہ رہی ہے کہ آگے سائنس نہیں پڑھنی۔ یہ تو سائنس اور ترقی ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ سائنس اور بزنس فیلڈ ٹاپ پر ہیں۔ آرٹس میں گھسی پٹی شاعری اور کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

"ہر کامیاب انسان نے سائنس نہیں پڑھی ہوتی۔"

"اور تم ان کامیاب لوگوں میں سے ہو بھی نہیں۔"

رافیہ نے بے بسی سے فیاض صاحب کو دیکھا تھا جو ٹشو باکس سے ٹشو کھینچتے اٹھ گئے تھے۔

"سوری ...... مجھے آپ دونوں ماں بیٹی کے مسئلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، آپ خود ہی سب سلجھائیں۔"

چھوٹا طلحہ آدھے گھنٹے سے برگر کھانے میں مصروف تھا۔ اسے خاموشی بہت پسند تھی مگر وہ خود کبھی خاموش نہیں رہتا تھا بس دوسروں کو چپ دیکھنا اس کی خواہش تھی۔

"آخر اس گھر کے لوگ اتنا اونچا کیوں بولتے ہیں......؟" کیا ان کے کان نہیں پھٹتے۔ عنقریب یہ سارا گھر بہرہ ہو جائے گا۔ سب سے پہلے میری بڑی بہن...... ثانی...... چوہے کی نانی۔"

رافیہ نے غصے سے بڑبڑاتے ہوئے پلیٹوں کے ڈھیر کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پٹخنا شروع کر دیا تھا۔ ثانی تن فن کرتی باہر نکل گئی تھی۔ رافیہ سخت طیش اور بے چینی میں مبتلا نظر آ رہی تھیں۔

"میں بھی دیکھتی ہوں کہ کیسے تم آرٹس لیتی ہو......" وہ شام ہنگامے کی نذر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ذکی ریسیور تھامے کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ جب بھی وہاں سے کوئی ایسی کال آتی تھی وہ زمین میں کیل کی طرح گڑ کر رہ جاتی تھی۔ وہاں سے آنے والی فون کالز کے بعد اسے کافی وقت لگتا تھا خود کو سنبھالنے میں اور کچھ بھی ڈپریسنگ سوچنے سے کبھی کامیاب ہو جاتی تھی اور کبھی نہیں...... اب بھی وہ عجیب خاموشی اور گومگو کی سی کیفیت میں تھی۔ دوسری طرف رافیہ برابر بولے جا رہی تھیں۔

"اپنے باپ سے کہنا کہ ابھی تک ثانیہ گھر نہیں آئی۔" جانے کیوں ذکیہ نے ان کے الفاظ میں پریشانی تلاشنی شروع کر دی تھی مگر وہاں تو صرف ذمہ داری غالب تھی۔

"وہ آپ کی بیٹی ہے۔"

"صرف میری بیٹی نہیں ہے، فراز باپ ہے اس کا۔"

"اور جس گھر میں رہتی ہے، وہ کون ہیں اس کے......؟"

ذکیہ فراز نے ہر ایسے موقع پر رافیہ بیگم کی سانسیں روک کر انہیں گم صم کیا تھا۔ آج کال ملانے سے پہلے وہ کتنی دعا گو تھیں کہ کم از کم آج کے دن تو ان کی اس سے بات نہ ہو...... جو لگی لپٹی رکھے بغیر اگلے کو چاروں شانے چت کر کے رکھ دیتی تھی۔ وہ دونوں غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے سے متنفر تھیں اور اس بات سے بخوبی واقف بھی تھیں۔

"وہ آپ کے گھر میں رہتی ہے آنٹی......! آپ ماں ہیں اس کی، آپ کو تو اس کے بارے میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات کی خبر ہونی چاہیے۔ اس کی تو وہ سگی اولاد ہے ناں...... مجھے امید ہے کہ آپ دوبارہ کبھی بھول کر بھی اس گھر میں کال کرنے کی زحمت نہیں کریں گی۔"

کال کب کی کٹ گئی۔

اس شام ذکی نے کسی گلدان کے پھول نہیں بدلے۔ کوئی تاریخی ناول نہیں پڑھا۔ بس گارڈن میں ٹہلتی ہوئی زمین ناپتی رہی......!!

"جانے وہ کہاں گئی ہوگی۔ کیسی ہوگی، گھر واپس آئی ہوگی یا نہیں...... وہ گھر سے بار بار باہر کیوں بھاگ جاتی ہے؟ کیا وہ لوگ اس پر ظلم کرتے ہیں؟ پر مجھے کیا...... میں کیوں اتنا سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں۔"

اضطراب نے اسے بالکل بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے ابا میاں نے اس کی پیشانی کی گہری ہوتی لکیروں کو بغور دیکھا تھا۔

"کوئی پریشانی ہے کیا......؟"

چائے پیتے ہوئے وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں...... ابا میاں! آپ سے ایک سوال پوچھوں؟"

"ہاں ہاں بھئی۔ پوچھو۔"

"آپ سب سے زیادہ کس سے محبت کرتے ہیں؟"

سوال بہت سنجیدہ تھا۔ کچھ مہینے کے وقفوں سے یہ سوال لازمی دہرایا جا رہا تھا اور ابا میاں ابھی تک اس سوال کے عادی نہیں ہو پائے تھے۔ وہ ہنسنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ آنکھیں پانی بن گئی تھیں۔ چائے کا کپ تھامے وہ منتظر بیٹھی تھی۔

"تم سے......" اور یہیں آ کر وہ اضطراب کے جال سے نکلی تھی۔ گلدانوں کے پھول بدلے گئے۔ تاریخی ناولوں کی ورق گردانی شروع ہو گئی۔ ابا میاں حیرت سے ذکیہ فراز کا یہ انداز دیکھ رہے تھے۔ انسان بھی ناں بس......!!

☆☆☆

تیسری بار ٹھوکر کھا کر کھڑے ہوتے ہوئے وہ یہ جان گئی تھی کہ اپنا بوجھ خود ہی ڈھونا ہوگا۔ اور کوئی اٹھانے نہیں آئے گا۔ زندگی کی یہ حقیقت کتنی تلخ اور سفاک ہوتی ہے کہ آپ ہی اپنے لیے ہوتے ہیں، کوئی بھی دوسرا آپ کے ساتھ نہیں ہوتا۔ دوپٹے سے خود کو ڈھانپے وہ سڑکوں پر تنہا چل رہی تھی۔ آسمان کا رنگ دھیرے دھیرے بدل رہا تھا۔ یخ بستہ ہواؤں کے ساتھ بارش کی بوندیں اس کے ہاتھوں پر پڑی تھیں۔ سڑکوں کے کناروں کے ساتھ ساتھ چلتے لوگوں میں کوئی بھی تنہا نہیں تھا۔ ہر کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی تھا، وہ اپنی ہتھیلیوں کی لکیروں کو بس دیکھتی رہ گئی تھی۔ شام کا رستہ تھا۔ تنہائی، وحشت اور اداسی تھی۔ تھکن سے چور، نڈھال ہو کر ثانیہ فراز نے اپنے آپ کو گھر کے دروازے پر کھڑا پایا تھا۔

اوپر چھاجوں چھاج آسمان برس رہا تھا اور ادھر دل کی بستی سیلاب میں آ گئی تھی۔ دوپٹے میں مقید وہ سانولے پاؤں آج جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے رہے تھے۔ سب سے پہلے طلحہ کی نظر پڑی تو وہ چلایا۔

"ثانی...... چوہے کی نانی آ گئی۔"

رشین سلاد کھاتے فیاض صاحب نے معمول کے انداز میں اسے دیکھا تھا اور دوبارہ پھر سے سلاد ٹونگنے لگ گئے تھے۔ واقعی انہیں ان دونوں ماں بیٹی کے مسئلوں سے کوئی بھی سروکار نہیں تھا۔ رافیہ بیگم کچن سے ڈونگہ لے کر باہر آئی تھیں...... اسے دیکھ کر ٹھٹکی تھیں اور ان کے تنے ہوئے اعصاب لمحہ بھر کو ڈھیلے پڑے تھے۔

"تم آ گئیں ثانیہ......" ہمیشہ کی طرح معمول کا بس ایک سوال اور جواب میں سیڑھیاں چڑھتی اس کی خاموشی۔

"کھانا کھاؤ گی......؟" کیسا پر تکلف سا انداز تھا...... وہ رکی نہیں، پلٹی اور انہیں دیکھا۔

"امی...... میں آرٹس ہی پڑھوں گی۔"

آج رافیہ بیگم ایک بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں کہ فراز کی دونوں بیٹیوں کو رافیہ بیگم کو منٹوں میں چپ کرانا آتا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی تھیں۔ زندگی انہیں عجب موڑ پر لے آئی تھی۔

☆☆☆

کالج میں آرٹس کے مضامین لے کر اس کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں۔ کالج ایک نئی دنیا تھی جہاں کی دلچسپیوں اور ترجیحات میں جا کر وہ پچھلی باتوں،

مسئلوں، لوگوں بھول جاتی تھی۔ دوست بنانا تو خیر وہ اب بھی نہیں سیکھی تھی۔ زیادہ وقت سائنس بلاک کی سیڑھیوں۔ نہر کنارے اور نوٹس بورڈ کے گرد، ہجوم کو دیکھنے میں گزر جاتا تھا۔ یا پھر لائبریری کی مقدس خاموشی میں وہ علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی کی کتابیں پڑھنے میں گم ہو جاتی تھی۔ پہلے وہ کم گو تھی مگر کالج جا کر تو وہ جیسے بولنا ہی بھول گئی تھی۔

آخر کار خدا خدا کر کے اس نے اپنی طرح کی ایک دوست مریم عرف مومی ڈھونڈ ہی لی تھی۔ جس کو کھانے پینے کا کافی شوق تھا اور اس کا بیگ ہمہ وقت چپس، پاپڑ اور چاکلیٹس سے بھرا رہتا تھا عام روٹین کے علاوہ لیکچر کے دوران بھی اس کا منہ چلتا رہتا تھا وہ ایک ''فوڈی گرل'' کے طور پر مشہور تھی۔ پورا کالج اس کی نظروں میں رہتا تھا اور تازہ ترین اپ ڈیٹس اس کے پاس ہوتی تھیں۔ مومی ایک زندہ دل لڑکی تھی جو کہ ثانیہ میں بھی زندگی کے الیکٹرک شاکس دوڑانا چاہتی تھی۔ وہ اکثر اسے پاس بٹھا کر نصیحتیں کرتی۔

''میری جان...... زندگی کے مسئلے، جھمیلے کبھی ختم نہیں ہوں گے مگر، ہم انسان لازمی ختم ہو جائیں گے، اس لیے ضروری ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ اچھے سے اچھا گزارو، مسئلے تو چلتے ہی رہیں گے۔

روز روز رونے پیٹنے سے تو آنکھیں بھی رونے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ آنسو اچھے لگنے لگتے ہیں۔ اٹھو...... اور...... خبردار جو ایسا روتا بسورتا منہ بنایا...... بہت ماروں گی تمہیں۔ آؤ چنا چاٹ کھانے چلتے ہیں۔''

قدم چنا چاٹ کی طرف بڑھے تو زندگی کے مسئلوں کی کڑواہٹ ذرا کم پڑ گئی تھی۔ ثانیہ فراز نے بھی قہقہوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا۔ اور اس میں زندگی جاگنا شروع ہو گئی تھی تو یہ طے تھا کہ دوست،، دوستوں کو بدلنے میں لمحے لگاتے ہیں۔ پھر قہقہے تو گونجتے ہی ہیں......!!

☆☆☆

رافیہ بیگم اور فراز صاحب نے گاڑی کے دو پہیوں کی طرح زندگی گزارنے کی اپنی پوری کوشش کی تھی مگر بے سود...... وہ دونوں اپنی ان کوششوں میں کامیاب نہیں ہو پائے تھے، جانے اس سب میں قصور کس کا تھا۔ اپنی والدہ کے مجبور کرنے پر انہوں نے رافیہ جیسی طرح دار، حسین اور دلکش لڑکی سے شادی تو کر لی تھی مگر آگے آنے والی زندگی ان دونوں کے لیے کچھ خاص اچھی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ وہ جتنی آئیڈیلزم کی قائل اور مادیت پرستی کے جنون میں مبتلا تھیں، وہ اتنے ہی حقیقت پسند، سادہ اور کفایت شعار انسان تھے۔ رافیہ کو ان کی یہ کفایت شعاری اور سادگی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی جس کا اظہار وہ اکثر اپنی گفتگو میں کرتی رہتی تھیں۔

''اس گھر اور میری زندگی میں آنے والے دنوں میں کچھ بھی آسانی سے نہیں بدلنے والا۔ ہاتھ ہلکا رکھ رکھ کر بھلا کب تک زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ ایسے چھوٹے گھروں کے مسئلے تو کبھی بھی ختم نہیں ہوتے بس گھروں کے مکین ضرور اگلے جہاں سدھار جاتے ہیں۔''

''آخر تمہیں کیا کمی ہے اس گھر میں...... اتنا اچھا کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کو مل رہا ہے تمہیں۔ تم زندگی میں آخر اور کیا چاہتی ہو۔''

''ہونہہ...... ان چونا لگی دیواروں والے گھر میں زندگی گزر جائے گی...... دال اور سبزی گوشت غریبوں کے گھر ہی پکتا ہے۔ کپڑا لتا خریدنے سے پہلے جیب کو دیکھنا پڑتا ہے کہ گنجائش ہے بھی یا نہیں۔''

وہ دونوں الفاظ کی جنگ سے نہ ہارتے تھے۔ روز روز کے جھگڑوں نے طول پکڑ لیا تھا۔ فراز صاحب خاموش طبع آدمی تھے۔ آئے روز کی چپقلش نے انہیں ڈپریشن میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر شادی بیاہ کا تہوار اور عید کی خوشیاں جھگڑوں کی نذر ہو جاتی تھیں۔ وہ ہر ممکن اس سب سے بچنے کی کوشش کرتے تھے مگر کب تک۔

والدہ اور رافیہ کی آئے دن کی چپقلش اور بات بے بات جھگڑوں نے گھر کا ماحول مکدر کر دیا تھا

اور پھر والدہ کے انتقال کے بعد گھر میں وہ دو افراد ہی بچے تھے مگر جن کی آپس میں بنتی ہی نہیں تھی۔

رافیہ آئے دن میکے کے چکر لگاتی پائی جاتی تھیں۔ گھر کی صفائی اپنے کپڑے دھونے سے لے کر کھانا پکانے تک وہ سارے کام خود کرنے لگے تھے۔ نہیں تھا کہ رافیہ کو کچھ بنانا نہیں آتا تھا یا اس کے ہاتھ میں ذائقہ نہیں تھا بلکہ اس کے ہاتھ کے پکے کھانوں کی سارے خاندان میں دھوم تھی۔ جو بھی کھاتا تھا انگلیاں چاٹتا رہ جاتا تھا۔ کبھی کبھی اتوار کی صبح ناشتے کی میز پر وہ سمجھاتے ہوئے نظر آتے تھے مگر ڈھاک کے وہی تین پات، رافیہ کبھی بھی انہیں نہیں سمجھ سکی تھیں۔

''دیکھو رافیہ...... یہ دن گزر جائیں گے۔ جلد ہم کسی اچھے سے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔''

اس طویل برآمدے، سرخ اینٹوں والے فرش کے گھر میں، جس کی دیواروں سے انگوروں کی بیلیں لپٹی ہوئی نظر آتی تھیں رافیہ کو سو عیب نظر آتے تھے۔

''واہ...... میں تو جب سے اس گھر میں آئی ہوں، یہی سب سن رہی ہوں۔ یہ کیسا گھر ہے جو مکمل ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔''

''کچھ تو حوصلہ رکھو...... وقت تو لگے گا۔''

''کتنا وقت...... دن...... مہینے یا سال...... آس پاس کے لوگوں کے گھر، اور گاڑیاں دیکھتی ہوں تو کلیجے پر ہاتھ سا پڑتا ہے کہ جانے کب ہمارے بھاگ جاگیں گے۔ اماں کو تو میں معاف نہیں کروں گی۔ کس گھر میں میرے نصیب پھوڑے ہیں۔ مجھ سے سوتیلوں جیسا سلوک کیا گیا۔''

ان کے لہجے کی ملامت اور افسوس فراز صاحب کا بی پی شوٹ کر دیتا تھا۔ مگر وہ بے چارے کتنے جتنوں سے خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ تم پڑھی لکھی ہو، جاہلوں کی طرح جلد بازی سے کام کیوں لے رہی ہو۔''

سارے معاملے کو سمجھنے کے بجائے وہ الگ اپنا تماشا رچائے روتی پیٹتی سیڑھیوں پر جا بیٹھتی تھیں۔ جانے ان کے دل میں روپے پیسے کی کیسی ہوس تھی جو سیر ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی زندگی کا موازنہ دوسروں سے کرنا تھا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کے یہ موازنے ان کے اپنے ہی گھر کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ موازنوں کی وجوہات چاہے جو کچھ بھی ہوں مگر یہ گھروں کو سلامت نہیں رہنے دیتے۔ اور یہی رافیہ بیگم کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اسی غلطی کی وجہ سے وہ پچھتانے والی تھیں، حسد، موازنہ، اصراف، پیسہ کی ہوس جیسی اخلاقی بیماریوں نے انہیں فراز صاحب سے علیحدگی پر مجبور کر دیا تھا......!!!

☆☆☆

''میں اس وقت چار سال کی تھی جب امی اور ابو دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ امی نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا اور کبھی ابو سے ملنے نہیں دیا۔ میں کوئی دو یا تین بار ہی ان سے عید کے موقع پر ملی ہوں گی۔''

ثانیہ فراز کی داستان حیات سنتے ہوئے سدا کی چٹوری مومی چپس کا تیسرا پیکٹ کھول رہی تھی۔ کچھ لڑکیاں ایڈمن بلاک کے سامنے والے گارڈن میں لوکاٹ کے درختوں پر ٹنگی ہوئی تھیں اور کھٹے، رسیلے لوکاٹوں کی شاہی دعوت اڑا رہی تھیں جو مزے کے ساتھ ساتھ مفت بھی ہوتے تھے۔

ڈیزائنرز گروپ کپڑوں پر بحث کر رہا تھا جن کی آوازیں وقفے وقفے سے گونجتی تھیں۔

''اف کتنے مہنگے ہوئے ہیں یہ برانڈڈ کپڑے۔ بس ان کا نام بکتا ہے ورنہ کوالٹی کچھ خاص نہیں ہوتی۔ میں نے جو کرتا لیا تھا، اس میں کوئی پانچ کٹ لگے ہوئے تھے۔''

ہر انسان کی اپنی اپنی دلچسپیاں اور معیار تھے اور ہر ایک دوسرے سے منفرد اور الگ شناخت کا مالک تھا۔

چند فٹ کے فاصلے پر ادب کی دلدادہ مخلوق بھی بحث مباحثہ میں مشغول تھی۔

"نمرہ...... نمرہ...... مت پوچھو جو علی زریون اور تہذیب حافی کی شاعری ہے۔ تہذیب حافی کی پرسنالٹی بھی غضب کی ہے۔"

سائنس گروپ کی اپنی پریشانیاں تھیں۔

"فروا! میرے لٹمس کا رنگ ریڈ نہیں ہوا۔ اس کا مطلب میرا تجربہ اس بار بھی فیل ہوگا۔"

ثانیہ یوں ہی لوگوں کے ہجوم میں گم ہو جاتی تھی۔ لوگوں کی زندگیوں میں دلچسپیوں کے کیسے محور تھے۔ لوگ ہنستے تھے، بولتے تھے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔ سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی، مینائیں دم سادھے تھکی تھکی شاخوں پر بیٹھی تھیں۔

مومی نے مفت کوک کا ٹن پیک ثانی کو پکڑاتے ہوئے مدبرانہ سے انداز میں نصیحت کی تھی۔

"اتنا نہ سوچا کرو۔ زندگی مشکل ہو جائے گی۔"

"زندگی پہلے ہی بہت مشکل ہے مریم! بھلا سوچنے یا نہ سوچنے سے کیا فرق پڑے گا۔"

"بس بس...... کبھی کبھی تو بندہ اچھے الفاظ بھی منہ سے نکال لیتا ہے۔ ارے بھئی زندگی جیو، ہنسو، کھلکھلاؤ، پہلے ہی بوڑھی اور قنوطی روحوں کے زمین پر بوجھ بہت ہیں۔ کم از کم میں نہیں چاہتی کہ تم بھی ان میں اضافے کا باعث بنو۔"

"تم کہہ سکتی ہو چونکہ تم قاری ہو۔ کہانی کا وہ کردار نہیں ہو جس پر گزرتی ہے جو لحہ لحہ مرتا ہے۔ باپ کی شکل تک نہیں دیکھی اور ماں کو بھی اپنی اولاد میں بٹا ہوا پایا ہے۔ ایسے دکھوں پر تو رویا جاتا ہے، سکون کی سانس کہاں آتی ہے۔"

"اور تمہیں لگتا ہے کہ رونے دھونے سے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں؟ آج تک دنیا میں کسی کے بھی حل ہوئے......؟ نہیں ناں، تو تمہارے بھی نہیں ہوں گے پیاری ثانی...... عرف چوہے کی نانی۔"

آخر میں اس کا لہجہ کافی شریر ہو گیا تھا...... ثانی نے کوک کا خالی ٹن اسے دے مارا تھا۔

☆☆☆

"ابا میاں...... آخر وہ بیٹی ہے آپ کی۔ آپ کو اس کی یاد آتی ہوگی۔ اس کی ہر بات کا آپ کو علم ہونا چاہیے۔"

ٹالسٹائی کا اینا کرینینا پڑھتے ہوئے انہیں مجبوراً سر اٹھا کر ذکیہ کو دیکھنا پڑا تھا جو انار کا جوس ان کے سامنے رکھ کر خود سامنے صوفے پر بیٹھی اپنے گلاس سے جوس کے گھونٹ لے رہی تھی۔ بے شک وہ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے بہترین دوستوں میں شمار ہوتے تھے مگر ہر بار ایسی صورت حال ابا میاں کو بوکھلا کر ضرور رکھ دیتی تھی۔ وہ ٹالسٹائی کے دیوانے تھے۔ ٹالسٹائی کی تحریریں ان کے لیے جیسے سلیپنگ پلز کا کام دیتی تھیں۔ اور وہ ہمیشہ سے اس سب میں خلل ڈالنا لازمی سمجھتی تھی۔

"ہاں، مجھے اس کی یاد آتی ہے، اور میں اس کے بارے میں ہر بات جاننے کی کوشش بھی کرتا رہتا ہوں۔"

ان کے لہجے میں زمانوں کی تھکن تھی۔ ذکیہ فراز کے دل پر ہر بار ایک عجیب سی چوٹ پڑتی تھی۔ وہی انسانی نفسیات کہ جو میرا ہے، وہ صرف میرا ہو۔ چاہے کوئی چیز ہو یا کوئی رشتہ۔"

"ہاں۔ مجھے علم تھا کہ آپ اسے کیسے بھلا سکتے ہیں۔ اور آپ کو اس کے بارے میں ہر خبر ہوگی۔"

تو کیا اسی وجہ سے وہ رافیہ بیگم کی ہر کال کے بارے میں ان سے چھپا لیتی تھی۔ ابا میاں نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر انار کا جوس پینا شروع کر دیا تھا۔ انہیں وہ ننھی گڑیا عجب وقت میں یاد آئی تھی۔ دل تھا کہ مٹھی میں مسلا جاتا تھا اور وجود یہ کہ لوبان کی طرح سلگتا تھا۔

"رافیہ آنٹی اسے آپ سے ملنے کیوں نہیں دیتیں؟"

ذکیہ کو کتنا شوق تھا اتنے مشکلات سوال کرنے کا کہ جن کے لیے لغت کھنگالی جائے...... ابا میاں کے ایک ایک کر کے کھرنڈ اترتے چلے جاتے تھے۔

"اس عورت کی نفسیات میں نہیں سمجھ سکتا۔ میں

نے بھی اپنی بیٹی اسے بخش دی، تم جانتی ہو ذکو۔ کہ تمہارا باپ پتھر دل اور سخت آدمی نہیں ہے...... وفا کرنے والی عورتیں رافیہ بیگم جیسی تو نہیں ہوتیں۔"

وہ بے خیالی میں خالی گلاس تھامے اب بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

"رافیہ بیگم کے دوسرے شوہر نے ان کی پہلی اولاد کو کیسے قبول کر لیا......؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا بیٹا! مگر مجھے لگتا ہے وہ اچھے حال میں نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے تو پرایا ہی گھر ہوگا۔ اصل چھت تو سگے باپ کی ہوتی ہے۔ جس کے تلے بیٹیاں رخصت ہوتی ہیں، میں ابھی تک ثانیہ فراز کا قرض دار ہوں۔"

کھڑکیوں کی چٹخنیاں جھٹکے سے ایک ایک کر کے گری تھیں۔ ہواؤں میں سناٹا پھیل گیا اور وہ دونوں وجود کے گنبد میں قید ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اور رافیہ بیگم نے تو فیاض صاحب جیسے معمولی شکل اور کاروباری شخص سے شادی ہی اس شرط کو مد نظر رکھتے ہوئے کی تھی کہ وہ ثانیہ کو ساتھ رکھیں گی، پہلے تو اعتراضات ہوئے پھر یہ مطالبہ بھی آخر مان لیا گیا تھا۔

وہ اس گھر میں آئی تھی تو اتنے خوب صورت، لمبے باغ، کار پورچ والے گھر کو ٹکر ٹکر دیکھتی تھی پہلے پہل تو اسے یہ گھر اچھا لگا تھا مگر بعد میں پائیں باغ کے علاوہ اسے کچھ بھی تو اچھا نہیں لگا تھا۔ گارڈن میں باہر کے ملکوں کے پھول پودے تھے جہاں ایک الگ تھلگ سی دنیا آباد تھی۔ وہ دن کا بیشتر حصہ مالیوں کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ مالی بھی اسے دیکھ دیکھ حیران ہوتے کہ وہ لڑکی کتنی تیزی سے جگہیں بدل لیتی ہے۔ ابھی وہ ٹیرس سے جھانک رہی ہے۔ ابھی وہ سیڑھیوں پر بیٹھی ہے۔ ذرا سی دیر میں وہ درختوں کے سائے تلے، چہل قدمی کرتی پائی جاتی تھی۔ بلاشبہ وہ اس گھر کا ایک دلچسپ کردار تھی......!!

☆☆☆

"بابا! میں ثانیہ بات کر رہی ہوں...... مجھے یہاں نہیں رہنا...... پلیز، مجھے یہاں نہیں رہنا۔"

سسکیوں، آہوں اور وحشت میں ڈوبا کپکپاتا ہوا وہ لہجہ ذکی کو جیسے کھڑے کھڑے زمین میں گاڑ گیا تھا۔ وہ جو سوچتی رہتی تھی کہ کسی روز ایسے ہوگا اور ہو بھی گیا تھا۔ ریسیور تھامے وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

آج ثانیہ فراز اس گھر سے باہر نہیں گئی تھی۔

وہ...... تو......؟ وہ الفاظ، لہجہ ذکی کو لٹھے کی طرح سفید کرتا چلا گیا تھا وہ خاموشی سے، چپکے سے، ریسیور کریڈل پر رکھ کر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ جیسے کہ کچھ نہیں ہوا۔ کچھ بھی تو نہیں......"

"ابا میاں" کیسے "بابا" ہو گئے تھے۔ ثانیہ اس کی سینچی ہوئی پوری فصل پر کیسے ہاتھ ڈال سکتی تھی۔ اور وہ گزر جاتی...... انسان تھی ناں...... مگر ابا میاں کا چہرہ سامنے آ گیا تھا۔ وہ اس کے بہترین دوست تھے اور دوستوں کے ساتھ تو دھوکے فریب اور چال بازیاں زیب نہیں دیتیں۔ ہاتھ باندھے، آواز پر ہر ممکن قابو رکھے وہ ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"وہ وہاں نہیں رہنا چاہتی۔" جائے نماز پر بیٹھے تسبیح کے دانے گھماتے انہوں نے اضطراب کے عالم میں بند آنکھوں کو کھولا تھا۔

"کس کی بات کر رہی ہو ذکو......؟" لہجے میں فکر اور بے چینی تھی۔

وہ چپ چاپ اسٹول پر پاؤں اونچے کر کے بیٹھ گئی تھی۔ اور چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں سجا لیا تھا۔ ایلمونیم کی کھڑکیوں کے پار بھی اندھیرا انہیں چھایا تھا۔ دور پار سے موروں کی کریہہ چیخیں بلند ہونے لگی تھیں۔

"آپ کی بیٹی کی بات کر رہی ہوں۔" وہ اس انداز میں ہنسے تھے کہ ذکیہ فراز کو رونا سا آ گیا تھا۔

"وہ بہن ہے تمہاری ذکیہ...... رشتوں کو ان کے ناموں سے پکارا جانا چاہیے ورنہ تو بوجھ لگنے لگتے ہیں، وہ اس گھر کے مکینوں کے لیے بوجھ نہیں ہے۔"

سارا معاملہ انہوں نے لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔

ذکیہ نے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اپنا وزن کہیں ٹنوں میں

بڑھتا ہوا پایا تھا۔ گہری سانس فضا میں گھسن گھیریاں کھا کر رہ گئی تھی...... تو یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔

☆☆☆

فیاض منزل میں وہ جانے کب سے خود کو دلاسے، تسلیاں دے دے کر رہنے پر آمادہ کر پائی تھی۔ فیاض صاحب کی خاموشی، لاتعلقی اور گھٹے گھٹے ماحول نے اسے وقت سے پہلے سمجھ دار اور بڑا کر دیا تھا۔ وہ ان کی اولاد نہیں تھی۔ اسے اس گھر میں کسی بھی فرد سے توقعات کی گٹھڑی نہیں باندھنی چاہیے تھی مگر انسانی فطرت کے عین مطابق وہ یہ غلطی بار بار کر رہی تھی۔

رافیہ بیگم کچن کے فرش پر سسکتی ہوئی کانچ کی پلیٹوں کے ٹکڑے چننے میں مصروف تھیں۔ جو ابھی فیاض صاحب طیش اور انتہائی غصے کے عالم میں توڑ کر گئے تھے۔ آج کل ان کا بزنس نقصان میں جا رہا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ انتہائی ڈپریشن اور فرسٹریشن کا شکار نظر آ رہے تھے۔ بات بات پر پھٹ پڑتے تھے۔ ثانیہ اپنے بہن بھائیوں کو کونے کھدروں میں بھاگ کر چھپتا ہوا دیکھتی تھی۔ اور خود اپنی جگہ، کمرے میں کھڑکی میں کھڑی رافیہ بیگم کو کی جانے والی لعن طعن سنتی رہتی تھی۔

''تم ایک جاہل۔ پھوہڑ عورت ہو۔ تم جیسی عورتوں کو گھر چلانے کے طریقے سلیقے نہیں آتے۔ ہر وقت پیسہ پیسہ کی رٹ...... میں تھک چکا ہوں، خود کو مشین بنا لیا ہے میں نے۔ میری صحت گر رہی ہے مگر میں پال غیروں کی اولاد کو رہا ہوں...... لعنت ہے مجھ پر...... تمہاری فرمائشیں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں۔ میں کہاں سے پوری کروں۔''

''فیاض...... آپ غلط سمجھ رہے ہیں میں تو اتنا کہہ رہی تھی کہ ساتھ والی بیگم شہریار نے کار لی ہے کیونکہ سہولت ہو جاتی ہے ہم بھی ایسے ہی کار لے لیتے بچوں کو بھی اسکول سے آنے جانے میں سہولت ہو جاتی۔''

''کاریں مفت، میں تو نہیں بانٹی جا رہیں کہ میں جاؤں اور لے آؤں۔ اور نہ ہی میرے پاس قارون کا خزانہ ہے۔ کہو تو خود کو بیچ آؤں۔''

رافیہ بیگم تو جیسے تھرا کر رہ گئی تھیں۔ معاملہ سلجھنے کے بجائے الجھتا ہی جا رہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح کٹی ہوئی پتنگ کو دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ ان کا غصہ بھی تو ماچس کی تیلی کی طرح بھڑکتا تھا اور سب راکھ ہو کر ہی رہتا تھا۔

''اللہ نہ کرے...... اب آپ ایسی باتیں تو نہ کریں۔''

''تو کیا کہوں......! سچ کہہ رہا ہوں، خود کو گھستا آتا ہوں کچھ ٹکوں میں تو بک ہی جاؤں گا تا کہ تمہاری خواہشیں پوری ہوتی رہیں...... جو عورت ساری زندگی ''کچھ نہیں''، ''کچھ نہیں'' کہتی رہتی ہے ناں، پھر اس کے واسطے باقی بچتا بھی کچھ نہیں ہے۔''

ایک ایک کر کے پلیٹیں ٹوٹتی گئیں۔ اور کانچ کی ڈھیری پر بیٹھی رافیہ بیگم کو عجب طرح ''وہ'' گھر یاد آیا تھا...... چونے کی سفید دیواروں، اور سرخ اینٹوں کے طویل صحن والا، جس کی دیواروں پر انگوروں کی بیلیں چڑھی تھیں۔ آب خوروں کے گرد چونچ سے پانی پی کر شکر کا کلمہ پڑھتی چڑیاں تک بھی ان کی یاد میں محفوظ تھیں۔

اس سب میں اگر وہ کچھ بھولنا چاہتی تھیں تو وہ شخصیت ''فراز صاحب'' کی تھی۔ رافیہ کی ڈبڈبائی آنکھوں نے ثانیہ کو سامنے کھڑا پایا تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ فرش پر پاؤں پسارے، اور کانچ سے بہتے خون کو روکتی، پٹیاں باندھتی پہلی بار رافیہ بیگم کو وہ جوان لڑکی لگی تھی جس کی حفاظت اور ذمہ داری ان کو اپنے کندھوں پر کوہ ہمالیہ کی طرح لگی تھی۔ اسے چپ چاپ دیکھنے کے سوا وہ کچھ بھی تو نہیں کر پائی تھیں۔

''کیا دیکھ رہی ہیں؟'' وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔ کتنی نرمی اور سکون تھا اس ہنسی میں۔

''تم کتنی جلدی بڑی ہو گئی ہو ثانیہ۔''

''انسان کو بڑا تو ہونا ہی ہوتا ہے امی...... میں بھلا کب تک وقت روک کر عمر چھوٹی رکھتی۔'' کانچ

سمیٹتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں کل جا رہی ہوں۔ میں نے بابا کو فون کر دیا ہے وہ مجھے لینے آ جائیں گے۔ میں اب اور زیادہ آپ پر اور آپ کے شوہر پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔''

وہ دروازہ پار کر گئی تھی۔ رافیہ بیگم کو سر سے بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ خود کو کافی حد تک ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں۔ جو فیصلہ لینے میں وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھیں وہ ثانیہ نے پل بھر میں لے لیا تھا......!!

☆☆☆

جلال سکندر نے ان دیواروں پر دیوانہ وار ہاتھ پھیرتے ہوئے لمس کو محسوس کرنے، کھوجنے کی، پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ لوگ، وقت اور جگہیں کبھی انسانوں کا انتظار نہیں کرتیں۔ اپنی جگہ، ہیئت بدل لیتی ہیں مگر وہ دیواریں آج بھی وہیں ساکت و جامد جلال سکندر کی منتظر کھڑی ہیں۔ دیواریں حرارت سے لبریز ہیں۔ دیواریں بھی تو کتنی بڑی نعمت ہوتی ہیں کہ کبھی کبھی ہماری ساری زندگی کی تھکن کو چوس لیتی ہیں اور انسان کو خالی اور ہلکا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ یہی اس کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔

آنکھوں کا کھارا نمکین پانی رخساروں سے ہوتا ہوا منہ میں گھل سا گیا ہے۔ اس کا دل چاہ رہا ہے کہ وہ یہیں بیٹھ کر چیخ چیخ کر رو دے۔ ساری بھڑاس نکل جائے۔ دیواروں کے ساتھ لگے سفیدے کے فلک بوس درخت سر اٹھا اٹھا کر اس خوبرو اور دلکش نقوش والے شخص کو دیکھ رہے ہیں۔ ان درختوں نے جلال سکندر کا بچپن، لڑکپن دیکھا ہے اور اب جوانی دیکھ رہے ہیں۔ وہ اسے نہیں بھولے ہیں۔ وہ سویٹ ہوم کی سولہ سیڑھیاں بار بار گنتا ہے۔ ہنستا ہے اور چھوٹی انگلی سے آنسو پرے اچھال دیتا ہے۔ جلال سکندر کے لیے یہی عمارت اس کے رشتے اور گھر ہے جہاں اس نے اپنی زندگی کے چھبیس سال گزارے ہیں......!!!

☆☆☆

ثانیہ فراز کسی ڈمی کی طرح بے جان وجود کے ساتھ اس گیٹ سے باہر آئی تھی۔ ذکی کو اس گیٹ سے دو چھوٹے بچے اور ایک بچی بھی جھانکتی نظر آئی تھی۔ وہ جانے کس حال میں کار کی طرف آئی تھی۔ آخری بار پلٹ کر دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں لمحہ بھر کو بھر آئی تھیں۔ سارے مالی حویلی کے اس پراسرار اور دلچسپ کردار کو اداسی سے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ سارے منظر نامے میں وہ اتنی رچی بسی ہوئی تھی کہ اب اس کے بنا تو جیسے باقی سب ادھورا رہ جانے والا تھا۔ پائیں باغ کے درختوں کے چھتنا رسائے اور سیڑھیاں۔ وہاں کوئی کوہ قاف کی پری مٹر گشت کرتی ہوئی اب نظر نہیں آنے والی تھی۔ ذکیہ نے چھوٹے سے گول مٹول سے بچے کو ثانی کا دوپٹہ پکڑتے دیکھا تھا۔

''ثانی...... چوہے کی نانی، کہاں جا رہی ہو......؟''

رافیہ بیگم نے سارے بچوں کو پیچھے ہٹا لیا تھا۔ جانے والی کو وہ نہیں روکنے والی تھیں۔ وہ دھم سے آ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر گری تھی۔ اس کا سارا وجود جیسے ہولے ہولے قولنج کے مریض کی طرح لرز رہا تھا۔ ذکی چاہ کر بھی اس کے کندھوں پر ہاتھ نہیں رکھ پائی تھی۔ وہ تو ابھی تک ان کیفیات کے زیر اثر تھی جب ابا میاں اس کے سر پر کھڑے اس سے پوچھ رہے تھے۔

''ذکو! چلو گی میرے ساتھ......؟ وہ سمجھی تھی شاید اردو بازار جانا ہو جہاں وہ اکثر پبلشرز کی دکانوں پر کتابیں خریدنے جایا کرتے تھے۔ فٹ پاتھ کے کنارے پرانی کتابوں کے ڈھیر کے پاس کھڑے گرد آلود کتابوں کی مٹی جھاڑتے، ورق گردانی کرتے اور پھر کارٹن میں پیک کر کے کار کی ڈگی میں ڈالے گھر لے آتے تھے۔ وہ کل والی کال یکسر بھول چکی تھی۔ تو کیا ثانیہ فراز اس کی یادداشت کے خانوں سے نکل چکی تھی......؟

''کہاں جانا ہے؟'' ناخن فائل کرتی وہ بہت مطمئن نظر آتی تھی۔

"حیدر آباد جانا ہے۔" اور یہیں آ کر یادداشت کا بلب روشن ہوا تھا اور وہ ساری کتھا کا سراغ پا گئی تھی۔

"ٹھیک ہے چلیں ابا۔" پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے۔ سوچیں وجود کے گرد جال سا بننے لگی تھیں۔

"جانے وہ کیسی ہوگی؟ مجھے اس کے ساتھ ابا میاں کے علاوہ کیا کیا شیئر کرنا پڑے گا؟ میں اپنے کمرے میں اسے ہرگز بھی جگہ نہیں دوں گی۔ میری بلا سے وہ جہاں بھی رہے۔"

وہ سب کچھ طے کر کے آئی تھی۔ اب ثانی کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ موٹی کالی آنکھیں، ستواں ناک اور قابل قبول نقوش کے ساتھ وہ سانولے رنگ کی لڑکی تھی جس میں کسی کو بھی پہلی نظر میں متاثر کرنے والی کوئی بھی خاصیت نظر نہیں آتی تھی۔ جانے کیوں اسے دیکھ کر ذکی کے دل میں سکون کی لہر دوڑتی چلی گئی تھی۔ پھر وہی بات، ہائے ری فطرت، میں، میں اور صرف "میں۔"

☆☆☆

جلال سکندر نے سرسبز لان کی مٹی کی بھربھری خاک کو ہاتھوں کی انگلیوں سے گزار کر کچھ محسوس کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ مٹی تو اس کی گوڑی سہیلی تھی۔ خوشبودار، راز دار، جب ذات کی چٹخنیاں ٹوٹ کر گرتی ہیں تو انسان وحشت میں مبتلا ہو کر کوئی نہ کوئی جائے پناہ ڈھونڈ رہا ہوتا ہے۔ اسی مٹی میں اسے پناہ ملتی تھی اور وہ یہیں لیٹ جاتا تھا۔ اور مٹی "ماں" ہو جاتی تھی۔ اس کے سارے دکھ درد سمیٹ لیتی تھی۔ وہ اپنی ذات کے سارے سوال لے کر گھومتا رہتا تھا۔ لیڈی فہمیدہ اسے خصوصی توجہ سے نوازتی تھیں، سویٹ ہوم کے سارے بچوں میں وہ الگ تھلگ اور منفرد نظر آتا تھا۔ خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا وہ بچہ ان کا پسندیدہ ترین تھا جس کو وہ خصوصی توجہ اور ہمدردی سے نوازا کرتی تھیں۔

"فہمی میم...... میری امی کیسی تھیں؟"

"وہ کوہ قاف کی پریوں جیسی تھیں۔ حسین......"

"ان کے سیاہ بال واقعی زمین کو چھوتے تھے؟"

"ہاں جلال وہ بہت ہی خوب صورت بالوں کی مالک تھیں اور ان کے بالوں میں گلابوں کی کلیاں اٹکی رہتی تھیں۔ اور وہ ہر شام ہیر وارث شاہ گاتی رہتی تھیں ان کی آواز کے سوز اور حزن کی وجہ سے کونجیں اپنی ڈار سے بچھڑ جاتی تھیں۔"

فہمیدہ قصوں کہانیوں کی شیدائی تھیں اور انہوں نے جلال سکندر کے گرد بھی حقیقت کی تلخی کے بجائے تخلیل، تصور کی حسین و جمیل چار دیواری قائم کر دی تھی تاکہ اس کی آگے کی زندگی سہل ہو جائے۔ زندگی تخیل کے آسمان تلے واقعی کبھی کبھار سہل ہو بھی جایا کرتی ہے۔ پہلے شکوک و شبہات دل سے چمٹے رہتے ہیں مگر بعد ازاں دل اور دماغ سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ وہ دن بدن انہیں حیران کرنے پر تلا نظر آتا تھا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا اس میں شعور اور پختگی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ اپنے سارے کام خود کرنے لگا تھا۔ اپنے میلے کپڑے تک خود دھوتا نظر آتا تھا۔

"میں دھو دوں گی جلال! یہ میری ڈیوٹی ہے۔ اس کے مجھے پیسے ملتے ہیں۔"

"مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے کپڑے مت دھویا کریں۔"

وہ اس کی باتوں پر حیران ہو جاتی تھیں۔

"مگر کیوں؟"

"میں نہیں چاہتا کہ میری میل کوئی دوسرا دھوئے۔ جو میری چیزیں ہیں، وہ صرف اور صرف میری ذمہ داری ہیں لیڈی۔"

سویٹ ہوم کے طویل روشن برآمدے میں آئرن اسٹینڈ کے پاس وہ اپنے کپڑے استری کرنے کھڑا ہوتا تھا تو پاس پڑا باقی بچوں کے کپڑوں کا ڈھیر بھی پریس کر کے ہینگ کرتا جاتا تھا۔ صبح فجر اور عصر کی نماز کے بعد وہ واٹر ٹینک تھامے پودوں کو پانی دیتا ہوا مصروف نظر آتا تھا۔ بس ایک چیز ابھی بھی تبدیل نہیں

ہوئی تھی کہ وہ سوال کرنا نہیں بھولا تھا، فقط اتنا ہوا تھا کہ سوالوں کی نوعیت بدل گئی تھی۔

"لیڈی...... جن کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ بچے لاوارث ہوتے ہیں ناں۔"

"نہیں جلال! صرف ماں باپ سے تو رشتہ نہیں ہوتا۔ ساری کی ساری کائنات سے ہم رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ پیڑ، پھول، پہاڑ بھی ہمارے رشتے ہیں۔ ان کو وقت دو۔ ان کی سنو اور انہیں کچھ سناؤ۔ یہ تمہیں ضرور جواب دیں گے۔"

وہ آملیٹ کو کانٹے سے پھینٹتا، کتنا دل گرفتہ سا نظر آنے لگتا تھا۔

"لیڈی! دنیا ماں باپ کا نام اور رشتہ چاہتی ہے۔"

"دنیا کے ہر سوال پر توجہ نہیں دی جاتی۔ دنیا کے سامنے تو اپنی من مرضی کی جاتی ہے۔ ہم تم دنیا کو راضی رکھ ہی نہیں سکتے۔"

سویٹ ہوم کی سولہ سیڑھیوں پر بیٹھا وہ دنیا کی سوچ کو اپنی یادداشت سے حذف کرنے پر عمل پیرا نظر آتا تھا۔

"مجھے زندگی کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔" وہ بچوں میں کھانا تقسیم کر رہی ہوتیں اور وہ ساتھ ساتھ چلتا ہوا ان سے اپنے سوال و جواب جاری رکھتا تھا۔

"پگلے...... بے مقصد جینا بھی کوئی جینا ہوتا ہے؟ مقصد لے کر جینا سیکھو۔ محنت میں جت جاؤ۔ یہ سارا سویٹ ہوم تمہارا خاندان ہے۔ سمجھو تمہاری ریاست ہے تم ان کے لیے تو کچھ کرو ناں......"

اس نے اپنی زندگی کا مقصد ڈھونڈ لیا تھا اور محنت و لگن کو اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔ اسکول کی ہر جماعت میں اول آنے کے ساتھ ساتھ وہ کالج میں بھی اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔ جب بھی وہ کوئی میڈل لے کر آتا تھا۔ لیڈی فہمیدہ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کی پیشانی کو چوم لیتی تھیں۔

"ہوم کے شیلف تمہارے میڈلز اور شیلڈز سے بھر چکے ہیں۔ روشن ستارہ کو تم پر فخر ہے بچے۔" روشن ستارہ کا فخر لالٹین کی طرح چمکنے لگتا تھا۔

"میں اور بھی میڈلز جیتنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"ہم اور بھی شیلف بنوانے کا سوچ رہے ہیں۔"

جلال سکندر کا "وہ" خاندان تھا۔ حوالہ تھا جس سے وہ پہچانا جاتا تھا۔ جسے اس کے والدین جھولے میں لاوارثوں کی طرح پھینک گئے تھے اسے اس خاندان نے اپنایا تھا۔ آج چھبیس سال بعد وہ اس خاندان کے لیے واپس آیا تھا۔ جلال سکندر جو ماہر آرکیٹیکٹ تھا اور جس کا کام دیکھنے والوں پر سحر طاری کر دیتا تھا۔ آج وہ ان ہی دیواروں، پیڑوں، برآمدوں، سیڑھیوں میں "لمس" ڈھونڈ رہا ہے اور سارے کے سارے اسے آج بھی وہیں ملے ہیں جہاں وہ انہیں چھوڑ گیا تھا......!!

☆☆☆

وہ کار پورچ کے پاس کھڑی، بیگ تھامے اندر سے آنے والی آوازوں کو بخوبی سن رہی تھی۔ وہ شاید اسے اندر بلانا بھول کر کسی نئی بحث میں الجھ گئے تھے اور وہ ڈھیٹوں کی طرح خود اندر جانے کا سوچ رہی تھی۔

"ابا میاں! میں اپنا کمرہ شیئر نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کو پتا ہے ناں کہ میری نیچر کتنی پوزیسیو ہے۔"

ابا میاں آج ذکیہ کی یہ جون دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ معاملہ فہمی اور سمجھ داری اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر آج وہ اس طرح سے کیوں ری ایکٹ کر رہی تھی۔ وہ سمجھنے سے یکسر قاصر تھے۔

"ذکو......! وہ گھر چھوڑ کر آئی ہے یہ اتنا چھوٹا فیصلہ نہیں تھا اور وہ کوئی اجنبی بھی تو نہیں ہے۔ کم از کم مجھے تم سے اس رویے کی توقع ہرگز بھی نہیں تھی۔ تم نے مجھے مایوس کیا۔"

وہ واپس پلٹے ہی تھے جب وہ بیگ تھامے کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح انہیں لاؤنج کے دروازے پر کھڑی ہوئی نظر آئی تھی۔

"آؤ...... آؤ بیٹا۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔" وہ

جھجکتے ہوئے ذرا آگے کی طرف بڑھ آئی تھی۔

"آپ فکر مت کریں۔ میں اکیلی رہنے کی عادی ہوں۔ وہاں میں بارہ سال اکیلی رہی ہوں۔ مجھے ڈر نہیں لگتا، میں اندھیروں سے خوف میں مبتلا نہیں ہوتی۔"

گہرے سانولے رنگ کی وہ لڑکی اب کتنی بہادر اور نڈر لگ رہی تھی جو پچھلے چار گھنٹوں میں دوپٹا منہ پر دیے ہچکیوں سے روتی سسکتی ہوئی آئی تھی۔

ابا میاں اسے مہمان خانے میں لے آئے تھے...... ہلکے کریم کلر کے پینٹ والی وہ دیواریں ثانیہ فراز کو بہت بھائی تھیں۔ دیواریں بھی کتنی اچھی سہیلی ہوتی ہیں جو کہ آپ کی ساری تھکن، بے چینی اور اضطراب کو چوس کر شانت کر دیتی ہیں اور اسے تو ویسے بھی دیواروں سے ٹیک لے کر بیٹھنے کی پرانی عادت تھی۔ کب سے تھی اور کیوں تھی......؟ یہ بات تو اس کی یادداشت سے بھی تقریباً محو ہو چکی تھی۔

"تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے؟"

وہ ابا میاں کو کیا بتاتی کہ بارہ سالوں میں یہ سوال کبھی اس سے نہیں پوچھا گیا تھا ورنہ ضرور انہیں درست جواب دے پاتی۔

"میں رزق کو ناں نہیں کہتی۔ سب کھا لیتی ہوں بابا۔"

فراز صاحب کی سماعتوں میں لفظ "بابا" نے رس گھول دیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں ثانیہ۔ میں نے تمہارے بارے میں ہر خبر تو ضرور رکھی مگر خود تم سے ملنے نہیں آ سکا تھا۔ مجھے یقین ہے تم مجھے معاف کر دو گی۔" وہ زندگی میں پہلی بار یہ انداز دیکھ رہی تھی اور لفظ سن رہی تھی۔

"میں کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتی بابا۔ امی سے بھی نہیں۔ آپ سے بھی نہیں۔ میں ایسے دو لوگوں سے کیسے ناراض رہ سکتی ہوں کہ جنہیں اپنی اپنی اولادوں نے مصروف کر رکھا ہے۔"

وہ زمانہ شناس شخص تھے۔ اپنی بیٹی کے الفاظ میں چھپی محرومی، حسرت اور احساس کمتری کو ایک پل میں بوجھ گئے تھے۔

فراز صاحب کو اب خبر ہوئی تھی کہ ساری زندگی وہ ذکیہ فراز کو اس کے سوال کا غلط جواب دیتے آئے تھے۔ انہیں زندگی میں سب سے زیادہ "محبت" تو "ثانیہ فراز" سے تھی۔

☆☆☆

ذکی نے اگلی صبح اسے آسٹریلین چڑیوں کے پنجروں کے پاس کھڑے دیکھا تھا وہ اردگرد سے بے نیاز ان ہی میں منہمک تھی۔ وہ آہٹ پر مڑی تھی اور مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

"السلام علیکم......"

"وعلیکم السلام!"

"کیسی ہیں آپ؟" وہ ذکیہ سے اس کی طبیعت کا حال پوچھ رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟"

"تمہارا گھر بہت پیارا ہے۔"

اس نے اس جملے پر ٹھٹک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ سورج کی ہلکی روشنی ابھی پھوٹ رہی تھی۔ چنبیلی کی مہک سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ اب تمہارا بھی گھر ہے۔"

وہ خاموشی سے مختلف رنگوں کی چڑیوں کو دیکھتی ہوئی بہت پرسکون اور خوش نظر آ رہی تھی۔ ویسا ہی اطمینان اور سکون جو انسان کو اس کے "مقام" پر آ کر نصیب ہوتا ہے۔

"تمہیں چڑیاں اچھی لگتی ہیں؟" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دونوں ایک دوسرے کو اہمیت دے رہی تھیں۔ بات کر رہی تھیں۔

"ہاں۔ میں وہاں گھر کے پچھلے حصے میں سکھ چین کے درختوں پر چڑھ کر پرندوں کے گھونسلے دیکھا کرتی تھی اور مجھے یہ بھی پتا ہوتا تھا کہ کس گھونسلے میں کتنے انڈے ہیں۔ اور کتنے دنوں میں بچے پیدا ہوں گے۔" ذکیہ فراز نے خود کو اس میں دلچسپی لینے پر بمشکل روکا تھا۔

"تمہاری امی نے تمہیں کبھی نہیں روکا......؟"

...ا ہی تھی۔

"انہیں آج تک پتا نہیں چلا کہ میری دوپہریں ...ھ چین کے پیڑوں پر گزرتی تھیں۔ ان کے خیال ...ں، میں اپنا خیال رکھ سکتی تھی۔"

ذکیہ فراز کے دل نے یہ بات آخرکار تسلیم کر ہی ...ی تھی کہ وہ غاصب نہیں تھی۔ اسے حق مارنا نہیں آتا۔ ...و آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتی ہوئی لان میں آ گئی ...تھی۔

"تمہیں اپنی ماں کیسی لگتی ہیں؟" اس کا جواب ...توقع کے خلاف تھا۔

"مائیں کسی کو بری نہیں لگتی ہیں۔ مجھے لگا تھا کہ ...میرے ادھر آنے کے فیصلہ پر وہ مجھے روک لیں گی، ...میری جدائی پر روئیں گی مگر انہوں نے یہ دونوں کام ...نہیں کیے۔ اس بات کا قلق مجھے ساری زندگی رہے گا۔" وہ لہجے کو ہموار رکھتے رکھتے بھی اداس ہو گئی تھی۔

...ذکیہ فراز نے اسے کھلی کتاب کی طرح پڑھ ڈالا تھا۔ ...ہر زاویے اور لحاظ سے بے ضرر ہی پایا تھا۔ وہ اسے اس کے "مقام" سے ہٹانے نہیں آئی تھی۔ اب کی بار ...ذکیہ کے سوال میں جھجک اور محتاط پن تھا۔

"اور تمہارے سوتیلے ابو......؟" ثانی نے ...زندگی میں کبھی انہیں ہنستے نہیں دیکھا تھا۔

"میں ان کے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔ بس مجھے اتنا پتا ہے کہ وہ اچھے آدمی ہیں ورنہ کون اپنی چھت کے تلے کسی دوسرے کی اولاد کو برداشت کرتا ہے۔ ہر کسی میں اتنا ظرف نہیں ہوتا۔"

"تمہاری لغت میں سارے اچھے لوگ ہی کیوں ہیں؟"

"بس میں لوگوں کو ان کے مقام پر رکھ کر جج کرتی ہوں۔ کبھی اپنی طرف، اور صرف اپنے نقط نظر سے دیکھا ہی نہیں۔" کچھ لوگ اتنے سادہ ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں ہماری ساری تلخیاں، دکھ اور ...شکوے دھل کر صاف ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

"ابا میاں! میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں۔"

ایپرن باندھے کڑاہی میں پکوڑیاں تلتے ہوئے وہ انتہائی سنجیدہ موڈ میں تھے اور ذکی انہیں راضی کرنے کی کوششوں میں تھی۔

ساتھ ساتھ وہ ایک نظر سامنے سلیب پر ٹالسٹائی کے ناول کے صفحات پر بھی ڈال لیتے تھے۔ وار اینڈ پیس نوبل انعام یافتہ ناول تھا جو جانے کتنی ہی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک اچھے قاری ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے کک بھی تھے۔ ان کی کوکنگ کا ایک زمانہ معترف تھا۔ کچن کی کھڑکیوں کو سفید چھوٹے پھولوں والی بیلوں نے گھیر رکھا تھا۔

"آپ کو پتا ہے ناں، امی کے گزر جانے کے بعد میں آپ کے بارے میں اس گھر سے جڑی ہر شے کے بارے میں بہت پوزیسیو ہو گئی ہوں۔ آپ کو میری عادت کے بارے میں بخوبی علم ہے۔ آخر اس چھوٹے سے جرم کی سزا مجھے کب تک ملتی رہے گی۔"

وہ ایک ہفتے سے انہیں منانے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی اور وہ برابر نظر انداز کر رہے تھے۔ چولہے کی آنچ بند کر کے انہوں نے ذکی کو کندھوں سے پکڑ کر اسٹول پر بٹھا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ساون بھادوں اتر آیا تھا۔ وہ بہت گلٹی فیل کر رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں ذکو! ہر انسان اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوتا ہے اور اس طرح ہمیں انسانوں کو فیور دے دینی چاہیے۔ ثانیہ کی اس گھر میں حیثیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ وہ اس گھر میں نئی آئی تھی۔ جو انسان اتنے سال باہر کسی پرائے گھر میں رہ کر آئے تو اسے اپنی چھت لازمی چاہیے ہوتی ہے۔ اب وہ اس گھر کو کبھی اپنا گھر نہیں سمجھ پائے گی۔ پہلے روز کی نیند بے اعتباری کی نظر ہو جائے تو عمریں لگ جاتی ہیں۔ اعتبار کی نیند آتے۔"

کھڑکیوں کے پار سے اندر آتی ہوا نے وار اینڈ پیس کے صفحات پھڑپھڑا کر رکھ دیے تھے اور مطلوبہ صفحہ گم ہو گئے۔

"آئی ایم سوری۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں

بولی تھی۔

"بیٹیاں معافی مانگتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔"

انہوں نے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے پکوڑوں کی پلیٹ اس کے سامنے رکھی تھی۔ وہ شام فراز منزل کی یادگار شاموں میں سے ایک تھی۔ وہ خوش گپیاں کرتے ہوئے چائے پیتے رہے تھے۔ ذکی نے ثانی کا سامان مہمان خانے سے اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ لیا تھا۔ زندگی نے انہیں ایک ساتھ رہنا کھانا پینا، ہنسنا سکھا دیا تھا۔ اب زندگی میں سارے رنگ اکٹھے ہوئے تھے۔ گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ وہ تینوں سر جوڑے حالات، لٹریچر اور نفسیاتی ایشوز پر باتیں کرتے تھے۔

انہوں نے ایک دوسرے کی موجودگی کو قبول کرلیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی وہ راتوں کو کھڑکی میں کھڑی ہو کر سکھ چین کے سائے، وہ سیڑھیاں یاد کرتی تھی۔ انسانوں کی طرح جگہوں کی محبت بھولنے میں بھی صدیاں لگتی ہیں۔ وہ بھی صدیوں کے سفر پر گامزن ہے۔ یونہی کسی پہر ایک ننھی شریری سرگوشی اب بھی ثانیہ فراز کی سماعتوں میں رس گھولتی ہے۔

"ثانی...... چوہے کی نانی۔"

☆☆☆

لیڈی فہمی کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ وہ آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو روکتی اسے پہچان گئی تھیں اور اپنے بازو وا کر دیے تھے۔ وہ ان کے گلے لگا رو رہا تھا۔ سویٹ ہوم کی انتظامیہ نے اس لمبے چوڑے اور خوبرو مرد کو ہچکیاں لے کر روتے دیکھا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتی تھیں لیڈی! کچھ نہیں بدلا سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔ اگر مجھے کسی جگہ کا اپنی جگہ موجود ہونے کا یقین تھا تو وہ یہی میرا خاندان تھا۔ آپ سچ کہتی تھیں کہ انسان کے لیے ساری کائنات خاندان ہوتی ہے۔

وہ لیڈی فہمی کا ہاتھ تھامے ان جگہوں کو دیکھ رہا تھا جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ وقت گزارتا تھا۔ لیڈی فہمی اب بوڑھی ہو چکی تھیں۔ بال سفید گھونسلے میں بدل گئے تھے۔ آج بھی وہ سیدھی مانگ نکالا کرتی تھیں اور گول دھاریوں والا چوغہ پہنتی تھیں۔ نظر کی عینک کا نمبر بدل چکا تھا۔

"میں نہ کہتی تھی تمہیں کہ کوئی مقصد پالو...... اسے سینچو۔ پروان چڑھاؤ، اور پھر تم اس کی فصل دیکھو۔ "روشن ستارہ" کو ہمیشہ اپنے سپوتوں کی کامیابیوں کا انتظار رہا ہے جلال سکندر۔"

وہ گیلری میں بھاگتے دوڑتے بچوں کو دیکھ رہا تھا جو رک جاتے تھے۔ اسے شرمیلی ہنسی کے ساتھ سلام کر کے آگے بڑھ جاتے تھے۔ کبھی اس کا بچپن بھی تو ان برآمدوں، راہداریوں میں کھیل کود کر بڑا ہوا تھا۔ ہر چیز حروف اول کی طرح اس کے ذہن میں نقش ہو چکی تھیں۔ وہ کمروں، دیواروں، پلے گراؤنڈز کی تصویریں بنا رہا تھا۔ اسے یہاں پر بہت کچھ بدلنا تھا۔

وہ ایک سیکشن میں کھڑے تھے جہاں سارے بچے جمع تھے۔ اور لیڈی فہمی نے اسے روسٹرم پر آنے اور کچھ الفاظ کہنے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ خوب صورت ہنسی ہنستا۔ رائل سے مہکتا، کف فولڈ کرتا روسٹرم پر کھڑا اپنے سامنے بیٹھے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں شناخت کے نام پر صرف اور صرف "خاندان" تھا۔ اس کے لہجے کی گونج۔ الفاظ کا چناؤ اور ملائم مسکراہٹ دلوں کو دھڑکا رہی تھی۔ وہاں بیٹھا ہر سامع ہمہ تن گوش تھا۔

"میں نے جب آنکھ کھولی یا میرا شعور بیدار ہوا تو میں نے اپنے آپ کو روشن ستارہ کی چھت تلے موجود پایا۔ میرے اردگرد زندگی بڑے عجیب ڈھب سے گزر رہی تھی کچھ الگ۔ باقی سب سے تقریباً ہٹ کر۔ معاشرے کے دوسرے لوگوں کی زندگی میں اور یہاں کی زندگی میں واضح فرق تھا۔ میں یہاں کیسے آیا؟ مجھے کون چھوڑ گیا؟ میری شناخت کیا تھی......؟ یہ سوال آج بھی دل میں نیزے کی انی کی طرح چبھتے ہیں۔ تکلیف دیتے ہیں۔ مگر پھر مجھے لیڈی فہمی کا ساتھ ملا۔ کچھ لوگ فرشتہ نہیں ہوتے مگر وہ فرشتوں جیسے ضرور ہوتے ہیں، لیڈی فہمی بھی ان چند نایاب لوگوں میں سے ایک ہیں۔

انسانوں کو سوال اور جواب کی کھوج تھکا دیتی ہے۔ مجھے کبھی سوالوں کی کھوج نے نہیں تھکایا اور میرے جوابوں نے انہیں تپانے سے باز رکھا (مسکرا) انہوں نے میری تربیت کی۔ مجھے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا اور ساری کائنات کو میرا خاندان بنا دیا۔ بہت چالاک ہیں لیڈی (نرم نرم سا لہجہ) جانے کیوں ساری زندگی ہم شناخت کے پیچھے بھاگتے ہیں؟ امادات، حسب نسب، ذات پات، یہ سب چیزیں انسانیت سے بڑی ہوتی ہیں کیا......؟

روشن ستارہ نے جس طرح مجھے روشنی دی ہے اور ایک الگ واضح نصب العین دیا ہے۔ آپ سب کی زندگی بھی یہ اجالوں سے بھر دے گا۔

"سارے ہجوم سے ہوتے ہوئے جلال سکندر کی نظریں اچانک کھلے دروازے سے جھانکتے اس طالبات کے ہجوم پر پڑی تھیں جو وہاں وزٹ کی غرض سے آیا تھا۔ وہ سب سے پیچھے اور الگ تھلگ سی نظر آرہی تھی۔ نفاست سے دوپٹہ اوڑھے۔ فولڈر تھامے، اس کی نظریں روسٹرم کی طرف اٹھی تھیں۔ اور پھر اٹھنا بھول گئی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں پہچان کے رنگ اتر آئے تھے۔ ثانیہ فراز نے وہاں سے ہٹنے میں ایک لمحہ لگایا تھا۔ راہداریوں میں رنگ برنگے دوپٹوں اور خوشبوؤں کی بہاریں تھیں۔

☆☆☆

وہ ایک ہفتے سے اس سانولی سلونی لڑکی کو پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ اردگرد سے بالکل بے نیاز نظر آرہی ہوتی تھی۔ چہرے پر بلا کا سکون اور ملاحت ہوتی تھی۔ کبھی کبھار دونوں کی ایک دوسرے کی طرف نظر اٹھ جاتی تھی اور شناسائی کے رنگ آنکھوں میں آکر ٹھہر جاتے تھے۔ وہ ایک بادلوں بھری شام تھی۔ جب کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے جلال سکندر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" لہجہ محتاط اور سنجیدہ سا تھا۔

وہ منرل واٹر کی بوتل تھامے کھڑی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟" جواباً اس کی خیریت دریافت کرنا اس نے اپنا فرض سمجھا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ آپ پچھلے دو دنوں سے غیر حاضر تھیں۔ خیریت رہی؟" وہ چونکی تھی۔

"جی بس وہ موسمی اثرات...... فلو ہو گیا تھا۔"

"اپنا خیال رکھا کریں۔ صحت زیادہ اہم چیز ہوتی ہے۔"

"ہم کوشش کروں گی۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی شام کے دھندلکے میں گم ہو گئی تھی۔ آنے والے دنوں میں ان دونوں میں تھوڑی بہت بات چیت ہو جاتی تھی۔ جلال سکندر کو وہ دنیا کے باقی لوگوں سے ہٹ کر، ذرا سی غیر معمولی لگی تھی۔ وہ اپنا پسندیدہ منظر ڈھونڈ کر اسی پہ نظریں جما کر بیٹھی رہتی تھی۔ رنگ برنگی، تتلیاں، بھاگتے دوڑتے بچے اور پرندے...... یہ تین چیزیں اس کی نظروں کا محور ہوا کرتی تھیں۔

"آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟"

"میں سوشل ورک میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔"

"ہمم...... بہت اچھا سبجیکٹ چنا ہے آپ نے، یعنی کہ آپ انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ کم از کم اس طرح میں اپنے ضمیر کو ضرور مطمئن کر پاؤں گی۔"

کچھ مصور حضرات نے پارک کے تنہا اور ویران گوشوں میں ایزل۔ کینوس سجا رکھے تھے اور ان کی پوروں سے رنگ کھیل رہے تھے۔ وہ سحر زدہ سی ان نامکمل پینٹنگز کو دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔

"آپ کو پینٹرز اچھے لگتے ہیں؟"

"جی نہیں، مجھے تصویریں اچھی لگتی ہیں۔" اس نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا تھا۔ وہ ہنس دیا تھا۔

آپ کیا کرتے ہیں؟"
"آرکی ٹیکٹ ہوں۔"
وہ حیران ہو کر مڑی تھی۔
"آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا مجھ سے اس بات کا۔"

"بس۔ آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا تھا۔

جانے کیوں ثانیہ فراز کو لگا تھا کہ اپنی روزمرہ روٹین میں وہ بہت ہی کم مسکراتا ہوگا۔ اب وہ ہنستا تھا تو بہت پیارا لگتا تھا۔ کچنار کے پاس گزرتے ہوئے وہ شاخوں کو ہلاتا تھا تو گلابی پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے۔ وہ ہتھیلیوں میں بھر لیتی تھی۔

"آپ سماجی بہبود کے میدان میں آگے کیا کرنے کی سوچ رکھتی ہیں؟"

وہ تفصیل سے اس کے خیالات جاننا چاہ رہا تھا۔ جوتے اتار کر اب وہ اطمینان سے گھاس پر چل رہی تھی ہر بار وہ جلال سکندر کو حیران کر کے رکھ دیتی تھی۔

"ہم سوشل ورکرز بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ تعلیم اور صحت کے میدان میں انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں مگر اس سب سے پہلے ہمیں اپنے لوگوں کی سوچ کو بدلنا ہوگا۔ تب ہی کچھ ہوگا ورنہ نہیں۔ مجھے بے گھر لوگوں کو گھروں میں دیکھنا ہے۔ ایک ایسی چھت کے نیچے جو صرف اور صرف ان کی اپنی ہو، جہاں سے انہیں کوئی بھی، کبھی بھی نکالنے کی جرأت نہ کر سکے۔"

جوتے کی نوک سے گھاس کریدتا ہوا وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گیا تھا۔ جانے کیوں وہ اس سے اپنا آپ شیئر کر ہی نہ پایا تھا۔ جانے وہ کیا سوچے کیا سمجھے؟ لیڈی فہمی کتنا سمجھایا ہی کرتی تھیں کہ شناخت کے سوالوں کا ہنس کر جواب دے دو اور بس۔ مگر آج اسے علم ہوا تھا۔ ہر اصول ہر جگہ اپلائی کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔

آنے والی زندگی میں بہت بار ایسے حالات سے واسطہ پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

ایک بار وہ انہیں شاپنگ مال میں آ کر ملا
جہاں وہ اور ذکی مطلوبہ لباس کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھیں اور ذکی اس برانڈ والوں کو بے نقط سنا رہی تھی جو ہر اچھی کلیکشن کم تعداد میں کیوں بناتے ہیں۔ وہ بابا کی گاڑی لے کر آئی تھیں اور ڈرائیو کر رہی ذکیہ ہی تھی۔ ساتھ بیٹھی ثانی تو بس ہولتی رہی تھی۔ خود کو سڑک کے مناظر میں گم کر رہی تھی۔ وہ دونوں سیڑھیاں اتر رہی تھیں جب وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ان کے سامنے آیا تھا۔

"السلام علیکم ...... ثانیہ! کیسی ہیں آپ؟"

وہ براہ راست اس سے مخاطب ہوا تھا۔ ذکی نے حیرت سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ وہ خود جانے کون تھا اور ثانی سے کیسے واقف تھا۔ ثانی کو ذکی کی موجودگی میں اس طرح اس کا مخاطب کرنا [illegible] شرمندگی میں ڈبو گیا تھا۔

"وعلیکم السلام ...... جی اللہ کا شکر ہے۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بمشکل بولی تھی۔

جلال نے کافی کی آفر کی تھی مگر وہ اسے [illegible] جلدی جلدی گاڑی کی طرف آ گئی تھی۔ شاپنگ بیگز گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اچھال دیے۔ دل کی دھڑکن معمول سے ہٹ کر تھی۔

"یہ کون تھا؟" اسٹیئرنگ گھماتی ذکیہ نے [illegible] اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس کی جان لبوں پر آ گئی تھی۔

"جلال نام ہے اس کا۔ آرکی ٹیکٹ ہے۔ پارک میں واک پر ملتا ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔"
وہ ہنسی تھی۔

"لگ تو اچھا ہی رہا تھا۔ فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ ماں باپ کیا کرتے ہیں۔ ڈریسنگ سے تو کافی امیر اور ویل آف فیملی سے لگ رہا تھا۔"

"پتا نہیں۔ میں نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔"

جلال سکندر مسکرا کر رہ گیا تھا۔ کچھ لوگ کم وقت کے لیے ملتے ہیں مگر صدیوں کے لیے پسندیدگی کا اثر

ہو جاتے ہیں۔ یہی اثر ثانیہ فراز کی موجودگی کے [illegible] میں محسوس کر رہا تھا۔ مگر زندگی کا یہی تو رونا ہے کہ یہ ہمیں ہماری توقعات سے کہیں ہٹ کر پیش آتی ہے......!!!

☆☆☆

ایک صورت ہے کہ ہر آن نئی رہتی ہے
اپنی نمناک نگاہوں میں نمی رہتی ہے
خود سے ناراض ہے، تھوڑی سی خفا ہے مجھ سے
ویسے لوگوں میں تو وہ اچھی بھلی رہتی ہے
یہ جو سب یار بتاتے ہیں کسی دل کا پتا
اس خرابے میں بھی سنتے ہیں کوئی رہتی ہے
یہ بھی اس آنکھ کی افسانہ طرازی ہوگی
جاگتے میں بھی کوئی خواب بنی رہتی ہے
اس کی آنکھوں میں بہت صاف لکھا ہے
دل کے حساس علاقوں میں نمی رہتی ہے

پچھلے ایک ماہ سے وہ رنگین کارڈز اور سرخ گلاب کی کلیاں وصول کر رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فارس علی کا جا کر منہ توڑ آئے۔ اور وہ منہ توڑنے ہی آئی تھی مگر۔

"تمہیں ذرا بھی فخر محسوس نہیں ہوتا کہ فارس علی کا دل تم پر آیا ہے جو سات بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ جس پر آدھی یونیورسٹی کی لڑکیاں مرتی ہیں۔"

اس کے تلووں پہ لگی سر پر بجھی تھی۔ وہ غصے سے پھٹنے کے قریب تھی۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری وہ آدھی یونیورسٹی کی محبوبائیں۔"

وہ ہنسا تھا اور اتنا کہ گہری مشتاق آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

"ادب والے ہیں ادب سے کلام کرتے ہیں۔"

فارس علی کو جلتی پر تیل کا کام کرنا خوب اچھی طرح آتا تھا اور مقابل "وہ" ہو تو، نفیس، نک چڑھی، نک مزاج، اور اکھڑ مزاج، وہ ایسے ہی تو اس کا دیوانہ ہوا نہیں پھرتا تھا۔

ذکی اپنا بھاری بیگ اس کے سر پر [illegible] کی خواہش بڑی مشکل سے روکے ہوئی تھی۔

"تم جیسے بے ادب اور نکمے لوگوں کو ادب میں آنا ہی نہیں چاہیے۔" وہ چلائی تھی۔ وہ مزے سے محظوظ ہو رہا تھا۔ یہ کام تو اسے بہت اچھی طرح آتا تھا۔

"ہم ادب والوں کی چاہ میں کھنچے چلے آتے ہیں۔ مگر اگلوں کو کوئی قدر ہی نہیں۔" غم ناک لہجہ کافی دکھی اور غمناک سا تھا۔

"تم گرگٹ کا دوسرا جنم ہو۔"

وہ کوریڈور میں تن فن کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور وہ چارلی چپلن کی طرح قلانچیں بھرتا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"تم کہو تو "گرگٹ" بننے کو تیار ہوں۔ وہ سنجیدہ سا لہجہ ذکیہ فراز کو رکنے پر مجبور کر گیا تھا۔

"فارس، میں تمہیں وارن کر رہی ہوں، یہ سب غلط ہے۔ میں اس سب کو پسند نہیں کرتی۔"

طویل برآمدوں کے پلروں کے نیچے دو پٹی والے جوتوں اور لان کے کرتے میں ملبوس، بیگ کو مضبوطی سے تھامے، کھڑی وہ فارس علی کا دل ہمیشہ کی طرح دھڑکا کر رہ گئی تھی۔

"تم محبت کو ناپسند کرتی ہو۔" وہ سوال ذکی کی ذات کی ساری کنڈیاں کھڑکا گیا تھا۔

"محبت، عشق یہ فضول لوگوں کے مشغلے ہیں۔ تم اپنے کیریئر کی طرف توجہ دو۔"

ان آنکھوں میں ذکی نے شام کی سرخی دیکھی تھی۔

"ذکیہ فراز...... تم اپنی جگہ حق بجانب ہو مگر تمہیں دوسروں کے جذبات سے کھیلنے کا، مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

☆☆☆

وہ رات کے بارہ بجے گھر آیا تھا تو عذرا ابھی تک برآمدے میں بیٹھی مشین چلا رہی تھیں۔ وہ جوڑوں کے درد میں مبتلا تھیں مگر زندگی کی گاڑی گھسیٹنے

لیے محنت، مشقت ضروری تھی۔ اس سے تو اس گھر کا کوئی بھی فرد بیزار نہیں ہوتا تھا۔ پہلے فارس کی پیدائش اور پھر یکے بعد دیگرے جڑواں بچوں کی پیدائش وہ بھی لڑکیوں کی آمد نے انہیں ساری زندگی پریشانیوں اور بوجھ میں مبتلا کر دیا تھا۔ راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ حاجی صاحب کب کے گزر گئے تھے۔ وہ اور فارس ہی اب گھر کے کفیل تھے اور انہوں نے اپنا آرام بھی تج رہا تھا۔

وہ تھکا ہارا مسہری پر گرا تھا۔

"امی! اب تو بس کر دیں۔ کتنی بار کہا ہے کہ آپ کی صحت اب اجازت نہیں دیتی نہ کیا کریں یہ کام۔"

"چاند سفر کرتا آنگن کے اوپر تک گیا تھا۔ گملے رنگ برنگے رنگوں سے رنگے ہوئے تھے۔ چنبیلی کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

"عقیلہ، انیلا! بھائی آ گیا ہے۔" اور وہ اسی آواز کی وجہ سے نہ سوتی تھیں۔ دوڑ کر آتی تھیں، صدقے واری جاتی تھیں۔ فارس نے اپنے جاگرز پر لمس محسوس کیا تو اٹھ بیٹھا۔ انیلا تسمے کھول رہی تھی۔ اس نے چپت لگا کر پاس بٹھا لیا اور پیشانی چومی تھی۔

"پگلی...... بہنیں قدموں میں بیٹھی اچھی نہیں لگتیں۔"

وہ ان پر جان دیتا تھا۔ یونی سے فری ہو کر وہ پارٹ ٹائم کئی جابز کرتا تھا۔ ٹیوشنز، فیکٹری، ہاکری، وہ یونی میں کوئی دو، تین گنی چنی پینٹ شرٹس بدل کر پہن کر جاتا تھا جو ہمیشہ صاف ستھری ہوتی تھیں۔ اور اس حوالہ سے کبھی بھی وہ شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے پاپولر اسٹوڈنٹس میں سے ایک تھا۔ کمال کا اعتماد اور خود شناسی کے ساتھ ساتھ خوب صورت مردانہ وجاہت لوگوں کو اس کی طرف کشاں کشاں کھینچ کر لے آتی تھی۔ وہ اپنی بہنوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اکثر یہی بات عذرا بیگم کو بھی سمجھاتا رہا تھا۔

"امی...... بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں اگر ان کی تربیت اچھے سے کی جائے۔ اچھی تعلیم دی جائے، گھر داری اور ادب و آداب سکھائے جائیں۔"

اور اس نے انہیں تعلیم دینے میں کوئی بھی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ اور گھر داری، سینے پرونے، کھانے پکانے میں عذرا بیگم نے انہیں ایسا طاق کیا تھا کہ ان کے بنے کھانوں کی مہک سارے محلے میں پھیلی ہوتی تھی...... ٹی وی...... اور رسالوں سے ترکیبیں پڑھ کر وہ دوسرے ملکوں کے کھانے بنانا بھی سیکھ گئی تھیں۔

کھانے سے سر اٹھا کر فارس نے سامنے کھڑی جمیلہ کو دیکھا تھا جو روتی ہوئی موبائل کی روشن اسکرین اسے دکھا رہی تھی۔ وہ اس کی سب بہنوں سے یکسر مختلف اور الگ تھی۔ کرم کتابی تھی۔ وہ خاموش طبع اور بہت کم اور مختصر بولنے والوں میں سے تھی۔ وہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو لے کر فارس کے پاس آتی تھی۔ پہلے سامنے کھڑی انگلیاں چٹخاتی رہتی تھی۔ تمہید کے چار لفظ سوچتی اور پھر مدعا بیان کرتی تھی۔

فارس نے موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی تھی اور کھانا بھول کر جھٹکے سے اٹھ کھڑا تھا۔ وہ میڈیکل انٹری ٹیسٹ کی لسٹ تھی۔ پہلی لسٹ میں پہلے دس لوگوں میں جمیلہ امتیاز کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی ایسا ہو گا۔ وہ دونوں بہن بھائی گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

"پگلی...... آج تو نے اپنے بھائی کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا...... بھائی صدقے۔"

وہ اس کا سر اور پیشانی چومتے ہوئے رو رہا تھا۔ پھر بائیک لے کر مٹھائی لینے بھاگا تھا۔ تنکوں سے جڑے اس گھر میں خوشیاں دبے پاؤں آ کر انہیں حیران کر جاتی تھیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ زندگی بھی بس۔ کبھی کبھی!!

☆☆☆

اس نے اپنی کلاس میں مٹھائی بانٹی تھی۔ فارس علی کے روشن اور چمک دار چہرے نے پل بھر کو ذکیہ

فراز کو جیسے حیران کر کے رکھ دیا تھا...... کوئی بھائی اپنی بہن کی خوشی کو ایسے سیلیبریٹ کر سکتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"بہت مبارک ہو فارس۔" وہ اسے مبارک باد دینے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں کے پاس آئی تھی۔

"بہت شکریہ۔"

"ہم نے بہت محنت کی ہے ذکیہ! یہاں تک پہنچنے کے لیے۔ جمو بہت محنتی اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ ساری ساری رات وہ پڑھتی رہتی ہے۔ میں نے کبھی اس کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی۔ اس نے جانے کیسے ضرورتوں کو محدود کرنا سیکھ لیا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ بہنیں کہاں بوجھ ہوتی ہیں...... یہ تو مان ہوتی ہیں۔ رحمت ہیں۔"

جو بھی تھا، وہ ایک بات ماننے پر مجبور ہوئی تھی کہ سامنے کھڑا شخص، جس کی پیشانی پر بال بکھرے ہوئے ہیں۔ ستواں ناک کی نوک پر پسینے کی بوندیں جگمگا رہی ہیں وہ محبت کرنا اور رشتوں کو نبھانا اچھی طرح جانتا ہے۔ گہری سانس لے کر سر کو اثبات میں ہلاتی وہ ہونے سے پیچھے ہٹی تھی کہ کہیں اس کے سحر میں مبتلا نہ ہو جائے۔ وہ کسی بھی ایسے لمحے کی گرفت سے خوف سا محسوس کرتی تھی۔

"ذکیہ......" اسے رکنا پڑا تھا۔

"میں اتنا برا تو نہیں ہوں۔"

"میں نے کب تمہیں برا کہا ہے فارس۔"

"نظر انداز بھی تو کرتی ہو مجھے۔"

"جو سوال تم کرتے ہو، ان کے جواب میرے پاس نہیں ہوتے۔"

"میں اتنا مشکل انسان نہیں ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"اور میں آسانیوں کی عادی نہیں ہوں۔"

ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ ایک ان دیکھے خول میں سمٹتی چلی گئی تھی اور یہ بات گھر کے دونوں مکینوں نے بھی نوٹ کر لی تھی۔ اور وہ دونوں اس کی یہ حالت سوچنے سمجھنے سے قاصر تھے۔ سارا سارا دن کمرے میں بند رہنے لگی تھی۔ میز پر چائے اور کھانا ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔

ابا میاں کچن سنبھالے اس کی من پسند ڈشز بنانے میں مصروف نظر آتے تھے اور ثانیہ ان کی مددگار ہوا کرتی تھی۔ لزانیہ، اسپیگھٹی، پیزا، تھائی سوپ بھی اسے کھانے کی میز پر واپس نہ لا سکے تھے۔

ابا میاں نے ساری زندگی شانتی اور سکون میں گزاری تھی مگر عمر کے اس حصے میں آ کر وہ بھی چڑچڑے پن اور وحشت میں نظر آنے لگے تھے۔ اور ثانیہ فراز نے جس دن چینی کی پہلی پلیٹ ٹوٹی دیکھی اسے یقین آ گیا کہ ابا میاں شیکسپیئر کی "ساتویں" اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں۔

☆☆☆

"شہریار اچھا لڑکا ہے۔ اپنا بزنس کرتا ہے اور شکل و صورت کا بھی برا نہیں ہے۔"

ابا میاں نے زندگی کے سارے فیصلے جیسے کھانے کی میز پر کرنے ہوتے تھے اور فیصلے سے پہلے مدعی کو پسندیدہ کھانا کھلانا تو وہ کبھی بھول ہی نہیں سکتے تھے۔ اسٹرابری کسٹرڈ کا پیالہ ثانی کے سامنے پڑا تھا شاید فریزر کی کولنگ نے اسے سخت پتھر کی طرح کر کے رکھ دیا تھا۔ جو کھانے والے کے دانتوں کو توڑ کر کر رکھ دیتا۔

"میں نے تمہاری ماں سے بھی بات کر لی ہے اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہر کوئی یہاں اپنی اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

اس کے تصور میں جلال سکندر کی شبیہ لہرا کر رہ گئی تھی۔ لمحہ بھر کو دل دھڑکنا بھولا تھا۔ کاش وہ اتنی بہادر تو ہوتی کہ زندگی سے آگے بڑھ کر چھین کر، جھپٹ کر اپنا حق وصول کر لیتی مگر کچھ لوگوں کو یہ فن، یہ ہنر ساری زندگی نہیں آتا۔ ثانیہ فراز کو بھی نہیں آیا تھا۔ اور ابا میاں کی کچھ دونوں پہلے سے شروع کھانے کی میز پر تکرار ان دنوں کو بخوبی سمجھ آ گئی تھی۔

"میں اپنی دونوں بیٹیوں کو اونچے حسب نسب، اور گھر گاڑی والے گھر میں بیاہوں گا تاکہ ساری

زندگی وہ پائی پائی کی محتاج نہ رہیں۔"

حالات، واقعات، انسانوں کو کتنی جلدی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ ابا میاں نے جنون میں مبتلا ہو کر رافیہ بیگم سے علیحدگی کے بعد دوسری شادی کر لی اور اس کے بعد دن رات محنت کر کے اپنا آپ بھلا کر رکھ دیا تھا اور خوب مشقت کی تھی۔ تبھی آج گھر، گاڑی کے مالک تو بن بیٹھے تھے مگر اس کے بدلے ایک اہم چیز گنوا بیٹھے تھے۔ سوچ اور قناعت، کچھ چیزیں انسانوں کو گرگٹ کی طرح بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ جیسے وہ بدل گئے تھے۔

پیسہ کبھی کبھی سکون اور آسودگی کا دشمن ہوتا ہے۔ اور یہاں بھی یہی سلسلہ ہوا تھا۔ ثانیہ فراز نے جلال سکندر کی سانسیں کھینچنے میں ذرا برابر بھی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

☆☆☆

"اگلے ہفتے میری شادی ہے۔" بہت چھوٹا جملہ تھا مگر بگ بینگ سے بھی بڑھ کر ثابت ہوا تھا۔

"میں آؤں گا فراز صاحب کے پاس۔" وہ اطمینان سے ہاتھ باندھے ساری کشتیاں جلا کر کھڑی تھی۔

"کیا کہو گے؟"

"یہی کہ مجھے ثانیہ سے شادی کرنی ہے۔"

"وہ جاب کا پوچھیں گے۔"

"میں ایک آرکیٹیکٹ ہوں۔ اچھا کماتا ہوں ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب ہولڈر ہوں۔ واقعی وہ ایک شان دار نوکری کا مالک تھا۔

"گھر اور گاڑی ہے؟" برف میں ڈوبا ہو ٹھنڈا لہجہ تھا۔

"ایک اچھا گھر اور گاڑی بھی ہے۔ شہزادی کے جسم میں سوئیاں کھبی ہوئی تھیں۔ وہ تکلیف سے بمشکل سسکیاں روکے ہوئے تھی۔

"تمہاری شناخت کیا ہے جلال سکندر؟"

یہیں آ کر وہ خود دھم سے گری تھی۔

آنکھوں کے پار وہ تار پر چلتا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا جو کر تھا۔ جو گرا ہے تو کبھی سلامت نہ اٹھے گا۔

یہیں آ کر جلال سکندر کو "مات" ہوئی تھی اور لیڈی فہمی کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"وہ شناخت کا سوال اٹھا کر لے آئی تھی میم...... میں ہار گیا...... تب میرا خاندان، یہ ساری کائنات میری مدد کو نہیں آئی۔"

آج لیڈی فہمیدہ کو علم ہوا تھا کہ تخیل کی دیواریں کبھی نہ کبھی ٹوٹ کر حقیقت کی گرختگی سے لازمی جا ملتی ہیں......!! تب کوئی مدد کو نہیں آتا...... صبر سرطان کی طرح لگتا ہے۔ برداشت سے باہر۔

☆☆☆

ثانیہ فراز نے شہریار عرف شیری جیسے شخص کے ساتھ اپنی زندگی کے دو اہم سال گزارے اور سمجھوتے میں کوئی کسر بھی باقی نہیں چھوڑی۔ کرختگی، بختی، غرور اور تکبر کا مجسمہ تھا وہ۔ جانے کتنے کنالوں کے اس طویل و عریض گھر میں وہ کسی بھٹکتی ہوئی روح کی طرح گھومتی رہتی تھی۔ شہریار ایک نفسیاتی مریض ثابت ہوا تھا جو اپنی انا کی تسکین کے لیے اسے کھڑے کھڑے بے عزت کر دیتا تھا۔ سارے ملازموں کو اس خاموش طبع اور حلیم طبیعت مالکن پر ترس آتا تھا جو ہر ایسے موقع پر چپ رہتی تھی جیسے صبر اس کی گھٹی میں شامل تھا۔ وہ گھر میں گھومتے ہوئے دیواروں اور کھڑکیوں کو دیکھتی سوچتی تھی۔

"دیواروں اور کھڑکیوں سے تو عمارتیں ہی بنتی ہیں۔ جانے گھر کیسے بنتے ہوں گے۔"

کبھی کبھار پارک کی روش، اور اس پر ساتھ ساتھ بھاگتا "وہ" یاد آنے لگتا تھا وہ چھوٹی انگلی کی پور سے آنکھ کا آنسو صاف کرتی تھی۔

"ایک سماجی ورکر دل کی بیماریوں کا علاج بھی کرتی ہے کیا؟"

"تمہیں کسی سماجی ورکر کی نہیں بلکہ ایک ہارٹ اسپیشلسٹ کی ضرورت ہے۔"

وہ ہنستا تھا۔ "دل کے ڈاکٹروں کے پاس بھی دل کی بیماری کا علاج نہیں ہے۔"

"دلوں کی پیوند کاری مجھے بھی نہیں آتی۔"

وہ خود کو پودوں اور کچن کے کاموں میں مصروف رکھنے لگی۔ شیری کبھی اسے کھرپی تھامے دیکھتا تھا تو اس کا پارا ہائی ہو جاتا تھا۔ اس کے ناخن ثانی کی ہتھیلیوں میں کھب جاتے تھے۔

"تمہارے باپ نے تمہیں اور کچھ نہیں سکھایا۔ اب کسی ٹٹ پونجیے کی نہیں ایک مشہور بزنس مین کی بیوی ہو۔"

جواب میں طویل خاموشی اسے مزید طیش میں مبتلا کر دیتی تھی۔ جب بھی وہ کچن میں کام کر رہی ہوتی، وہ اسے گھسیٹ کر باہر لے آتا۔

"تم ملکہ ہو اس گھر کی۔ نوکرانی نہیں۔ جانے تمہیں نوکرانیوں والے کام کر کے کیوں سکون ملتا ہے۔"

ان دونوں کا جوڑ ہی نہیں بنتا تھا۔ ان کی ذات اور دلچسپیوں میں ہزار طرح کے تضاد تھے جن سے دونوں لڑ لڑ کر ہلکان ہو رہے تھے۔

☆☆☆

وہ ایک بادلوں بھری دوپہر تھی جب وہ پہلی بار خود تیار کر کے کھانا لگائے، تیار ہو کر کھانے کی میز پر منتظر تھی۔ شہریار اسے اس طرح دیکھ کر پہلے حیران اور پھر خوش ہوا تھا۔ ثانیہ نے مثبت رپورٹ اس کے سامنے رکھی تھی۔ اور خلاف توقع اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ اور رپورٹ اڑتی ہوئی دور جا پڑی تھی۔

"مجھے کوئی بچہ نہیں چاہیے۔ تم ختم کرا دو اس کو۔ مجھے فی الحال یہ جھنجٹ نہیں چاہیے۔"

پہلی بار اس گھر کی دیواروں نے ثانیہ فراز کی آواز سنی تھی۔

"مگر میں یہ بچہ چاہتی ہوں۔ اولاد کی نعمت اللہ ہر کسی کو نہیں دیتا۔ میں یہ بچہ ختم نہیں کروں گی۔"

چہرے پر لگنے والے تھپڑ نے اسے خاموش کروا دیا تھا۔

وہ روتی ہوئی ابا میاں کے گھر آئی تھی۔ وہی میز، وہی گھر اور وہی تینوں تھے۔ ابا میاں نے چکن کارن سوپ اس کے سامنے رکھا تھا۔

"یہ لو بیٹا! یہ میں نے خاص تمہارے لیے بنوایا ہے۔"

ذکیہ اپنے کسی ادھیڑ بن میں بریانی کی پلیٹ میں چمچ گھماتی ادھر متوجہ نہیں تھی۔

"ابا میاں! آپ شہریار کو سمجھائیں۔" اب کی بار ذکی نے آنکھیں چندھی کر کے ثانی کو دیکھا تھا۔

"تو کیا اس گھر کے لوگ نفسیاتی مسائل کا شکار ہو رہے ہیں؟"

ابا میاں نے کھانے کی میز پر بھی کتاب "تنہائی کے سو سال" پکڑی ہوئی تھی۔

"بیٹا! میاں بیوی میں چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے رہتے ہیں۔ جو تمہارا شوہر کہے، تم اس کی بات کو مان لو۔"

وہ حیرت سے مرنے کو تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس گھر میں اسے ایسے مشورے سے نوازا جائے گا۔ آنسو پل بھر میں ٹپکنے لگے تھے۔

"آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"میری عمر اور تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ تم لوگوں میں ابھی بچپنا زندہ ہے۔ وہ مجازی خدا ہے تمہارا۔ تم نے ساری زندگی اسی گھر میں رہنا ہے۔"

ذکی کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور جب بولی تھی تو اس کے لہجے میں ترحم اور افسوس تھا۔

"ابا میاں! آپ کسی ماں کو اس کے بچے کو قتل کرنے کا مشورہ کیسے دے سکتے ہیں۔ کم از کم مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔"

ثانیہ فراز ان ہی قدموں پر کچھ کھائے پیے بغیر واپس اٹھ آئی تھی۔ اور بعد میں ذکی کو خبر ملی تھی کہ اس نے ابارشن کروا لیا تھا۔

☆☆☆

بارش کی بوندیں کھڑکیوں کے شیشے توڑنے پر تلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے وجود کو کمبل میں لپیٹے پام کے

درختوں کو بھیگتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ فون کان سے لگا ہوا تھا۔

"ثانی...... میں نے اس شخص کی آنکھوں میں تمہارے لیے کچھ خاص دیکھا تھا۔ وہ سچ تھا ناں؟"

ذکی نے دو سال پہلے کے زخموں سے کھرنڈ اتارا تھا۔

"وقت نے اس واقعہ پر مٹی ڈال دی ہے۔ یہاں تو بہت سے جذبوں کے مزار بن جاتے ہیں اور لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔" بادلوں کی گونج تیز ہو اٹھی تھی۔

"تمہیں بتانا چاہیے تھا۔"

وہ ہولے ہولے سسکیاں بھر رہی تھی۔

"ابا میاں نے گھر کی ضمانت دی تھی مجھے ذکو۔ اور پتا ہے ذکو! عورت گھر کے جھانسے میں سب سے زیادہ جلدی جذباتی آجاتی ہے۔"

"اور محبت کا کیا ہوا ثانیہ فراز......؟"

ذکیہ میز کا کونہ تھامے اذیت میں مبتلا تھی۔ اب جا کر وہ دونوں سانجھ کے دکھ سے آشنا ہوئی تھیں۔ بغیر کچھ کہے...... خاموشی ہے...... ایک ان کہی تھی جو ان دونوں کے درمیان آگئی تھی۔

"ابا میاں زندگی کو ضرورتوں اور حسب نسب کے ترازو میں تولنے لگے ہیں۔ جذبوں کی سچائی اور ایمان داری سے جیسے انہیں کوئی بھی مطلب نہیں ہے۔"

حلق میں کانٹے چبھے تو اس نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"ایک بات پوچھوں ذکو......؟"

"ہاں پوچھو۔"

وہ کون ہے؟" ذکیہ فراز کی آنکھوں میں فارس علی اتر آیا تھا۔

"کلاس فیلو ہے میرا۔ فارس نام ہے اس کا۔ سات بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے وہ۔ یونیورسٹی کی آدھی لڑکیاں اس پر مرتی ہیں۔" وہ کچھ یاد کر کے نم سے لہجے میں ہنسی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے بھائی کو بار بار دروازے کے چکر کاٹتا دیکھ کر مسکرائے جاتی تھیں۔ اس کی بے چینی اور اضطراب اس کے چہرے سے ہویدا تھا۔ عذرا بیگم کو گئے ہوئے چار گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ اور جب وہ آئی تھیں تو انہیں گہری چپ میں مبتلا دیکھ کر وہ ان سے کچھ پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کر پایا تھا۔ آخر کھانے کے بعد وہ پانی پیتے ہوئے خود ہی بولی تھیں تو ان کے لہجے میں بہت اطمینان اور سکون تھا۔

"بچے...... بیٹیوں کے ماں باپ بہت سے مسئلوں سے نبٹ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی چیز ہے جسے چاہیں اس کے حوالے کر دیں۔ فراز صاحب نے بھی کسی مصلحت کے تحت ہی انکار کیا ہے۔"

فارس علی پہلے سے جواب جانتا تھا مگر پھر بھی دل میں جیسے کسی درد نے ہولے سے چٹکی کاٹی تھی۔

"امی! انہوں نے کیا کہا؟"

وہ سوال بہت مشکل تھا اور عذرا جانتی تھیں کہ جواب دینا بھی انتہائی ضروری تھا۔

"انہیں اپنی بیٹی کے لیے ایک عالی شان گھر اور گاڑی چاہیے۔ شاید انہیں اپنی اولاد کے لیے اسی میں بہتری نظر آتی ہے۔"

وہ چپ کا چپ بیٹھا رہ گیا تھا مگر یونیورسٹی میں اگلے دن وہ ذکیہ فراز کا راستہ روکنا نہیں بھولا تھا۔

"تمہیں بڑا گھر اور گاڑی چاہیے؟"

وہ بیگ کے اسٹریپ کو ہاتھوں کی انگلیوں میں گھماتی رہی تھی اور نظر ایک پل کو بھی نہیں چرائی تھی۔

"میں ادھار کی زندگی جی رہی ہوں فارس علی! میں اپنے فیصلے ابھی خود کرنے کے قابل نہیں ہوئی ہوں۔ ابا میاں کہتے ہیں، ابھی ہم میں بچپنا باقی ہے۔ اور بچوں کو تو گھر اور گاڑی کی چاہ ہوتی ہی ہے ناں۔" وہ جیسے حواسوں میں ہی نہیں تھی۔

ابا میاں کے ساتھ اس نے بیٹھک کرنا بند کر دیا تھا۔ کتابیں پڑھے جیسے صدیاں بیتی تھیں۔ جاوید چوہدری اور رؤف کلاسرا کے جانے کتنے ہی کالم وہ

مس کر چکی تھی۔

ابا میاں بلاتے تھے تو وہ چپ چاپ ان کے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ غصے میں چلانے لگتے تھے۔

"میں باپ ہوں تمہارا...... تمہاری زندگی کے فیصلے لینے کا حق رکھتا ہوں۔" وہ چپ چاپ نوالے حلق سے اتارتی رہتی تھی۔

"میں عورت کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ ایک عالی شان گھر اور گاڑی چاہتی ہے بس۔"

اور ایک دن تو وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ سارا لاوا باہر ابل آیا تھا۔

"ابا میاں! آپ کی زندگی میں اگر ایک ایسی عورت آئی تھی تو آپ اس کی سزا باقی سب کو نہیں دے سکتے۔ ہر عورت رافعہ نہیں ہوتی۔ آپ نے ایک ہی نقطہ نظر سے دیکھنے کی غلطی کی اور اپنی بیٹیوں کو بھی نہیں سمجھے۔"

الفاظ کی سچائی اور تلخی نے صرف ابا میاں کو ہی نہیں لاؤنج میں قدم رکھتی ثانیہ فراز کو بھی پتھر کر کے رکھ دیا۔

اب وہ اکثر اوقات شیری سے لڑ کر ادھر آجاتی تھی اور ابا اسے بہلا پھسلا کر اس نفسیاتی مریض کے جہنم میں دوبارہ چھوڑ آتے تھے۔ وہ مٹی کا مادھو بن گئی تھی۔ جس خاموشی سے بغیر چاپ کے قدم رکھتی تھی اسی خاموشی سے واپس پلٹ جاتی تھی۔ ابا میاں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس سے سارے راستے پوچھتے ہوئے آتے تھے۔

"ثانیہ...... تم خوش تو ہو ناں؟" اور وہ ہنسنے کی کوشش کرتی تبھی تو زخم رسنے لگتے تھے اور وہ رو دیتی تھی۔ ابا میاں تھپکی دیتے ہوئے حوصلہ بڑھاتے تھے۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا سب ٹھیک ہو جائے گا کہنے سے واقعی میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ بہلاوے، تماشے اور بس......!!"

☆☆☆

جلال سکندر نے زندگی کے دھارے میں بہنے کی پوری کوشش کی ہے مگر اب بھی کبھی کبھی وہ سانولی رنگت والی سنجیدہ مزاج والی لڑکی شناخت کا سوال لے کر آجاتی ہے تو وہ فقط ہنس دیتا ہے۔

"ساری کائنات میرا خاندان ہے ثانیہ فراز!"

روشن ستارہ کی اس نے نئے انداز میں مرمت کی ہے۔ وہ اب پانچ منزلہ بلڈنگ کا روپ دھار چکی ہے۔ لیڈی فہمی جنہوں نے سیدھی مانگ چھوڑ کر عمر کے آخری حصوں میں بالوں کو چوٹیوں میں باندھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دنیا سے جا چکی ہیں اور جلال سکندر نے بھی سو سوال کرنے کی عادت بدل ڈالی ہے۔ کبھی کبھی سوالوں کے جواب انسانوں کو دکھ کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ اب اس میں بھی بار بار دکھ برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔ پارک کی روش پر اور بوڑھے درختوں کی چھایا میں وہ اب بھی ایزل اور کینوس کو حیرت سے تکتی سانولی سلونی لڑکی کو یاد رکھے ہوئے ہے...... اب بھی ایک سوال وہ دل میں رکھے ہوئے تھا۔ کیا ثانیہ کو بھی اس سے محبت تھی......؟"

☆☆☆

ابا میاں جہاں کے تہاں بیٹھے رہ گئے تھے۔ زندگی نے انہیں کس موڑ پر آ کر اپنا آپ شیشے میں لا کر دکھایا تھا۔ ثانیہ فراز کی بدتر حالت نے انہیں بدحواسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ ساری زندگی وہ اسے سمجھوتے کا درس دیتے آئے تھے۔

فراز صاحب کو جانے کیوں ہر کسی کا مسئلہ اسے پسندیدہ کھانے کی ڈش کھلا کر ہی حل کرنا آتا تھا۔ جانے اس میں کیا حکمت تھی؟

شیری شراب کے نشے میں دھت ہو کر گھر آیا تھا اور زدوکوب کرتے ہوئے اسے طلاق دے کر اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا تھا۔ وہ روتی ہوئی گھر آئی تھی۔ ابا میاں کے دیے گئے گھر کے لالچ نے اسے

تباہ کر دیا تھا۔ کتنے چھوٹے ہوتے ہیں طلاق کے تین لفظ مگر ہماری ساری زندگی پر محیط ہو جاتے ہیں۔ آج اس موقع پر بھی وہ اسے لزانیہ اور اسپیگھٹی کھلانے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر ان کی زندگی میں ان سے بڑھ کر بڑے مسئلے آن موجود ہوئے تھے۔

بلی کے لمبے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے آج بھی ہمیشہ کی طرح ابا میاں کی شہری سے صلح صفائی کی تقریر خاموشی سے سنی تھی۔ اب تو آگے اندھی گلی تھی جہاں سب بند ملتا تھا۔ تاریک اور خوفناک اندھیرا۔ آخر میں وہ اٹھی تھی۔

"بابا......! اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ دھکے مار کر اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔ آپ نے کہا تھا وہ میرا گھر ہوگا وہاں میری خوشیاں ہوں گی مگر وہ میرا گھر نہیں تھا اور نہ ہی اس گھر سے مجھے کوئی بھی خوشی ملی ہے۔"

اور یہیں آکر گول گول گھومتا لٹو جیسے تھما تھا۔ مرکز پر رکا تھا۔ مگر وہ نہیں رکی تھی۔ جا کر کمرے میں بند ہوگئی تھی۔

ذکیہ کی نظروں نے اوپری منزل سے شیشے کے پیس کو کھڑکی سے باہر گر کر ٹوٹتا دیکھا تھا۔ ذکی کو اس کی ایک شام کہی گئی بات یاد آئی تھی۔

"مجھے دنیا میں سب سے زیادہ خوف شیشوں کے ٹوٹنے سے آتا ہے۔"

آج وہ خود یہی کام کر رہی تھی تو کیا اسے یہ سب خوف میں مبتلا نہیں کر رہا تھا؟

ابا میاں کے وجود کی عمارت دھڑام سے زمین بوس ہوئی تھی۔

"ذکو...... یہ کیا ہوگیا؟" وہ سر پکڑ کر بیٹھے تھے۔

ذکیہ فراز چپ چاپ برتن سمیٹ رہی تھی۔ آنکھوں میں ریت اتر آئی تھی۔ فون کی گھنٹی جانے کب سے بج رہی تھی۔ کچن کے نل سے پانی کے چھینٹے منہ پر مارتی وہ جانے کیا کچھ چھپا رہی تھی۔ وہ بے دلی سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ریسیور تک آئی تھی۔ چہرے سے ابھی تک پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

"ثانیہ......؟" آج پہلی بار ادھر سے آواز سن کر ذکی کسی خوف میں مبتلا نہیں ہوئی تھی۔ رافیہ بیگم کے مقابلے میں آج ابا میاں اسے زیادہ برے لگ رہے تھے۔

"میں ذکیہ بات کر رہی ہوں۔ آپ دونوں نے اولاد کو کسی گیند کی طرح کیوں سمجھ لیا ہے؟ ہر کوئی ٹھوکر مارنے پر کیوں تلا ہوا ہے؟ کیا سارے والدین ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اپنی مرضی کے فیصلے کرنے والے۔ اولاد پر شطرنج نہیں کھیلی جاتی۔"

ادھر خاموشی تھی بلکے رونے اور لحہ بھر کو سانس لینے کی آواز۔

"ذکیہ...... فیاض صاحب ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

ذکی کا دل چاہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ زندگی نے ان سے ایک ہی مقام پر آکر کیا کچھ نہیں چھینا تھا اور اس سب میں کوئی بھی تو محفوظ نہیں رہا تھا۔ ہر کسی سے خراج وصول کیا گیا تھا۔

☆☆☆

ثانی نے آنے والے تین دنوں میں خود کو کمرے میں بند رکھا تھا اور چوتھے دن کی شام کو وہ باہر نکلی تھی۔ اس کے چہرے پر عجب ٹھہراؤ اور سکون تھا۔

اگلے دن کی صبح وہ کھرپی تھامے لان کی جڑی بوٹیاں اکھاڑنے میں مگن تھی۔ سارے ہاتھ اور لباس مٹی ہوگیا تھا مگر اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ ننگے پاؤں ٹھنڈی گھاس پر چلتی رہی تھی۔ کچن میں کھڑے ہو کر ذکی نے اسے آرام سے، شوق سے کھانا پکاتے دیکھا تھا۔ وہ پاس آکر اس کے ہاتھ تھام کر کھڑی ہوگئی تھی۔

"میں شرمندہ ہوں ثانیہ! آخر کار اس گھر نے بھی تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔" وہ چہرے پر مسکراہٹ لے آئی تھی جو سو فیصد حقیقی تھی۔

"گھر، جگہیں، لوگ ہمارے قصور وار نہیں ہوتے ذکو۔" وہ بھی ابا میاں کی طرح اسے "ذکو" کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

"اصل قصوروار تو ہم خود ہوتے ہیں۔ جب زندگی ہماری ہے تو فیصلے بھی ہمارے ہوں۔ اتنا تو ہر انسان اپنی ذات پر حق رکھتا ہی ہے۔ ہماری خوشی اور غم کی وجہ ہم خود ہوتے ہیں ساری دنیا نہیں ہوتی۔ رحم، ترس اور افسوس جیسے منفی جذبے ہمیں اپنے لیے نہیں رکھنے چاہئیں ورنہ دل اور روح کو مرتے ہوئے زیادہ وقت نہیں لگتا۔"

"روشن چہرہ سانولی نمکین رنگت پر پھیلی مسکراہٹ، کچھ حادثے انسان کو آزمائش کی بھٹی میں سے گزار کر کندن کر دیتے ہیں اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔"

"تم کتنی بدل گئی ہو ثانی؟"

"اب بھی نہ بدلتی تو ثانیہ مر جاتی ذکو......"

☆☆☆

تین سال بعد وہ اس گھر میں قدم رکھ رہی تھی جہاں اس نے اپنی زندگی کے اہم ترین سال گزارے تھے۔ اسے دروازے پر ہی رافیہ بیگم، طلحہ اور ہانیہ ریسیو کرنے پہنچے ہوئے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی رافیہ بیگم سے گلے ملی تھی اور ان دونوں کو پیار کیا تھا۔

طلحہ اور ہانیہ کے چہرے پر اسے وہی خوف نظر آیا تھا جو وہ ابا میاں کی غیر موجودگی میں محسوس کیا کرتی تھی۔ طلحہ کے چہرے سے جیسے شرارت نچڑ کر رہ گئی تھی۔ کچھ حادثے ہمارا بچپنا چھیننے میں لحہ لگاتے ہیں۔ کھانے کی میز پر اسے انواع اقسام کے کھانے دیکھ کر خیال آیا تھا کہ شاید رافیہ بیگم کا آج کا سارا دن کچن میں گزرا تھا۔

طلحہ اور ہانیہ کو کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی وہ رافیہ بیگم کو بہت سنجیدہ اور بردباری دکھائی دے رہی تھی۔

ٹیرس پر دونوں چائے پیتے ہوئے ایک دوسرے کو سنبھالنے کی کوشش میں تھیں۔

"انکل کی ڈیتھ کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس طرح نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے الفاظ میں نمی کی جھلک تھی۔

"بس اللہ کی مرضی، انسان کیا کر سکتا ہے بھلا۔ دل کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ بی پی شوٹ کر جاتا تھا۔"

وہ ان کا ہاتھ تھامے ہولے ہولے دبا رہی تھی اور رافیہ کے اندر پہلی بار سکون کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ اس طرح تو کسی نے بھی انہیں تسلی نہ دی تھی اور ڈھارس نہیں بندھائی تھی۔ انہوں نے جواب اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

"مجھے تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر ہوئی تھی۔ شاید ہم ماں بیٹی کی قسمت میں ایسا ہونا لکھا تھا۔" چائے کا کپ تھامے وہ ٹیرس کی گرل کے ساتھ جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ دور تک پھیلا احاطہ اور جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی روشنیاں۔

"حادثے زندگی کا حصہ ہوتے ہیں امی...... گزر ہی جاتے ہیں۔"

"تم نے آگے کیا کرنے کا سوچا ہے؟"

"میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں اور پھر کوئی جاب۔"

وہ ہچکچائی تھیں۔ "اگر تم یہیں رک جاؤ تو......؟"

وہ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"نہیں امی۔ میں یہاں نہیں رک سکتی۔ میری مجبوری ہے۔ میں وہاں کسی کو انتظار کرنے کا کہہ کر آئی ہوں۔"

☆☆☆

ابا میاں کسٹرڈ کی گارنشنگ کرتے ہوئے کوئی سو دفعہ ذکی سے اس کی واپسی کا بوجھ چکے تھے اور ذکی کی طرف سے بھی تقریباً جواب آنا بند ہوگیا تھا۔ وہ بار بار ایک ہی سوال کا جواب دے کر زچ ہو جایا کرتی تھی۔ کچن کی کھڑکیوں کی بیلوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ابا میاں ایپرن کی دوڑیاں کھول رہے تھے۔

"میں نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا ذکو۔"

"جو ہو چکا ہے، اسے بھول جائیں۔ اگر وہ زندگی میں ایک نیا اسٹارٹ لینے جا رہی ہے تو اسے لینے دیں۔ اب وہ بچی نہیں رہی ابا میاں۔ شاید ہمارے والدین کی غلطی یہی ہوتی ہے کہ وہ ساری زندگی اپنے بچوں کو بڑا نہیں ہونے دیتے۔"

"تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو؟"

''بھلا میں کون ہوتی ہوں، آپ کو شرمندہ کرنے والی۔ میں یہ جرأت نہیں کر سکتی۔''

''مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تنہائی اور اتنے مسائل نے مجھے نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔''

''تو آپ دوسری شادی کر لیں۔''

''میری عمر ہے اب دوسری شادی کرنے کی۔''

''ابا میاں! دل جوان ہونا چاہیے بس۔''

''سب کتابی باتیں ہیں یہ۔''

''پھر تو آپ کو مان لینا چاہیے کیونکہ آپ تو کتابوں کی بہت زیادہ سنتے ہیں۔'' وہ رنجیدہ ہو گئے تھے۔

''اب تو کتابیں بھی مزہ نہیں دیتیں۔''

سلاد کے لیے پیاز کترتی وہ آنکھوں سے بہتے پانی کو بمشکل روک پا رہی تھی۔

''ابا میاں! آہستہ آہستہ ہی سب ٹھیک ہوگا ناں، چیزوں کو اپنی جگہ پر آنے میں کچھ تو وقت لگے گا ناں۔''

پانی کے نل سے چہرے پر پانی کے چھپا کے مارتے ہوئے انہوں نے سر اٹھایا تھا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ الجھے ہوئے ریشم سلجھنے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔''

زندگی سے رونق، لذت اور ذائقے ایک ساتھ رخصت ہوئے تھے اور وہ ان کی واپسی کے لیے نڈھال ہو رہے تھے۔

اس سنہری شام کو جب ثانی نے قدم رکھا تھا تو بہاروں کے رنگ جمع ہو گئے تھے۔ کتنے عرصے بعد ٹیبل پر چھری کانٹوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ ان کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ لمبے بالوں والی سفید مانو ادھر ادھر مطمئن انداز میں گھوم رہی تھی، شاید کیچپ کا بورا پیالہ چاٹ کر اس کی بھوک مٹ چکی تھی۔

آنٹی اور بچے کیسے تھے؟''

ذکی کے سوال پر اس نے سر اٹھایا تھا۔

''سب ٹھیک تھے۔ یا پھر شاید ٹھیک ہونے کی کوشش میں تھے۔ آخر حادثوں کے بعد سنبھلنے میں کچھ وقت تو لگا ہی کرتا ہے۔''

''اللہ انہیں صبر دے۔''

''آمین۔''

وہ ابتدا تھی پھر ''وہی'' تینوں تھے اور ان کی محفل تھی۔ کھانے کی میز پر اکٹھے ہونا، دنیا جہاں کی باتوں کا دور، چائے کافی کے ذائقے اور ہر نئے ایڈیشن تبصرے۔ زندگی اب کہیں جا کر قدرے سہل ہوئی تھی۔

ابا میاں ثانی کے کمرے میں آ کر ہاتھ جوڑے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے معافی مانگتے رہے اور وہ انہیں روکنے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھی۔

''پلیز بابا! ایسے مت کریں۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے...... آپ باپ ہیں۔ آپ کو ہماری زندگی کے فیصلے کرنے کا مکمل حق ہے۔''

''بیٹا! باپ کو بھی تو سارے فیصلے سوچ سمجھ کر کرنے چاہئیں۔ یہ تو نہ ہو کہ بچوں کی زندگی کو روگ بنا کر رکھ دے۔''

وہ ان کے ساتھ لگی کھڑی رہی تھی۔ تلافیوں کی پھوار نے ان کے دلوں کو جیسے ایک دم ہلکا کر کے رکھ دیا تھا۔ آنے والی ہر صبح اجلی اور تازہ دم تھی۔ جس میں رعنائی اور دلکشی تھی......!!

☆☆☆

ابا میاں نے اپنے سامنے بیٹھی اس سوبر اور گریس فل خاتون کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ پہچان کے اس رنگ کے ساتھ ہی انہیں بہت کچھ ایک ساتھ یاد آیا تھا۔ وہ شرمندہ ہو کر رہ گئے تھے......!!

''میں پہلے بھی آپ کے پاس آئی تھی مگر شاید وہ وقت کچھ مناسب نہیں تھا۔ مگر اب یہاں دوبارہ آنے کی وجہ بھی وہی ہے کہ جو پہلے تھی۔ امید ہے کہ اب آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ یہ میرے بیٹے کی تصویر ہے۔ اب ہمارے پاس گھر بھی ہے اور گاڑی بھی۔ ذکیہ بیٹی کو کوئی بھی مشکل نہیں ہوگی۔ میرا بیٹا ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت بھی کرتا ہے۔''

وہ ماں تھیں اور مائیں تو اولاد کی خوشی چاہتی

ہیں۔ ان کے چہرے پر اضطراب اور بے سکونی تھی۔

''بیٹیاں گھر اور گاڑی کے ترازو میں نہیں تولی جاتیں۔'' ابا میاں کے بے ربط فقرے اور انداز نے انہیں تھوڑا سا پریشان کر دیا تھا۔

''میں نے عجلت میں بیٹیوں کے مادی سکون کی خاطر جو اصول وضع کیے تھے۔ وہ ان کی روح پر ایسے گھاؤ چھوڑ گئے ہیں کہ میں اپنے آپ سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہا۔''

عذرا بیگم نے ایک باپ کو ٹوٹ کر جیسے ٹکڑوں میں بٹتے دیکھا تھا۔ ذکیہ فراز کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لرز کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک شخص اتنا مستقل مزاج کیوں تھا......؟ ...... وہ ابھی تک راستے نہیں بھولا تھا۔ بھولی تو شاید ''وہ'' بھی نہیں تھی......!!

اور پرندوں نے اونچی اڑان کی تھکن کے بعد
اپنے گھونسلوں کو جانے والے سارے
راستے بھلا دیے ہیں اور وہ منتظر ہیں
کہ جگنو آئیں جو انہیں
راستے دکھائیں
مگر کیا انہیں خبر ہے کہ
جگنوؤں کی روشنیاں بھی دن کے
اجالوں نے نگل ڈالی ہیں......!!

☆☆☆

شام کی ہلکی سی خنکی میں وہ شال اوڑھے پارک چلی آئی تھی۔ کچنار کے درختوں کے بوڑھے تنوں میں نیل کنٹھ بیٹھے تھے۔ شام کا نارنجی رنگ سارے منظر نامے پر چھایا ہوا تھا۔ آج ایزل اور کینوس کی تصویروں میں جانے حزن و ملال کے رنگ کیوں تھے؟ بیرن ہواؤں کی چھیڑ سے چہرے پر ہلکی نمی کا تاثر جاگا تو اس نے پونچھ لیا تھا۔ اور یہیں آ کر وہ ٹھٹکی تھی جم کر برف کے تودے میں ڈھل گئی تھی۔ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ سامنے روش پر کھڑا تھا اور اس کے عقب میں دور دور تک سنبل کے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ ثانیہ فراز کو مجبوراً اس کی طرف قدم بڑھانے پڑے تھے۔

''کیسے ہو؟'' وہ مسکرایا تھا اور اس کی ہنسی سے ثانی کو حیرت ہوئی تھی۔ شاید وہ اس دنیا میں آیا ہی اسے حیران کرنے کے لیے تھا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو سوشل ورکر؟''

''مطمئن اور پرسکون۔''

''بالکل، اکثر لوگ دوسرے کا اطمینان و سکون چھین کر پرسکون رہتے ہیں۔''

پارک میں کھیلتے بچوں کی فٹ بال کو جلال سکندر نے ٹھوکر مار کر ان کی طرف پھینکا تھا۔

''طنز کر رہے ہو؟''

''نہیں تو...... مجھے طنز کرنا کہاں آتا ہے۔''

''تو پھر یہ کیا تھا؟'' وہ سوال پوچھنے پر مجبور ہوئی تھی۔

''یہ تو بس ایک جملہ تھا۔ سادہ اور عام سا۔ ہاں سچ کہتی ہو، اکثر یہی آسان اور سادہ جملے سانپ کے ڈسے سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔''

وہ دونوں روش پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے کچھ سالوں پہلے کی طرح...... وہی انداز...... خاموشی اور ٹھہراؤ۔ جگہ وہی تھی مگر زندگی نے جانے کتنے ہی رنگ بدل ڈالے تھے۔ کہیں نہ کہیں کچھ تو بدلا بھی تھا۔ ریت سے بھری مٹھی جتنا...... یا...... پھر باجرے کے دانے جتنا......!!

''مجھے تمہارے بارے میں پتا چلا تھا تو بہت افسوس ہوا تھا۔ شاید کہ تم نے یہ سمجھا ہو کہ یہ جلال سکندر کی کسی بددعا کے نتیجے میں ہو سکتا ہے۔''

وہ چونکی تھی اور ساتھ چلتے شخص کا چہرہ دیکھ کر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ وہ کتنا سنجیدہ تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ اور تمہاری دی ہوئی کوئی بددعا مجھے نہیں لگ سکتی۔''

''اتنا جانتی ہو میرے بارے میں؟''

جلال سکندر نے اس عرصے میں جانے شوخی کہاں سے سیکھی تھی۔

''نہیں...... اپنے بارے میں جانتی ہوں......''

اس کا منہ بن گیا تھا۔

''میں نے بددعا دی تھی۔'' وہ جاتے جاتے پلٹی

تھی۔

"تمہاری بددعائیں ہمیشہ بے اثر رہیں گی۔"

☆☆☆

وہ دونوں جیسے کسی خواب میں بیٹھے تھے...... دونوں بے یقین بھی تھے۔ فارس علی کی بہنیں اس کے گرد جمع تھیں اور صدقے واری ہوتے ہوئے نہ تھک رہی تھیں۔ کبھی وہ اس کی بندیا ٹھیک کرتی تھیں اور کبھی ہاتھوں میں تھامے پرس کی جگہ بدلتی تھیں۔ ذکیہ فراز سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس گھر سے اسے اتنی محبت اور عزت واحترام ملے گا۔ زندگی نے جو کانٹے اس کے پیروں میں چبھوئے تھے وہ اس شخص نے سارے کے سارے چن لیے تھے۔ وہ دونوں واقعی ایک دوسرے کے لیے بنے تھے وہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کے گلے مل کر خوب روئی تھیں۔ ثانی نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"دیواروں سے گھر نہیں بنا کرتے ذکو! گھر بنانا تو ایک آرٹ ہے جو ہم سب لڑکیوں کو ضرور آنا چاہیے۔ وہی اب تمہارا گھر ہے اور وہاں کے مکین تمہارے اپنے۔ تمہیں اب ان ہی کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ اور یہی تمہاری سب سے بڑی ذمہ داری ہوگی۔"

فارس علی ایک محبت کرنے والا شوہر تھا اور ذکیہ فراز اس کے دکھ سکھ کی ساتھی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ماضی کی باتوں کو یاد کر کے ہنس رہے ہیں اور محبت ان کی اس ہنسی میں برابر کی شریک ہے۔

جیسے بھی حالات ہوں، ملن جو ہونے ہوں ہو کر ہی رہتے ہیں کیونکہ یہ اختیار صرف اور صرف اوپر والے کے پاس ہوتا ہے۔ انسان تو صرف وسیلہ ہوتے ہیں اور بس......!

☆☆☆

ابا میاں اس کے بچپن سے لے کر اب تک کی کہانی سن کر بہت حیران اور مطمئن بیٹھے تھے۔ وہ شخص ہر اعتبار سے ثانیہ کے لیے بہترین تھا۔ وہ ایک ہیرا تھا اور ہیرے کے لیے وہ جگہ نہیں دیکھی جاتی جہاں وہ ہوتا ہے بس صرف ہیرے کو دیکھا جاتا ہے۔ جو اپنی روشنی سے اگلے کو حیران کر دیتا ہے۔

"روشن ستارہ" کو برقی قمقموں سے سجایا گیا ہے اور دونوں جلال سکندر کے خاندان سے باری باری مل رہے ہیں۔ برآمدے میں جلتی بجھتی روشنیوں کے درمیان وہ دونوں کھڑے ہیں۔

"تم کتنی خوش قسمت ہو کہ تمہیں میرا ساتھ ملا ہے۔" وہ تیکھی چتون سے اسے گھورتی ہے۔

"کچھ لوگوں کو زندگی میں صرف خوش فہمیاں پالنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔"

"تمہیں پتا ہے، کچھ لوگ ہمیں اپنی سانس کی طرح عزیز ہوتے ہیں اگر وہ ہمیں نہ ملیں تو ہم تڑپنے لگتے ہیں اور زندگی سے سکون ختم ہو جاتا ہے۔ تم بھی میری سانس کی طرح میرے لیے ضروری ہو۔ اس دن کے بعد مجھے لگا تھا کہ میں تمہیں دوبارہ کبھی دیکھ نہیں پاؤں گا۔ مگر دل ہے کہ کسی امید سے خالی ہی نہیں رہتا۔ حالانکہ تم نے مجھے کوئی امید بھی نہیں دلائی تھی۔"

اس لمبے، خوبرو شخص کی باتوں نے ثانیہ کے دل کو دھڑکا دیا تھا۔

"وہ وقت میرے لیے امید دلانے کا بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی ہماری روح میں امید کا بیج بو دیا جاتا ہے اور ہم اس سے انجان ہی رہتے ہیں۔ میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ اب ہم مل کر ایک گھر بنائیں۔ اس گھر کی دیواریں اور ہر پھول پودا ہماری محبت اور ساتھ کی گواہی دے۔"

روشن ستارہ کے گیٹ پر فارس علی اور ذکیہ ان دونوں کے منتظر ہیں۔ وہ اپنی شادی کی پہلی دعوت ان کے ہاں کھانے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر سے ہی سہی مگر زندگی آسان ہوگئی تھی۔

زندگی کے آسمان پر طاری ہونے والی شامیں لازمی سویروں میں بدل جاتی ہیں۔ بس تھوڑا سا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ہر پہر شام کا نہیں ہوتا۔ ہر فجر نیا آغاز ہوا کرتی ہے۔

☆☆

ثمرہ بخاری

سانولا سویرا

ناولٹ

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو ناصیہ طیب! مجھ پر یعنی ضومران عابدی پر تنقید کرتی ہو، یہ سوچے بغیر کہ تم خود کیا ہو، کیا حقیقت ہے میری نظر میں تمہاری، ہونہہ مجھے بھلا تمہاری رائے سے کیا مطلب، جب ساری لڑکیاں میری تعریف کرتی ہیں۔ میری اداکاری کو سراہتے نہیں تھکتیں اور اس بات کا ثبوت میری رائٹنگ ٹیبل پر موجود یہ ڈھیروں خطوط ہیں۔ جو ملک کے مختلف شہروں سے میرے نام آتے ہیں۔ ان میں میری ایک ایک ادا کو سراہا گیا ہے۔ مجھے ملک کا خوبرو ترین اداکار کہا گیا ہے۔ اور تم کہتی ہو مجھے یہ کام چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ اداکاری میرے بس کا روگ نہیں۔" جب سے ضومران کی بہن انیلا نے اسے اپنی خالہ زاد ناصیہ طیب کی رائے بتائی تھی۔ اس کا تن بدن سلگ رہا تھا۔ ہزار بار ناصیہ طیب پر لعنت بھیجنے کے باوجود چین نہیں پڑ رہا تھا۔ "تم جو کچھ بھی کہتی رہو یہاں پروا کسے ہے۔" اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے یہ فقرہ کئی مرتبہ ذہن میں دہرایا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ یہ حقیقت بھی تو تھی بھلا اس کی نظر میں ناصیہ طیب جیسی عام سی گھریلو ٹائپ لڑکی کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی۔ وہ تھی تو اس کی سگی خالہ زاد مگر میل جول بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر رہا تھا۔

والدین کی وفات کے بعد ددھیال سے تعلق قائم رہا۔ مگر ننھیال سے تو بالکل ہی کٹ کر رہ گئے تھے یہ لوگ، ایک شہر میں رہتے تو شاید یہ بات نہ ہوتی۔ مگر ماموں خالہ وغیرہ پنڈی میں رہتے تھے۔ جبکہ یہ لوگ شروع سے لاہور میں تھے۔ اب ناصیہ کے والد جو سرکاری محکمے میں معمولی پوسٹ پر تھے یہاں آ بسے تو کبھی کبھار کا آنا جانا ہوا، وہ بھی خالہ کی وجہ سے پھر انیلا بھی اپنی امی کے رشتے داروں سے میل ملاپ رکھنا چاہتی تھی۔ یوں دونوں گھروں کا اب کافی آنا جانا ہو گیا۔

انیلا اور چھوٹے ایرج سے ناصیہ کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ البتہ ضومران سے اس کی بات چیت سلام دعا تک محدود تھی اور اس کے پاس تو اتنا وقت ہی نہیں تھا جسے اس کھانا پکانے کی ترکیبوں تک محدود ذہن رکھنے والی لڑکی پر ضائع کرتا رہے۔ یوں بھی گھر پر ہوتا تو

پھوپھی زاد پنکی، نمو اور چچا زاد شرمین ہی گھیرے رہتیں۔ اسے تو اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ کجا کہ وہ ناصیہ طیب! مگر آج جو بات انیلا نے بہت ہنس ہنس کر اپنے بھیا جی کو بتائی تھی اس کے تو تن من کو راکھ کر گئی تھی۔ البتہ بہن سے اس نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔

☆☆☆

ان دنوں ٹی وی پر اس کی نئی سیریل چلنے والی تھی۔ جس میں اپنی اداکاری کے متعلق اس کا یہی خیال تھا کہ اس سال کا ایوارڈ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں لے سکتا۔

جس دن پہلی قسط ٹیلی کاسٹ ہونا تھی، اسے اپنے دوست کی برتھ ڈے پر جانا تھا۔ پنکی نے بہت روکا شرمین نے ناراض ہونے کی دھمکی بھی دی۔ انیلا اور نمو نے کہا دوست سے معذرت کرلو اور یہ قسط گھر پر ہی دیکھو مگر اہمیت کے احساس نے اس کی سوچ کا انداز بدل دیا تھا۔ اسے اپنا قد ان سب میں بہت بلند اور چہرہ اتنا روشن و دلکش لگتا کہ اس کے سامنے چراغ بجھتے محسوس ہوتے۔ کہہ دیا کہ اپنے دوستوں میں بیٹھ کر دیکھوں گا اور ان کی کسی بات کی پروا کیے بنا وہ گھر سے نکل آیا۔

حسب توقع برتھ ڈے پارٹی میں لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ نہ صرف خوبرو ویل ایجوکیٹڈ اداکار تھا بلکہ ایک مصروف کنٹریکٹر بھی تھا۔ اسی لیے خواتین کا گھیرا اس کے گرد کچھ زیادہ ہی تنگ رہا۔ ڈرامہ دیکھنے کے دوران اس کی اداکاری کی اتنی تعریفیں کی گئیں کہ اس شعبے کے سینئر سے سینئر کے لیے بھی منہ پر تعریف کچھ پریشانی پیدا کرتی مگر وہ تو ہمیشہ سے بہت پراعتماد تھا۔ اسے اپنی شخصیت اور صلاحیتوں پر بہت مان تھا وہ سمجھتا تھا۔ یہ سب جو لوگ کہہ رہے ہیں جھوٹ نہیں، وہ واقعی ان تعریفوں کے قابل ہے۔

جب وہ رات گئے گھر واپس آیا تو سب اسی کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہی ستائش وہ تو بس ان کے ایک ساتھ بولتے چہروں کو دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"مجھے پورا یقین ہے ضومران! اس مرتبہ ایوارڈ آپ کا ہے۔" شرمین نے تو اس کے دل کی بات کہہ دی۔

"اچھا اب بہت باتیں ہو چکیں میرا خیال ہے سونا چاہیے۔" یہ باتیں اس کے لیے نئی تو نہ تھیں جو نیند گنوا دیتا۔ اس کے وہاں سے اٹھتے ہی سب اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔

"صبح تو سارا ٹائم فون کو دینا پڑے گا۔ تعریف، تعریف اور بس تعریف۔" آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر برش کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ اور تبھی اچانک جانے کہاں سے نکل کر ناصیہ طیب چھم سے آ کھڑی ہوئی۔

"اداکاری تمہارے بس کا روگ نہیں ضومران عابدی۔" اسے اس دم اس کا گندمی چمکتا ہوا رنگ کچھ اور بھی چمک دار محسوس ہوا جیسے سب کچھ ناصیہ طیب ہی تو ہے۔ باقی کچھ بھی نہیں۔ یہاں تک کہ ضومران عابدی بھی صرف اور صرف گھنے جنگل کی اس جھاڑی کی مانند ہے جس پر اکلوتا پھول کھلا ہے اور وہ جنگل کی تاریکی میں اسے دیکھ کر یہی فیصلہ کرسکا ہے کہ میں دنیا کا تمام حسن سمیٹے ہوئے ہوں۔

"نجانے اب کیا رائے ہے ناصیہ کی میری ایکٹنگ کے بارے میں۔" اسے یہ جاننے کی خواہش محسوس ہونے لگی مگر جلد ہی ضومران عابدی نے شانے جھٹک کر لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔ "جو بھی رائے ہو اس کی مجھے بھلا کیا مطلب، وہ بھلا کیا جانے اداکاری ہوتی کیا شے ہے۔"

صبح دن کی آمد کا اندازہ جس طرح اس نے لگایا تھا بالکل وہی نظارہ سامنے تھا۔ پسندیدگی کا اظہار کرتی نگاہیں اسے اور بھی مغرور بنانے والے جملے "ضومران کمال کر دیا۔ آپ نے، مان گئے صاحب آپ کو۔ اللہ آپ اتنی اچھی ایکٹنگ کیسے کر لیتے ہیں۔" ایسے ہی جملے اور اس کی ہلکی سی مسکراہٹ، اب تو یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلے...... آفس سے واپسی پر وہ تھکے ہوئے انداز میں ایزی چیئر پر گر گیا۔

"آ گئے آپ بھیا، آج کچھ دیر نہیں کر دی آپ نے۔" انیلا اس کے قریب آ بیٹھی۔

"ہاں کام کچھ زیادہ تھا نا اس لیے۔" اس نے ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کھانا لگاؤں آپ کے لیے۔"

"اتنی کیا جلدی ہے تمہیں۔" وہ سست ہو رہا تھا۔

"جلدی ہے نا مجھے میں نے ابھی ناصیہ باجی کی طرف جانا ہے۔"

"کیوں ادھر جانے کی کیا دھن سوار ہو گئی ہے تم پر۔"

"میں نے وعدہ کیا تھا ناصیہ باجی سے جلد آنے کا آپ چھوڑ آئیں گے مجھے۔"

"اوں ہوں سوری گڑیا! میں تو بہت تھک گیا ہوں۔" وہ بُرا منائے بغیر بولی۔

"کہاں لے کر جانا ہے مجھ غریب کو۔" ایرج بھی آ پہنچا۔

"ناصیہ باجی کی طرف جانے کو کہہ رہی تھی۔"

"ہاں ادھر تو میں ضرور جاؤں گا۔" وہ فوراً تیار ہو گیا۔

"پھر کھانا لگا دوں بھیا آپ کے لیے۔"

"نہیں نیلو تم لوگ جاؤ میں، شرفی سے کہہ دوں گا اگر بھوک ہوئی تو۔"

"بھوک کیوں نہیں ہو گی بھلا، آپ اپنی صحت کا خیال رکھا کریں بھیا۔"

"اچھا بلکہ بہت اچھا۔" وہ بہن کے پیار پر مسکرا اٹھا۔

"خدا حافظ۔" ایرج کو جانے کی...... زیادہ ہی جلدی تھی۔

"واپسی کب تک ہو گی تم لوگوں کی۔"

"جلدی آنے کی کوشش تو کریں گے ویسے ان کے ہاں جا کر باتوں میں وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔" ایرج اور انیلا کچھ زیادہ ہی متاثر تھے ناصیہ وغیرہ سے۔ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد اس نے اشرفی سے کہہ کر کھانا اپنے کمرے میں ہی منگوایا۔ اس سے فارغ ہو کر سوچا چچا جان کے ہاں ہو آئے۔ جو ساتھ کے گھر میں رہتے تھے۔ پھر چند منٹ آرام کے خیال سے لیٹ گیا۔ "نجانے نیلو اور ایرج کی واپسی کب تک ہو گی۔ ایک تو نیلو کو بھانت بھانت کے لوگوں سے دوستیاں کرنے کا بڑا شوق ہے اب یہ ناصیہ ہونہہ جانے کیا نظر آیا ہے انہیں اس میں، گن گاتی نہیں تھکتی بے وقوف۔ جانے اب کیا رائے ہو گی اس کی میرے بارے میں، میرے سیریل کی بات تو ضرور ہو گی۔" اسے ناصیہ کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ اب تو یقیناً سراہے بنا نہیں رہ سکیں گی موصوفہ، اسے یقین تھا۔ اور اب اس کی رائے جاننے کا تجسس سر ابھارنے لگا۔ اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے نیلو اور ایرج کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ تو جیسے جا کر واپس آنا ہی بھول گئے تھے۔ اسے ریکارڈنگ کے لیے جانا تھا۔ زیادہ دیر ان کی راہ نہ دیکھ سکا۔ مایوسی سے سر جھٹک کر تیاری کرنے لگا۔

رات گئے جب اس کی واپسی ہوئی تو وہ دونوں سو چکے تھے۔ وہ بھی کی رائے والی بات بھول ہی چکا تھا۔ صبح ناشتے پر ان سے ملاقات ہوئی وہ دونوں ناصیہ ہی کا ذکر لیے بیٹھے تھے۔

"کل بہت دیر لگا دی تم نے خالہ کے ہاں۔" اس نے آتے ہی سوال کیا۔

"کہا تو تھا بھیا ادھر جاتے ہیں تو باتوں میں وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔"

"غلط بات ہے یہ۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ دونوں خاموش ہو کر ناشتہ کرنے لگے۔ اور اب ضومران انہیں اس قدر سنجیدگی سے نصیحت کر کے پچھتا رہا تھا کہ دونوں بالکل چپ تھے جبکہ وہ ناصیہ کی رائے جاننا چاہتا تھا۔

"پھر کیا حال ہے ان سب کا، اتنی دیر آخر کیا باتیں ہوتی رہیں۔" اسے خود ہی خاموشی کو توڑنا پڑا۔

"سب ٹھیک ہیں۔ خالہ آپ کو دعائیں کہتی تھیں اور کہہ رہی تھیں اگر وقت ملے تو کبھی ادھر کا بھی چکر لگا جاؤ۔"

"اچھا اور ان ناصیہ صاحبہ کی کیا رائے ہے۔ اب میری ایکٹنگ کے بارے میں؟" اس نے تمسخرانہ سے لہجے میں بظاہر یونہی پوچھا۔

"اس موضوع پر تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔"

نیلو کے کہنے کی دیر تھی، اس کا جی چاہا اپنے ان دونوں لاڈلوں کے ایک ایک جڑ دے۔ "بھلا یہ بھی کوئی بات ہے میں نے اتنا ٹائم جس بات کے انتظار میں خراب

کیا وہ سرے سے ہوئی ہی نہیں۔"

"ہیلو ایوری باڈی، ابھی تک یہیں ڈٹے ہوئے ہو۔" شرمین نک سک سے تیار آن پہنچی۔

"آؤ ناشتا کرلو باجی!" ایرج نے دعوت دی۔

"تم یہ باجی واجی اپنے پاس ہی رکھو۔" اس کا موڈ آف ہوگیا۔

"ارے تو کیا آپ بڑی نہیں ہیں۔ مجھ سے۔" ایرج کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"اتنی بھی نہیں کہ تم کبھی باجی اور کبھی آپا کہنے لگو۔"

"میں تو ناصیہ باجی کو بھی باجی کہتا ہوں آپ ہی کی عمر کی ہیں مگر وہ برا نہیں مانتیں۔"

"تو شوق سے کہو اسے، بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ ناک سکیڑ کر بولی۔

ضومران اٹھ کھڑا ہوا، شرمین کو کچھ یاد آ گیا۔

"ہاں ضومران میں تو آپ سے بہت ضروری بات کرنے آئی تھی، اس ایرج کے بچے نے سب کچھ بھلا دیا۔"

"ایرج کا بچہ مبارک ہو پھر تو آپ باجی کے ساتھ ساتھ پھوپھو بھی ہیں بلکہ بڑی پھوپھو۔" ایرج چہک کر کہنے لگا۔ نیلو اور ضومران ہنس پڑے۔

"ویسے ایرج تم بہت بولتے ہو تمہاری موجودگی میں بات کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہاں ضومران میں یہ کہنے آئی تھی، پلیز آج شام جلد گھر آنے کی کوشش کریں میری کچھ فرینڈز آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"خیریت تو ہے فرینڈ آپ کی اور ملنا ان سے چاہتی ہیں۔" ایرج نے تشویش بھرے انداز میں سوال کیا۔

"جی آپ کو کوئی اعتراض۔" شرمین نے اس کے بال مٹھی میں دبا کر کہا۔

"اوہ نہیں، بالکل نہیں البتہ آپ کو آج نہیں تو کل اعتراض ہو سکتا ہے ان سہیلیوں کے بھائی کے پاس آنے جانے سے۔" اس نے ضومران کی طرف دیکھ کر کہا جو اس کی طرف متوجہ تھا اور مسلسل مسکرا رہا تھا یعنی اور بھی چڑھا رہا تھا بھائی کو۔

"ضومران سمجھالیں آپ اسے، پٹ جائے گا میرے ہاتھوں۔" شرمین نے ذرا انداز سے کہا۔

"کوئی بات نہیں آخر باجی ہیں آپ ان کی۔" ضومران کہہ کر باہر نکل گیا اور ایرج، شرمین کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

☆☆☆

"آج ریکارڈنگ ہے سر۔" سیکریٹری یاد نہ دلاتی تو وہ شاید بھول ہی چکا تھا۔

رات کافی لیٹ جب وہ تھکن سے چور گھر آیا تو انیلا اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے بھیا، کیا بہت تھک گئے ہیں آج۔" وہ اس کے لہجے سے ہی جان گئی۔

"ہاں نیلو اور آج کھانا مت نکالنا میں کھا کر آیا ہوں۔" وہ جلد سے جلد بستر میں گھسنا چاہ رہا تھا لہٰذا بہانہ بنا دیا۔ مگر جب بیڈروم میں آیا تو انیلا بھی وہیں موجود تھی۔

"نیلو، گڑیا سو جاؤ جا کر۔"

"آپ سچ بتائیں کھانا کھا کر آئے ہیں۔" وہ ضومران کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"اوہ دراصل بہت تھکا ہوا ہوں، اس لیے کہہ دیا۔"

"اچھا دودھ کا گلاس لے آتی ہوں۔"

"نہیں، نیلو بس رہنے دو۔"

"انکار نہیں چلے گا۔" وہ اتنا کہہ کر باہر نکل گئی۔

"مت جاگا کرو رات گئے میری خاطر۔" وہ گلاس لے کر آئی تو اس نے کہا۔

"تاکہ آپ بنا کچھ کھائے پیے ہی سو جائیں، ہے نا۔" وہ اس کے قریب آ بیٹھی۔

"میں تو اس لیے کہہ رہا تھا صبح تمہیں کالج بھی جانا ہوتا ہے، نیند پوری ہونی چاہیے تمہاری۔"

"نیند آپ سے زیادہ پیاری تو نہیں مجھے۔" اس نے سر بھائی کے شانے سے ٹکا دیا۔

"ایرج تو سو گیا ہے نا۔"

"جی بس کچھ ہی دیر پہلے سویا ہے۔ شرمین اور زبیر بھائی آئے ہوئے تھے ان کے ساتھ گپیں لگاتا رہا۔"

"بہت فکر ہے مجھے اس کی، تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ تم سمجھایا کرو اسے۔"

"نہیں بھیا ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ پوری دلجمعی سے پڑھتا ہے اور ہمیں آپ کی خواہشات کا بہت احترام ہے ان شاء اللہ ہم دونوں کبھی بھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ امی، ابو کے بعد آپ ہی تو ہمارے لیے سب کچھ ہیں، سچ بھیا ہم خوش نصیب ہیں۔ کہ ہمیں آپ جیسا بھائی ملا ہے ورنہ تو نجانے کیا ہوتا ہمارے ساتھ۔" انیلا کی آواز بھرا گئی۔

"یہ رونا دھونا نہیں چلے گا' اس وقت۔ ایسا کرو یہ پروگرام صبح کے لیے رکھ لو۔" اس نے نیلو کا دھیان بٹانے کو ہنس کر کہا کہ وہ والدین کے ذکر پر آج بھی روز اول کی طرح جذباتی ہو جاتی تھی۔

ان کی وفات کو کئی برس ہو چکے تھے۔ روڈ ایکسیڈنٹ انہیں ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر گیا تھا۔ تب ضومران نے اپنا غم بھلا کر انہیں سینے سے لگا لیا تھا مگر والدین بھولنے والی ہستی تو نہیں ہوتے۔ اس کی اتنی توجہ کے باوجود انیلا انہیں یاد کرتے ہی رو پڑتی تھی۔ ایرج البتہ ضومران کی طرح مضبوط دل کا مالک تھا۔ حالانکہ نیلو سے دو برس چھوٹا تھا۔ ضومران دونوں سے بہت محبت کرتا تھا مگر طبیعت میں سختی کا عنصر فطری طور پر تھا اور وہ کچھ حاکمیت پسند بھی واقع ہوا تھا شاید اس کی وجہ یہ بھی رہی ہو کہ دونوں عمر میں اس سے کافی چھوٹے تھے۔ والدین کی زندگی میں بھی اس کی بات مانی جاتی تھی۔ اب بھی دونوں اس کے غصے سے گھبراتے تھے۔

کاروبار جمنے کے بعد بہت سے لوگ اس کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ ٹی وی جوائن کرنے کے بعد نوجوان خاص طور پر لڑکیاں اسے بہت پسند کرنے لگیں۔ اس بات نے اس میں خود پسندی کوٹ کوٹ کر بھر دی اور مغرور بھی بنا دیا۔ البتہ اس کے اثرات نیلو اور ایرج کی زندگی پر نہیں پڑے۔ وہ ان سے ہمیشہ سے کہیں زیادہ پیار کرتا تھا۔ نیلو کی آنکھ میں آنسو اسے بے چین کر دیتے تھے اور ایرج کی شوخ شریر ہنسی اس کی ساری تھکن اتار دیتی تھی۔

بھائی انہیں کس قدر عزیز رکھتا ہے' اس بات کا احساس انہیں بخوبی تھا۔ پھوپھو اور چچا کی رہائش بھی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساطِ دل	آمنہ ریاض	500/-
ذرد موسم	راحت جبیں	750/-
زندگی اِک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	600/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	300/-
عین سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
زخم کو ضد تھی مسیحائی سے	فوزیہ یاسمین	250/-
اماوس کا چاند	بشریٰ سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی	500/-
درد کے فاصلے	رضیہ جمیل	500/-
آج گگن پر چاند نہیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	نسیم سحر قریشی	300/-
تیری راہ میں رُل گئی	میمونہ خورشید علی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ -/30 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ -37 اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216361

قریب ہی تھی بلکہ پڑوس کا معاملہ تھا۔ ضومران گھر پر ہوتا تو کوئی نہ کوئی آتا جاتا ہی رہتا اور رونق لگی رہتی۔ نمو، پنکی، شرمین چچی اور پھوپھو دونوں کی کوشش تھی کہ ان کی بیٹی ضومران سے بیاہی جائے مگر اس کا کیا ارادہ ہے؟ وہ تینوں میں سے کسے پسند کرتا ہے۔ بہت کوشش کے باوجود انہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا رویہ تینوں کے ساتھ یکساں تھا۔

☆☆☆

''بھیا آج جلد آنے کی کوشش کیجیے گا۔ شرمین اپنی فرینڈز کے ساتھ آپ کا انتظار کریں گی۔'' صبح نیلو نے یاد دہانی کرائی۔

''اچھا میرا تو خیال تھا۔ اب نہیں آئیں گی۔ وہ ماہ جبینیں۔'' ضومران سے پہلے ایرج بول پڑا۔

''نہیں بھئی کل شرمین نے ان سے معذرت کر لی تھی اور آج آنے کے لیے کہا تھا اور اگر بھیا آج بھی نہ آ سکے تو؟ اسی لیے تو یاد دلا رہی ہوں انہیں۔''

''کوشش تو روز ہی ہوتی ہے گڑیا کہ سارے کام نبٹا کر جلد سے جلد گھر پہنچوں پھر بھی، کوشش کروں گا مگر وعدہ نہیں کر سکتا۔''

''اللہ کرے بھائی دیر سے آئیں، اتنی دیر میں اپنا سکہ جمانے کی کوشش کروں گا۔'' ضومران کے جانے کے بعد ایرج نے نیلو سے کہا۔

''ہونہہ کیا فائدہ تم سے تو وہ سب بڑی ہوں گی۔''

''ایک تو تم بڑی بری ہو، ذرا دیر کے لیے بھی خوش نہیں ہونے دیتیں۔''

''اچھا اب یہ فضول کی باتیں ختم کرو چپ کر کے ناشتا کرو سست الوجود کہیں کے۔''

''اے میرے اللہ یہ شام کب آئے گی۔'' ایرج کا لہجہ شرارت آمیز تھا۔ نیلو اسے اس کے حال پر چھوڑ کر باہر آ گئی۔

شام ہونے کی دیر تھی شرمین اپنی چار پانچ دوستوں کو لیے آ پہنچی۔ کچھ دیر بعد پنکی اور نمو بھی آ گئیں اور اب سب ضومران کی منتظر تھیں۔ آفس فون کیا تو معلوم ہوا ابھی نکلے ہیں۔ ''بس ابھی پہنچ جائیں گے۔'' شرمین نے سب کو تسلی دی۔

''ایرج بھی گھر پر نہیں ہے ورنہ ذرا رونق ہی رہتی۔'' نمو انتظار سے بور ہونے لگی۔ یوں بھی وہ ذرا آدم بیزار اپنے آپ میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ اگر محفلوں میں شریک ہوتی تو خود بحث و مباحثے میں شریک ہونے کے بجائے کونے میں بیٹھ کر سننا زیادہ پسند کرتی تھی۔

''ایرج صبح سے آپ لوگوں کا منتظر تھا۔ مگر اب جانے کدھر نکل گیا ہے۔'' نیلو نے شرمین کو بتایا۔

''بھیا صاحب آ گئے ہیں۔'' ملازمہ نے آ کر اطلاع دی۔

''آ گئے ہیں تو کدھر ہیں۔ ابھی پوچھتی ہوں۔ اتنا انتظار کیوں کروایا ہمیں؟'' شرمین اپنی فرینڈز کے سامنے ضومران پر کچھ زیادہ ہی حق جماتی تھی۔ اٹھ کر ضومران کے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اکیلی نہیں تھی وہ بھی ساتھ تھا۔

''نیلو! مجھے کچھ دیر بعد ایک پارٹی میں جانا ہے پلیز میرے کپڑے نکال دو۔''

اکثر جب اس کے مداح اس کے گرد جمع ہوتے وہ بہن بھائی کو کسی نہ کسی بہانے وہاں سے ہٹانا چاہتا۔ اس بات کو ایرج نے محسوس بھی کیا تھا۔ البتہ نیلو نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ بہن کے ہٹنے کی دیر تھی وہ فارم میں آ گیا۔ ایک خاص انداز ٹھہرا ٹھہرا سا مغرور لہجہ جس میں اپنی اہمیت کا احساس نمایاں تھا۔ شاید اپنا یہی روپ وہ نیلو اور ایرج سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

''ہیلو ہیلو کوئی گھر میں ہے یا سب کے سب مجھ غریب کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔'' ایرج کاریڈور میں کھڑا چلا رہا تھا۔

''ادا آہستہ کیوں مجھے بہرا کرنے لگے ہو۔'' اس کے قریب کھڑی ناصیہ نے گھبرا کر ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

''ایرج کہاں تھے اتنی دیر سے؟''

''ارے ناصیہ باجی آپ آئی ہیں۔'' نیلو، ایرج کو بھول کر ناصیہ سے لپٹ گئی۔

''یہ ایرج گھسیٹ لایا ہے مجھے۔''

''غلط، بالکل غلط۔ میں تو اتنے آرام سے بائیک پر بٹھا کر لایا ہوں، اب الزام لگا رہی ہیں مجھ پر۔ اندر آئیں نا آپ۔ آج تو ہمارے ہاں اور بھی بہت لوگ آئے ہوئے ہیں۔''

''اچھا آ گئیں وہ ذرا میں بھی تو دیدار کر لوں۔''

ان سے پہلے ایرج وہاں پہنچ گیا۔

''کہاں تھے ایرج تم؟'' پنکی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''خالہ جان کی طرف، اس لیے دیر ہو گئی۔''

''ہیلو ناصیہ!'' اسے دیکھتے ہی پنکی، شرمین اور نمو نے نعرہ لگایا اور ضومران عابدی کا دماغ چٹخنے لگا۔

''کیا سوچیں گی شرمین کی فرینڈز، یہ معمولی سے لباس میں ملبوس، شکل سے ہی متوسط طبقے کی لڑکی نظر آنے والی میری کزن ہے۔ ایرج کو علم بھی تھا ان لوگوں کی آمد کا پھر بھی اسے لے آیا ہے۔'' وہ غصہ کم کرنے کے لیے چائے پینے لگا۔

''السلام علیکم ضومران صاحب!'' پہل اس نے کی تو جواب دینا پڑا۔

''یہ ناصیہ طیب ہیں میری کزن۔'' نیلو نے تعارف کروایا۔

''بہت ذہین اور اچھی لڑکی ہیں۔'' یہ پنکی تھی۔

''کہاں رہتی ہیں آپ؟'' جانے یہ سوال کس نے کیا۔ ضومران کی جان پر ہی بن گئی۔

''گھر میں۔'' ایرج نے ناصیہ سے پہلے جواب دیا اور بات ہنسی میں دب گئی تب اس کا سانس بحال ہوا۔

''اچھا، اب آپ لوگ بیٹھیے میں ذرا ریسٹ کرنا چاہوں گا۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ضومران پلیز، ابھی کچھ دیر تو بیٹھو۔'' شرمین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

ناصیہ کے آنے سے گفتگو کا رخ دوسری جانب ہو گیا تھا جبکہ اس کی آمد سے پہلے تمام باتیں ضومران کی ذات کے حوالے سے ہی ہو رہی تھیں۔ خاص کر خاندان کی لڑکیاں پوری طرح ناصیہ کی جانب متوجہ تھیں اور یہ بات ضومران کے لیے حیرت کا باعث بھی تھی خاص کر پنکی اور شرمین جو اپنی سوسائٹی کی لڑکیوں میں بھی سو نقص نکالتی ہیں اسے کیونکر برداشت کر رہی تھیں بلکہ اتنی اپنائیت سے پیش آ رہی تھیں۔ شاید اس لیے کہ یہ میری خالہ زاد ہے۔ خود پسند طبیعت یہی رائے قائم کر سکی۔

ویسے یہ بات اس کے لیے کچھ بہتر تو نہ تھی۔ اگر ان تینوں سے ناصیہ کی دوستی نہ ہوتی تو نیلو اسے لے کر سٹنگ روم میں ہرگز نہ آتی اور ضومران کی عزت جو اس کے خیال میں مٹی ہو گئی تھی ضرور بچ جاتی۔

''ہاں میں خالہ جان سے اجازت لے کر آیا ہوں، اب کوئی مائی کا لال انہیں واپس چھوڑ کر نہیں آ سکتا۔'' ایرج نے اپنے انداز میں بتایا۔

''بس ٹھیک ہے، ہم دونوں ساری رات باتیں کریں گے۔'' نیلو نے پروگرام سیٹ کر ڈالا۔

''ایرج اٹھ جاؤ اور اسٹڈی کرو جا کر۔'' کچھ ہی فاصلے پر صوفہ چیئر میں دھنسے ضومران نے سخت لہجے میں کہا۔

''اچھا بھیا۔'' ایرج کا سارا جوش ماند پڑ گیا۔

پھر ایرج کے جانے سے پہلے وہ خود اٹھ کھڑا ہوا شاید ناصیہ سے ان دونوں کی اتنی دوستی اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ خود تو اس نے ایک مرتبہ بھی ناصیہ کو مخاطب نہیں کیا۔

''اوئے ہوئے، یہ تو بالکل والد صاحب بنتے جا رہے ہیں، اب مجھے بھائی کی کمی کا شدید احساس ہونے لگا ہے۔'' ایرج کی بڑبڑاہٹ صرف ناصیہ ہی نے سنی اور ہنسی روک نہ سکی۔ جس پر ضومران نے ایک نظر اسے دیکھا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی ایرج پھر بیٹھ گیا۔

''باجی یہ بتائیں، بھائی کی نئی سیریل کیسی لگی آپ کو۔''

''اچھی ہے۔'' ناصیہ نے مختصر جواب دیا۔

''اور بھیا کی اداکاری؟'' اس کے سوال پر ضومران جو اپنی ریسٹ واچ اٹھانے کے لیے ادھر آ رہا تھا، رک گیا۔

''اریج میں سمجھتی ہوں انسان وہی رول بہتر طور پر نبھا سکتا ہے جو اس کے مشاہدے میں ہو یا اس کے ماحول اور زندگی سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس سیریل میں تمہارے بھیا کا جس طبقے سے تعلق ہے' وہ اس سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس لیے پوری کوشش کے باوجود وہ غریب اور مسائل میں گھرے بے بس نوجوان کا کردار ڈیمانڈ کے مطابق نہیں کر پا رہے۔ شاید تمہارے ملنے والے اس کردار کو ان کی ایکٹنگ کو بے حد سراہیں۔ مگر میں چونکہ اس ماحول کی پروردہ ہوں جس سے اس کردار کا تعلق ہے' اس لیے کہہ سکتی ہوں کہ بہت سے نقائص موجود تھے۔''

''مثلاً؟'' انیلا نے پوچھا۔

''بالوں کا اسٹائل ہی لے لو' ان حالات سے دوچار لڑکے کو اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ اتنی توجہ سے بال سنوار سکے۔''

''یہ تو ڈائریکٹر کی غلطی ہے۔'' اریج نے بھائی کی طرف داری کی۔

''ہاں کہہ سکتے ہو مگر والدین سے باتیں کرنے کا انداز' اس سے وہ اپنائیت کہیں بھی نظر نہیں آئی جو ہمارے ہاں ہوتی ہے اور ایک دو مرتبہ جب انہیں چارپائی بچھاتے ہوئے اور ماں کے ساتھ ہاتھ بٹاتے دکھایا گیا تو جس انداز میں انہوں نے یہ سب کیا وہ کم از کم ہم لوگوں کو تو بہت مصنوعی لگا مگر تسلی رکھو' ہمارے جیسوں کی رائے ہمارے تک ہی محدود رہتی ہے۔ جو رائے کا حق رکھتے ہیں' انہوں نے ضرور سراہا ہوگا۔''

''لگتا ہے آپ پورے سیریل میں میرے بھائی کو ہی نوٹ کرتی رہی ہیں۔''

''ارے نہیں اریج! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو ہر شے کو ذرا گہری نظر سے دیکھنے کی عادی ہوں۔'' اور اس کے بعد موضوع بدل گیا۔

ضومران رسٹ واچ اٹھائے بغیر پلٹ آیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اندر جا کر اس لڑکی کو ایسی سناتا کہ آئندہ وہ اس کے متعلق ایسی رائے کا اظہار کرنے سے پہلے سو بار سوچتی مگر یہاں اس نے ہوش سے کام لیا ورنہ اندر جا کر اگر خود ہی اپنی تعریفیں شروع کر دیتا یا اس کی رائے پر بگڑتا تو یہ اپنی ہنسی اڑانے والی بات ہوتی کیونکہ ہر ناظر کریکٹر کو اپنی سوچ اور اپنی نظر سے دیکھتا ہے' زبردستی ہم کسی پر اپنے رائے مسلط نہیں کر سکتے۔

اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ غصے سے کھولتا رہا۔

''ہونہہ بڑی آئی ایکسپرٹ کہیں کی۔'' اسے چاروں طرف ناصیہ کی آواز سنائی دے رہی تھی پھر کچھ دیر کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے کے بعد گرنے کے انداز میں اپنے جہازی سائز بیڈ پر بیٹھ گیا۔ مزاج میں گرمی تھی اور اس وقت جبکہ وہ گھر میں آئی لڑکی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس تپش کا اثر اپنی ہی ذات پر ہونا یقینی تھا مگر بھلا ہو نیند کی مہربان دیوی کا جس نے اسے دن بھر کی الجھنوں سمیت اس کوفت سے بھی آزاد کر دیا۔

صبح ڈائننگ ٹیبل پر اس کی ملاقات نیلو اور ناصیہ سے نہ ہو سکی کہ وہ دونوں کچن میں گھسی ہوئی تھیں۔ ناصیہ قیمہ بھرے پراٹھے بنا رہی تھی اور انیلا بطور معاون مصروف تھی۔

''میں اتنا ہیوی ناشتا پسند نہیں کرتا' تم اچھی طرح جانتی ہو۔'' اس نے خشک لہجے میں نیلو سے کہا۔

''جی بھیا! تھوڑا ویٹ کریں' ابھی آپ کی پسند کے مطابق سب کچھ حاضر ہوگا۔'' وہ بے چاری اس کی پریشانی سمجھ نہ پائی۔

''باجی اس کی خوشبو نے میرا حال خراب کر دیا ہے۔ آخر کب تک تیار ہوں گے۔'' اریج للچائی ہوئی نظروں سے پراٹھے دیکھ رہا تھا۔

''تھوڑی دیر صبر کرو' ابھی دہی کا رائتہ بنے گا۔ ساتھ میں خوب چٹخارے دار چٹنی ہوگی' تب یہ تمہارے حضور پیش ہو سکیں گے۔''

''ہونہہ بے چاری' اس کی سوچ اس سے آگے بڑھ بھی کیسے سکتی ہے۔'' ضومران نے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجا کر دل میں سوچا۔

''ہیلو بھئی' کہاں ہیں سب لوگ۔'' زبیر' شرمین' پنکی اور نمو انہیں تلاش کرتے بالآخر کچن میں آ پہنچے۔

''تم لوگ اور اتنے سویرے۔'' ضومران نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہمیں ناصیہ اور نیلو نے انوائٹ کیا ہے۔'' زبیر نے بتاتے ہوئے پراٹھا ہاتھ میں اٹھا لیا لیکن گرم تھا' فوراً واپس رکھنا پڑا۔

''شرمین تم یہ پراٹھا کھاؤ گی؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا کہ وہ تو ہمیشہ اپنے بڑھتے وزن سے خائف رہتی تھی۔

''جی ہاں' میں کھاؤں گی۔ آخر اتنی چاہت سے ان سب نے بلایا ہے' زیادہ نہیں تھوڑا سا چکھ تو سکتی ہوں۔'' تب ضومران چپ ہو گیا اور سوچنے لگا۔ ''آخر یہ لڑکی ان سب کے لیے اتنی اہمیت کس طرح اختیار کر گئی ہے۔''

پھر جب وہ معمول کے مطابق ناشتے میں مصروف تھا' وہ سب اس کے گرد بیٹھے پراٹھوں کی دعوت اڑا رہے تھے۔ ہر نوالے کے ساتھ تعریف جاری تھی۔

''بھیا سچ بہت عمدہ ٹیسٹ ہے۔ آپ چکھ کر تو دیکھیں۔'' نیلو بار بار اصرار کر رہی تھی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ چاہنے کے باوجود انکار کرتا رہا۔ جیسے نہ کھا کر ناصیہ کو بہت نقصان پہنچانا چاہ رہا ہو' پھر سب کے کہنے پر اسے ماننا ہی پڑا جبکہ ناصیہ بالکل لاتعلق اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔

''اچھا باجی' خدا حافظ۔'' اریج سب سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں جا رہے ہو' آج تو اتوار ہے۔ چھٹی کا دن بھول تو نہیں رہے۔''

''نہیں' یاد ہے مجھے اور میں اپنے ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں۔ میرے واپس آنے تک آپ تو یقیناً جا چکی ہوں گی کہ بقول آپ کے خالہ جان کا آپ کے بغیر گزارا نہیں۔''

''یہ ابھی تو نہیں جا سکتی' جب بھی آتی ہے ہم سے وعدہ کرتی ہے کہ اگلی مرتبہ تم لوگوں کے ہاں بھی جاؤں گی مگر کبھی نہیں آتی۔ آج میں اسے اپنے ہاں لے جا رہی ہوں۔'' شرمین نے فیصلہ دے دیا اور وہ انکار بھی نہ کر سکی۔

شام کو جب ضومران کی گھر واپسی ہوئی تو خیال یہی تھا کہ اب تک وہ اپنے گھر جا چکی ہوگی۔ مگر اسے سامنے دیکھ کر کڑواہٹ سی گھل گئی پورے وجود میں۔

''گئیں نہیں محترمہ ابھی تک۔'' اس نے پنکی سے سرگوشی کی۔

''نہیں' وہ دراصل ممانی جان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔''

''انہوں نے روک لیا اسے۔''

''کیا یہ ڈاکٹر ہے؟'' اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

''نہیں' مگر کچھ لوگوں کی شخصیت میں ایسی بات ضرور ہوتی ہے کہ ان کے قریب رہ کر تسلی اور سکون کا احساس رہتا ہے۔ ممانی جان بھی ناصیہ کی موجودگی میں بہتر فیل کر رہی تھیں۔ دراصل اسے الفاظ کا استعمال آتا ہے' ریئلی یہ دوسروں کا حوصلہ بڑھانا جانتی ہے۔ حالات کو کنٹرول کرنے کی زبردست صلاحیت ہے اس میں۔''

''اچھا بس بہت ہو چکیں تعریفیں' ویسے ہوا کیا تھا چچی جان کو۔''

''وہی ان کی پرانی بیماریاں۔ شرمین گھبرا گئی تھی۔ بھاگی بھاگی ہماری طرف آئی' ڈاکٹر کو بھی نہیں بلایا اس نے تو۔''

''آپ دیکھ آتے جا کر چچی جان کو۔'' نیلو نے کہا۔

''بہت تھک گیا ہوں' سارا دن کی چخ چخ سے۔ اب جا کر بیماریوں کی لمبی کہانیاں نہیں سن سکتا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔ نیلو نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا۔

''نیلو تمہاری دوست آئی ہیں۔'' ناصیہ نے اطلاع دی تو نیلو گیٹ کی جانب چل دی۔ ''ادھر نہیں' اندر چلو میں نے بٹھا دیا ہے انہیں۔ کھانا لاؤں آپ کے لیے۔'' اب اس نے بگڑے بگڑے تیوروں والے ضومران سے پوچھا۔

''تھینکس ——— میرے گھر میں بہت

سے ملازم ہیں، کسی سے بھی منگوا لوں گا۔'' لہجہ بہت تلخ تھا۔

''جی شوق سے منگوائیے۔'' وہ حیران آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکی اور پلٹ کر لاؤنج سے باہر نکل گئی اور ضومران اپنے لہجے پر حیران اور کچھ پشیمان ہوتا ہوا بیڈ روم میں آ گیا۔

ناصیہ کو یہ احساس تو پہلے ہی تھا کہ اس کا یہ سگا خالہ زاد ان لوگوں سے میل ملاپ پسند نہیں کرتا۔ مگر یہ خیال تو کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے اس قدر الرجک ہے۔ آج اس کے لہجے پر اسے شدید حیرت ہوئی تھی اور بہت سوچنے پر بھی اپنی کوئی ایسی خطا یاد نہیں آ رہی تھی جو موڈ کے بگاڑ کا سبب کہی جا سکے۔ شاید ہماری غربت کی وجہ سے انہیں ہم سے میل جول پسند نہ ہو مگر ایرج اور نیلو کی وجہ سے مجبوراً مجھے یہاں برداشت کر رہے ہوں، اسے یہی ایک وجہ سمجھ میں آئی۔

''ٹھیک ہے اب میں یہاں نہیں آؤں گی۔ یہ سارا دن گھر سے باہر کاروباری الجھنوں میں گھرے رہتے ہیں۔ گھر آ کر بھی میری ذات کے باعث بے سکون رہیں تو یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی ہر شخص کی اپنی سوچ ہوتی ہے اگر وہ ہم لوگوں کو کسی وجہ سے پسند نہیں کرتے تو کیا ہوا ہمیں ان سے کیا لینا بس آئندہ مجھے ادھر نہیں آنا۔'' وہ نیک فطرت، کشادہ ذہن کی مالک لڑکی کوئی منفی سوچ ذہن میں نہ لا سکی۔

جب نیلو دوستوں سے فارغ ہو کر ادھر آئی تو وہ سیاہ چادر میں اپنا وجود چھپائے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''آج رات رک جاتیں آپ۔''

''نہیں نیلو میں تو پہلے ہی لیٹ ہو گئی ہوں امی منتظر ہوں گی۔''

''ہاں یہ بھی سچ ہے آنٹی بہت جلد پریشان ہو جاتی ہیں، اچھا ذرا رکیں میں ایرج سے کہتی ہوں چھوڑ آئے گا آپ کو۔''

''نہیں اسے تکلیف مت دو میں خود ہی چلی جاؤں گی۔''

''کمال کرتی ہیں آپ بھی اس میں بھلا تکلیف کی کیا بات ہے ابھی بلاتی ہوں اسے۔'' نیلو نے اس کی ایک نہیں سنی۔

☆☆☆

خدا نے انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی بنائی کہ وہ چاہتوں کے پھیلاؤ میں مقید ہو کر بھی اکتاتا نہیں۔ اپنی تعریف سننا اس کی کمزوری ہے، چاہے وہ سے لاکھ یہ کہا جائے میں اپنے اتنے سارے پرستاروں سے اکتا گیا ہوں میں چاہتا ہوں کوئی مجھے نہ پہچانے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ کسی محفل میں چوراہے پر ہوٹل میں، جہاں کسی کے لبوں پر اپنے نام کے ساتھ پسندیدگی کے جملے سنتا ہے غیر ارادی طور پر ایک نظر اس پر ضرور ڈالتا ہے اور اگر ان ڈھیروں ڈھیر چاہنے والوں کے درمیان کوئی ایسا مل جائے کہہ دے کہ نہیں میں تمہاری کسی ادا سے متاثر نہیں ہوں میرے نزدیک تمہاری کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہے تو پہلے پہل وجود میں شرارے سے بھڑک اٹھتے ہیں مگر اس کے بعد لاشعوری طور پر ایسی حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں جو اس کے خیال میں اس شخص کو متاثر کر سکیں ہیں۔

جب تمام لوگ اس کے کام کو یا کسی ادا کو سراہتے ہیں تو اس کی نگاہ اس کی جانب اٹھ جاتی ہے کہ شاید اس کے لب بھی وہی الفاظ ادا کریں۔ جو کان اب تک سن رہے ہیں۔ کچھ ایسی ہی بے ساختہ سی حرکت ضومران عابدی نے بھی کر ڈالی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی پرفارمنس پر تنقیدی نگاہ دوڑائی تھی۔

جب اگلی قسط ٹی وی پر چلی تو سب کے اصرار کے باوجود وہ ٹی۔ وی لاؤنج چھوڑ کر اپنے کمرے میں سب سے الگ بیٹھا سیریل دیکھ رہا تھا اور اپنے کردار پر خصوصاً گہری نظر تھی۔ اس کے بعد جب اس سیریل کی ریکارڈنگ ہوئی تو اس نے پہلے سے کہیں زیادہ محنت اور لگن سے اپنا کام مکمل کروایا۔ اور ناظرین نے محسوس کیا۔ کہ اب کے اداکاری پہلے سے کہیں زیادہ فطری تھی۔ سر کے گھنے الجھے بال واقعی پریشان حال

نوجوان کا تصور واضح کرتے تھے، ایک خاص طبقے سے ہٹ کر جو ہیرو کو ہر حال میں اسمارٹ اور چارمنگ دیکھنا چاہتا ہے۔ عام متوسط طبقے نے اس روز یہی کہا کہ ضومران عابدی اپنے ہی قبیلے کا لگتا ہے۔

☆☆☆

کئی روز سے ناصیہ ادھر نہیں آئی تھی ایرج اور نیلو نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا نہ ہی اس کی طرف گئے۔ یوں دو ماہ کے عرصے ہی میں وہ جو بظاہر بڑی عام سی لڑکی تھی۔ ضومران عابدی کے ذہن سے یوں اتر گئی جیسے سلیٹ پر چاک سے بنایا نقش ذرا سے پانی سے مٹ جاتا ہے۔ سیریل کی ریکارڈنگ مکمل ہونے پر وہ خود کو بہت آزاد محسوس کر رہا تھا۔ دوستوں کے ساتھ پروگرام سیٹ کیا اور پندرہ دن کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔

''اپنے بھیا بھی معلوم نہیں کیا ہیں۔'' ایرج جو اسے فرصت میں دیکھ کر خوش تھا کہ اب ہم سے بھی بات کرنے کا موقع ملے گا اس کے باہر جانے پر جھنجلا کر رہ گیا۔

''میں بھی منتظر تھی کب یہ سیریل ختم ہو اور بھیا ریکارڈنگ، انٹرویو اور دعوتوں کے چکر سے نکلیں اور ہم ان کی صورت دیکھ سکیں مگر خیر وہ بھی تھک گئے ہوں گے اسی لیے چینج کی خاطر باہر چلے گئے ہیں سیاحت کا بہانہ بنا کر۔'' نیلو نے بات کے اختتام پر پھر ضومران کی حمایت کر ڈالی۔

''میں بھی دوستوں کے ساتھ ایبٹ آباد جا رہا ہوں پورے دس روز کے لیے۔'' ایرج نے بڑے ڈرامائی انداز میں اچانک انکشاف کیا۔

''تم جا رہے ہو مجھے اکیلا یہاں چھوڑ کر۔'' وہ بے یقین ہونے کے باوجود چلا رہی تھی۔

''ہاں دراصل پڑھائی نے مجھے خشک مزاج بنا دیا ہے۔ سوچتا ہوں آب و ہوا کی تبدیلی مجھ پر اچھا اثر ڈالے گی تم اتنے دن نمو یا شرمین کی طرف رہ لینا۔''

''ہونہہ ان کی تو بھائی سے ہی دوستی ہے اور تمہیں بالکل کہیں جانے کی ضرورت نہیں آرام سے ٹکے رہو ادھر ہی۔''

''ہاں باجی ڈال لیں رعب سب کو میں ہی ملا ہوں وہ چلے گئے تو حمایت ہو رہی ہے اور میں نے کہہ دیا تو موڈ بگڑنے لگا۔'' اس نے جتا دیا۔

''کیا واقعی جانا چاہتے ہو۔'' اس نے پوچھا۔

''تم کہتی ہو تو نہیں جاتا۔'' اس نے ساری بات اس پر ڈال دی۔

''ہوں خوب جانتی ہوں بھلا میرے کہنے سے رکنے والے ہو۔'' تو وہ بھی ہنس پڑا اور ایک مرتبہ پھر ضومران کی باتیں ہونے لگیں۔

''کیا انہیں تفریح کی ضرورت نہیں ساری زندگی ہمارے لیے قربان کر دیں۔'' اس کی کسی بات پر نیلو ناراض ہو کر کہنے لگی۔

''نہیں میں نے یہ کب کہا ایک تو تم ہر بات کو غلط سائیڈ پر لے جاتی ہو اور یہ مت سمجھا کرو کہ وہ صرف تمہارے پیارے بھائی ہیں، میں بھی ان کا کچھ لگتا ہوں اور چاہتا ہوں ان کو۔''

''پھر ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔''

''ظاہر ہے جس سے محبت ہوتی ہے اس کی توجہ ہم چاہتے ہیں ہر ایرے غیرے کی بات پر کون دل جلاتا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' نیلو نے ہمیشہ کی طرح بات مان لی۔

''نیلو! صبح ناصیہ باجی کو اپنے ہاں نہ لے آئیں کچھ رونق ہی رہے گی تم تو نری بور ہو۔''

''ہاں ناصیہ باجی ایک تو خود زندہ دل ہیں۔ دوسرے وہ یہاں ہوں تو شرمین، پنکی وغیرہ بھی ادھر آ جایا کریں گی۔'' دونوں تو بس صبح ہونے کے انتظار میں تھے۔

ناشتے کے فوراً بعد وہ اس کے ہاں پہنچ گئے۔ وہاں بھی ابھی صبح کے کام نبٹائے جا رہے تھے۔ ناصیہ برتن دھو رہی تھی، خالہ اسکول جانے والے بچوں کی چھوٹی موٹی چیزیں سنبھال رہی تھیں۔

”ارے خیریت اتنے سویرے۔“ خالہ پریشان ہوگئیں۔

”گھبرائیے نہیں ہم ناشتہ کر کے آئے ہیں اور دوپہر کا کھانا بھی اپنے ہاں جا کر ہی کھائیں گے۔“ ایرج نے شرارت سے کہتے ہوئے انہیں شانوں سے پکڑ کر برآمدے میں بچھے تخت پر بٹھا دیا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا! یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے۔ میں نے اس لیے تھوڑی پوچھا تھا۔“ خالہ بات سمجھ کر بھی وضاحت کرگئیں۔

ناصیہ نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار تو ضرور کیا۔ مگر حقیقتاً وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ لوگ بڑے بھائی کی رضا کے بغیر یہاں آئیں۔ مگر ظاہر نہیں کیا۔ کام چھوڑ کر ان کے لیے چائے بنانے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ تکلف رہنے دیں باجی! ہم تو آپ کو لینے آئے ہیں۔“ نیلو اس کے پیچھے چھوٹے سے باورچی خانے میں آ گئی۔

”لینے آئے ہو مگر میں تو نہیں جا سکتی۔“ وہ کچھ گھبرا کر بولی۔

”ہاں میں تو پہلے ہی نیلو کو سمجھا رہا تھا مصروف شخصیت ہیں، آئے دن جلسے اٹینڈ کرتی ہیں، فیتے کاٹتی ہیں، ہمارے ساتھ کیسے جا سکتی ہیں؟“ ایرج باورچی خانے کی دہلیز پر کھڑا کہہ رہا تھا۔

”جلسے اٹینڈ کرنے کے علاوہ اور بھی بہت کام ہوتے ہیں، امی کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ سارا کام مجھ پر ہے۔ اور کچھ دنوں بعد میری پھوپھو کے بیٹے کی شادی ہے۔ بہت کام ہے ان کے ہاں۔ شام کو مجھے ادھر بھی جانا پڑتا ہے۔“ خالہ کمرے میں تھیں اور ناصیہ جلدی جلدی کام گنوا رہی تھی۔ مبادا ماں آ جائے اور بھیج دے ان کے ساتھ اس کے ہاں۔ جس نے اسے کزن تو دور کی بات بہن بھائی کی دوست کی حیثیت بھی نہ دی تھی۔

”ٹھیک ہے باجی! پھر تو آپ کا جانا واقعی مشکل ہے۔“ نیلو نے ناراض ہونا یا بدگمان ہونا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ خلافِ توقع ایرج بھی خاموش رہا۔

ناصیہ نے انہیں دوپہر کے کھانے پر روک لیا۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ چھوٹے سے باورچی خانے میں گھسے رہے۔ خالہ نے بہت کہا ادھر کمرے میں آ کر بیٹھ جاؤ۔ مگر ہر مرتبہ اچھا جی کہنے کے باوجود نہیں اٹھے ناصیہ کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔

”جس روز بھیا واپس آئیں گے ہم بڑی سی پارٹی دیں گے آپ ضرور آئیے گا۔“ نیلو نے پرخلوص لہجے میں دعوت دی۔

”کب آ رہے ہیں ضومران؟“

”اس ماہ کی اٹھائیس کو۔ ہم انتیس کو پارٹی رکھیں گے۔“

”اس روز تو شادی ہے میرے پھوپھی زاد کی۔“ اسے کوئی بہانہ نہیں بنانا پڑا کہ یہ سچ تھا۔

”اوہ تو ہم ایک دو روز آگے رکھ لیں گے۔“

”ارے نہیں تم کہاں تک لیٹ کرو گے۔ تمہیں تو علم ہی ہے شادی کے بعد کتنی رسمیں ہوتی ہیں، میری پھوپھو کی کوئی بیٹی تو ہے نہیں۔ تمام کام مجھے سنبھالنا ہوگا۔ تم میری وجہ سے اپنا پروگرام خراب مت کرو۔“ اس نے خوب صورت طریقے سے انہیں ٹال دیا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی اسے دیکھ کر ضومران کا موڈ بگڑ جائے۔

ضومران واپسی پر ان کے لیے ڈھیروں ڈھیر تحفے لے کے آیا۔ ثرمین، پنکی نے اپنی پسند کی کچھ چیزیں ان سے پوچھے بغیر ہی لے لیں۔ تو ایرج کو سخت غصہ آیا۔ کہہ دیا بھائی سے کہ آپ کے جانے کے بعد تو یہ عید کا چاند ہی ہو گئی تھیں ادھر آپ کی آمد ہوئی اور ادھر یہ رشتے دار بھی آ ٹپکے ہیں۔

”تم اب بتا رہے ہو جب وہ سب کچھ سمیٹ کر چلتی بنی ہیں۔“

”جانے دیں بھیا آخر کو رشتے دار ہیں ہمارے، اتنی معمولی باتوں کو کیا دل میں رکھنا۔“ نیلو بھیا کے مزاج سے واقف بھی فوراً کہنے لگی۔ تب ایرج نے بھی سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

”بھیا اپنے لیے بھی کچھ لیا ہے یا صرف ہمارے ہی لیے شاپنگ کرتے رہے۔“

”لیا تو ہے بہنا مگر سچی بات تو یہ ہے ہر اچھی شے دیکھ کر یہی دل کیا ایرج یا نیلو کے لیے لے لوں۔“ اس نے اپنے دائیں بائیں بیٹھے بھائی بہن کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”ہم نے بہت مس کیا آپ کو، اور نیلو تو آپ کی آمد پر دعوتِ عام کا پروگرام بنائے بیٹھی ہے جیسے کبھی اگلے وقتوں میں حاکمِ وقت شہزادے کے میدانِ جنگ سے کامیاب لوٹنے پر دیتے تھے۔“

”گڈ پھر کب ہے یہ دعوتِ عام۔“ ضومران نے ہنس کر بہن سے پوچھا۔

”جب آپ کہیں بھیا۔“

”میرا تو خیال ہے یہ فنکشن وغیرہ کا چکر رہنے دو بس ہم تینوں پورا دن پکنک کے لیے رکھ لیں تو کیسا ہے۔“

”آئیڈیا برا نہیں۔“ ایرج نے جھٹ کہا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے بلکہ بہت اچھا ہے۔ اس طرح سارا وقت ہم ہی آپ کے گرد رہیں گے لوگوں کا جمگھٹا نہیں ہوگا۔“

”کہاں جائیں گے؟“ ایرج نے پوچھا۔

”یہ بعد میں سیٹ کر لیں گے فی الحال یہ بکھری اشیاء سمیٹو۔“ ضومران نے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ اور ہاں تم دونوں یہ فیصلہ بھی کر لو کہ کیا کیا اپنے لیے رکھنا ہے کچھ نہ کچھ مجھے دوستوں کی نذر بھی کرنا ہے نا۔“

”یہ کلر ناصیہ باجی پر کس قدر سوٹ کرے گا ہے نا۔“ نیلو سویٹر کا جائزہ لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”بھئی صاف صاف کیوں نہیں کہتیں انہیں دینا چاہتی ہو۔“ ایرج نے سویٹر اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

”انہیں بطور گفٹ دے دوں بھیا؟“

”بھئی مرضی ہے تمہاری۔“ اس نے بے نیازی برتی۔

”ٹھیک ہے یہ تو ان کے نام ہوا میں کل ہی انہیں دے آؤں گی۔“

”ہاں مگر سنو اپنی طرف سے دینا میرا نام نہ آئے۔“ ضومران یہ کہہ کر ٹی وی لاؤنج کی طرف نیوز دیکھنے چل دیا۔

”او گاڈ ان میں تو اٹھارہ سو اکیس والی شرافت کے جراثیم موجود ہیں شاید، کیسے کہا میرا نام نہ آئے۔“ ایرج کی ہنسی نہیں تھم رہی تھی۔

”اچھا تو اس میں اتنا کھلکھلانے کی کیا بات ہے۔“ نیلو نے بظاہر برا مان کر کہا۔

”ہاں یار واقعی مقام تو رونے کا ہے نا کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور ہمارے بھائی محترم نام آئے یا نہ آئے کے چکر میں ہیں۔“ اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کب چلیں، ناصیہ باجی کی طرف یہ دینے کے لیے۔“

”میں تو کہتا ہوں رہنے ہی دو ایسے ہی کبھی دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ تحفہ میرا بھائی سمندر پار سے لایا تھا تو مشرق کا معصوم، باحیا لڑکا بدنام ہو جائے گا۔“

”اوہو تم تو بات پکڑ کر ہی بیٹھ جاتے ہو مت جانا۔ میں خود ہی دے آؤں گی۔“

☆☆☆

اور پھر نیلو نے ناصیہ کو گفٹ دینے کے بعد یہ بھی بتا دیا کہ بھیا لائے ہیں۔ مجھے آپ کے لیے اچھا لگا۔ اس لیے لے آئی۔ ناصیہ یہ سن کر لینا نہیں چاہ رہی تھی مگر نیلو کے اصرار پر انکار نہ کر سکی، الماری میں رکھ دیا۔ اس نیت کے ساتھ کہ استعمال میں نہیں لائے گی۔ حالانکہ اس کی ضومران سے کوئی دشمنی تو نہ تھی، مگر اس کے رویے نے زندگی میں پہلی بار ناصیہ کو اپنی کم مائیگی کا احساس دلایا تھا، اور یہ بات اس کے لیے غیر اہم نہ تھی۔

”اور ہاں یاد آیا یہ کارڈ دیا ہے ثرمین نے اس کی برتھ ڈے ہے کہہ رہی تھی میں خود بھی آؤں گی۔“

”اسے مبارک باد دینا میری طرف سے اور معذرت کر لینا میں شاید نہ آ سکوں۔“

''آنا تو ہوگا آپ کو، اگر نہ آئیں تو میں ایرج کے ساتھ آدھمکوں گی پھر یہ تو آپ جانتی ہیں وہ اپنی بات منوا کر رہتا ہے۔ زبردستی بھی کرلے گا بہتر یہی ہے میری بات ہی مان لیں۔'' نیلو نے تو باقاعدہ دھمکی دے ڈالی۔ تب اس نے کہہ دیا کوشش تو ہر ممکن کروں گی آنے کی۔

''آپ ٹال رہی ہیں۔'' تب اس نے وعدہ کر ہی لیا۔

مگر نیلو کے جانے کے بعد وہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ مہینے کا آخر ہے گھر کا خرچ۔ بمشکل پورا ہو رہا ہے۔ ایسے میں شرمین کے شایان شان تحفہ خریدے تو کس طرح خریدے یہی کچھ سوچ کر وہ نیلو سے انکار کر رہی تھی مگر اپنی مجبوری نہ بتا سکی تھی، اور اب جو نیلو، ایرج کے ساتھ عین وقت پر آدھمکی تو انکار ممکن ہی نہ ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا یہ الجھن کیسے حل کرے۔ پھر ماں سے کہہ بیٹھی۔

''گھبراتی کیوں ہو، میں کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گی۔'' فرحت نے بیٹی کو دلاسہ دیا۔

''مگر امی کیسے سب حالات تو میرے سامنے ہیں۔''

''یہ میرا دردِ سر ہے بیٹی فکر نہ کرو شرمین آئے تو انکار مت کرنا۔'' اور اس نے ماں کی ہدایت پر عمل کیا۔ مگر شاید نیلو اور ایرج کو یقین نہیں تھا جو خود گاڑی لیے آپہنچے۔

جب وہ شرمین کے ہاں پہنچی تو وہاں رنگ و نور کا طوفان امڈا نظر آیا، وسیع و عریض لان میں قہقہے ابل رہے تھے۔ مرد و زن ہر فکر سے آزاد خوش گپیوں میں مشغول نظر آتے تھے۔ لحظہ بھر کو قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ بھلا ایسے ماحول کی عادی کہاں تھی، بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی گیٹ سے ذرا فاصلے پر تماشا دیکھ رہی تھی۔

''باجی اندر چل کر چادر اتاریں اور لائیٹ میک اپ کرلیں۔'' نیلو نے ہاتھ پکڑ کر چونکا دیا۔

''نہیں نیلو! میک اپ تو رہنے دو میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''

''مجھے پتا تھا۔ آپ انکار کریں گی، مگر یہ ضروری ہے گزارہ نہیں اس کے بغیر بس تھوڑا کروالیں، ویسے بھی رات کو ڈارک میک اپ چلتا ہے۔ آپ تو سادہ ہی لگیں گی۔'' وہ کچھ کنفیوز ہو رہی تھی، پھر کچھ نہیں بولی۔ اس کے ساتھ چلتی گئی۔

پھر وہ مکمل طور پر نیلو کے رحم و کرم پر تھی۔ یعنی اس کے سامنے بیٹھی میک اپ کروا رہی تھی۔

''اب دیکھیں اپنا آپ۔'' نیلو نے اسے قدِ آدم آئینے کے سامنے لا کھڑا کیا تو وہ خود بھی چونک گئی۔ بے شک بہت نکھار آگیا تھا۔ اس کے نمکین روپ پر، دبے سہمے طبقے سے متعلق ہونے کے باوجود وہ خاصی پُراعتماد تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ اب گھبراہٹ پر قابو پا کر مہمانوں میں آگئی تھی۔ وہ انیلا کی چند دوستوں کے پاس کھڑی تھی۔ جیسے ہی محفل میں وہ داخل ہوا سب لوگ اپنی باتیں بھول کر اس کی جانب اٹھ چکے تھے۔ ناصیہ نے اتنے مجمعے میں دیکھا ضرور مگر قدم مضبوطی سے جمائے اپنی جگہ پر کھڑی رہی، اسے کمپنی دینے والی تمام لڑکیاں اب ضومران عابدی کے گرد کھڑی تھیں، یہ سب چند منٹ کے لیے ہوا مگر اسے لگا جیسے وہ کئی گھنٹوں سے بھری محفل میں اکیلی کھڑی ہے اور ضومران عابدی کی سرخی مائل براؤن مسحور کن آنکھیں اس کی حیثیت اور تنہائی پر ہنس رہی ہیں۔ یہ فقط ناصیہ کا احساس تھا۔

دوسری جانب جب ضومران عابدی کی نگاہ غیر ارادی طور پر اس کی جانب اٹھ گئی تو اسے یہاں پا کر اس کی آنکھوں میں صرف اور صرف حیرت تھی۔

''اسے کس نے بلایا ہے۔'' وہ ہولے سے شرمین سے پوچھ رہا تھا۔

''ممی نے، ہم سے زیادہ ان کی دوستی ہے ناصیہ سے۔'' اس نے ایک ادا سے پیشانی پر بکھرے بالوں کو جھٹک کر کہا۔

''تھینکس گاڈ۔ آج ڈریس تو بہتر ہی ہے اس کا۔'' ضومران نے ذرا تفصیلی نظر ڈال کر دل میں کہا کہ یہ اندیشہ تو تھا نا کہ جانے کب نیلو اپنی چہیتی کزن کو

مہمانوں سے متعارف کرانے لگے۔

ناصیہ کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ گیارہ بجے تک پارٹی اختتام کو پہنچ جائے گی مگر یہاں پر رات کے آدھا سفر طے کرنے تک ایسے کوئی آثار نہیں تھے اور اسے گھر والوں کی پریشانی کا خیال ستا رہا تھا۔ دل میں پارٹی کے جلد از جلد اختتام کی دعا مانگ رہی تھی۔ پیشہ ور سنگرز کے بعد شوقیہ گلوکاروں کو دعوت دی گئی۔ جن میں اکثریت نے بہت بور کیا۔

''ناصیہ تم بھی کچھ سناؤ۔'' نمو نے فرمائش کر دی۔

''مجھے بھلا گانا کہاں آتا ہے۔'' اس نے پیچھا چھڑانے کو کہہ دیا۔

''مجھ سے بہانے تو مت بناؤ تم، میں اچھی طرح جانتی ہوں تم بہت اچھا گاتی ہو۔'' پھر تو نیلو، شرمین کے علاوہ یہاں واقف بننے والی لڑکیاں بھی اسے اکسانے لگیں تو چند اور لوگ بھی متوجہ ہو گئے اور اس کے بار بار انکار پر دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگے۔

''کمال ہے مس! آپ ضومران عابدی جیسے باکمال آرٹسٹ کی کزن ہونے کے باوجود اس طرح بی ہیو کر رہی ہیں۔'' جانے یہ کس نے کہا تھا ناصیہ طیب کی نگاہیں آواز کے تعاقب میں اٹھنے کے بجائے ذرا فاصلے پر موجود ضومران عابدی کے پُرغرور چہرے کی جانب اٹھ گئیں۔ آثار سے ظاہر تھا یہ بات کچھ پسند نہیں آئی جلد ہی تصدیق بھی ہوگئی۔

''کزن ہونے سے کیا ہوتا ہے صاحب! یہ تو اپنے اپنے کانفیڈنس اور پرسنالٹی کی بات ہوتی ہے۔'' پھر وہ نیلو سے مخاطب ہوا۔ ''چھوڑو نیلو کیوں تنگ کر رہی ہو بے چاری کو تمہارے کہنے پر مان بھی جائیں تو اتنے لوگوں میں آواز کہاں نکلے گی ان کی۔'' نیلو تو کیا ناصیہ طیب کے علاوہ کوئی بھی لہجے میں چھپا طنز نہ جان سکا۔

''ناصیہ باجی اب اٹھ بھی جائیں چلیں میں آپ کا ساتھ دیتا ہوں۔'' ایرج نے اس کے غصے اور بے بسی سے معمور چہرے پر نگاہ کیے بغیر کیا۔

''نہیں میں اکیلی ہی ٹھیک ہوں۔'' کہاں تو وہ مان ہی نہ رہی تھی اور اب بہت اعتماد سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اتنی دیر انکار نے اہمیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ سب ہی اس کی آواز سننے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص

اسے ہوٹ کرنے کے ارادے سے کھڑا ضومران عابدی اب واہ واہ کے شور میں خاموش تھا۔

پلٹ سکوں میں نہ آگے ہی بڑھ سکوں جس پر
مجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اک شخص
محبتیں بھی عجب اس کی نفرتیں بھی عجب
مری طرح کا ہی مجھ میں سما گیا اک شخص
کھلا یہ راز کہ آئینہ خانہ ہے دنیا
اور اس میں مجھ کو تماشا بنا گیا اک شخص

غزل کے اختتام پر دیر تک تالیاں گونجتی رہیں۔ اسی شور میں وہ اپنی سیٹ پر آبیٹھی جانتی تھی۔ ضومران ذرا فاصلے پر اس کے بائیں جانب موجود ہے مگر اس کی جانب دیکھ کر وہ اسے جتانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بات اس کی فطرت کے خلاف تھی۔ یہ درست تھا کہ ضومران کے ایک فقرے نے اس کی نہ کو ہاں میں بدل دیا تھا اور وہ جو ایک بول ادا کرنے پر گھبرا رہی تھی اب پوری غزل سنا چکی تھی مگر اب داد و تحسین سمیٹ کر گردن اکڑا لینا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ جان ہی نہ سکی اسے سیٹ کی جانب آتے دیکھ کر ضومران نے یہ سوچ کر کہ اب وہ اس کی جانب ضرور دیکھے گی رخ موڑ لیا تھا اور اپنی ایک ایسی فین سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ جسے وہ آغاز تقریب سے اگنور کرتا آیا تھا۔

''ایرج پلیز مجھے گھر چھوڑ آؤ۔'' تقریب کے خاتمے پر باوجود اس کے کہ رات آدھا سفر طے کر چکی تھی، وہ گھر جانا چاہ رہی تھی۔

''کچھ ٹائم کا بھی اندازہ ہے آپ کو۔''

''ہاں مگر امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

بی اور امی دیر مزے سے بیٹھے رہنے کے بعد اب آپ کو ان کا خیال ستانے لگا ہے۔ اب تو بالکل نہیں جاسکتیں آپ......"

"دیکھو پلیز ایرج تم تو امی کی جلد گھبرا جانے والی طبیعت سے واقف ہو۔" وہ حقیقت میں ضومران کے ہاں جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں خالہ جان سے اجازت لے آیا تھا اور اب آپ کو یہ رات تو ہر صورت میں ہمارے غریب خانے پر بسر کرنا ہوگی۔"

"مگر دیکھونا۔" یہ بہانہ بے کار گیا تو وہ کچھ اور کہنے لگی۔

"اگر مگر چھوڑیں چلیں ہمارے ساتھ۔" ایرج نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں۔ باجی پہلے بھی تو ہمارے ہاں رہتی رہی ہیں آپ۔" نیلو اس کی ہچکچاہٹ پر حیران تھی۔

"نیلو میں تو گھر جا رہا ہوں تم لوگ آتے رہنا۔" قریب سے گزرتے ہوئے ضومران عابدی نے بے نیازی سے کہا۔

"رکیں تو بھائی جان ہم بھی آ رہے ہیں۔" ایرج نے پکارا۔

"اچھا پھر جلدی کرو۔" وہ برا سا منہ بنا کر رک گیا۔

"چلیں نا باجی۔" اور اب کے وہ انکار نہ کرسکی۔

شرمین کے گیٹ سے ان کے گیٹ کا فاصلہ چند گز کا تھا۔ یہ فاصلہ ایرج نے اور نیلو نے اس کی آواز کی تعریف کرتے ہوئے کاٹا جب کہ ضومران ان سے چند قدم آگے ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں دیے یوں چلا جا رہا تھا۔ جیسے اس کا ان لوگوں سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے پھر کچھ سوچ کر اس نے رفتار سست کردی اور ان کے برابر آ گیا۔

"اوہ گاڈ......وہ بلیو ساڑھی والی تو جان کو آ گئی تھی۔"

"کون بلیو ساڑھی والی؟" ضومران کے کہنے پر نیلو پوچھنے لگی۔

"ارے وہی مشہور صنعت کار ثناء اللہ کی دختر نیک اختر ویسے بے حد سوشل لڑکی ہے۔ محفلوں کی جان سمجھی جاتی ہے اور اپنی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہے اسے مگر میرے ساتھ اس کا رویہ خاصا دوستانہ ہے۔" ضومران جوان دونوں سے کبھی بھی اس طرح کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ بلکہ بہن بھائی کے ساتھ لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے بھی محتاط رہتا تھا، صرف اس لیے کہ وہ ناصیہ کی اتنی زیادہ تعریف سے باز رہیں، بولے چلا جا رہا تھا۔ بظاہر جس لڑکی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا، اپنی کزن بتاتے ہوئے کترا تا تھا۔ اسے سنانے کے لیے وہ ایک صنعت کار کی بیٹی کا ذکر لے آیا تھا ورنہ دونوں کا دھیان بٹانے کو اور بھی بہت سی باتیں کی جاسکتی تھیں، مگر وہ جانے کیوں اس کم مایہ سی لڑکی پر اپنی اہمیت واضح کرنا چاہتا تھا۔

ناصیہ بالکل خاموش ان کے ساتھ چلی آ رہی تھی مگر چپ رہنے سے کان بند نہیں ہو جاتے ضومران جانتا تھا وہ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ سن رہی ہے اور یقیناً امپریس ہوئے بنا نہیں رہ سکتی۔ ناصیہ پر تو خیر ایسی بے تکی باتوں کا کیا اثر ہوتا، البتہ ضومران کے بھائی بہن خاصے حیران تھے اس کی گفتگو پر، بلکہ انہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر خاموش تھے۔

☆☆☆

اس روز کے بعد کافی دن تک نہ تو ناصیہ ادھر گئی نہ ہی ان کی طرف سے کوئی ادھر جاسکا۔ شرمین اور زبیر اپنے ماموں کے ہاں کوئٹہ چلے گئے تھے اور ان کی ممی آج کل بیمار تھیں، یوں ایرج اور نیلو کا پڑھائی کے بعد سارا فالتو وقت ادھر ہی گزرتا۔ خاص طور پر نیلو کا۔ پنکی نے جانے کیوں آنا جانا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا، اور نمو خود میں مگن رہنے والی مغرور قسم کی شے تھی۔ ایرج نے ایک دو مرتبہ اس سے پنکی کے متعلق پوچھا

...ی اور ہمیشہ یہی جواب ملا کہ ذرا کام سے گئی ہے۔ ...اس بات کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ شام کو گیم سے ...اس پر اس نے کئی مرتبہ پنکی کو بنک سک سے درست ...کہیں جاتے دیکھا تھا۔

ناصیہ کے ہاں درس تھا۔ اس نے ان سب ...کو مدعو کیا تھا۔ مگر شرمین کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ پنکی کی والدہ ایک اور تقریب میں مدعو تھیں اور نمو، پنکی کی اپنی مصروفیات تھیں۔ نیلو کے علاوہ کوئی ...جا سکا۔ نیلو کو ایرج کی منتیں کرنے کے بعد وہاں جانا ...نصیب ہوا۔

"پلیز، اب واپسی پر بھی لے آنا......"

"کوئی نہیں مجھے اپنے دوست کے ہاں ولیمہ ...اٹینڈ کرنے جانا ہے تم خود ہی آتی رہنا۔" اس نے ...شانے اچکائے۔

"میں کس کے ساتھ آؤں گی بے وقوف۔" وہ ...جھلا کر بولی۔

"یہ میرا مسئلہ نہیں۔" اس نے اس کے غصے کا ...مزا لیتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نہ آئے......تو گھر آ کر میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔"

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"اچھا بدتمیز پھر بھیا کو فون کر دینا وہ لینے آ جائیں گے۔"

"اگر ٹائم ملا تو کردوں گا تم خالہ جان کو سلام کہنا۔" اس نے بائیک آگے بڑھا دی تو وہ اسے کوستی ہوئی اندر آ گئی۔

گھر میں داخل ہوئی تو لگا ایک دنیا کی لڑکیاں یہاں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ اس کے ماحول سے بہت مختلف ماحول میں رہنے والی لڑکیاں جو نیلو کو بہت سادہ لگ رہی تھیں، اسے دلچسپی اور تجسس سے دیکھ رہی تھیں۔ ناصیہ نے ان کا تعارف اس سے کروایا۔ شرمین وغیرہ کے متعلق پوچھا اور نیلو نے سب کچھ دہرا دیا۔

"میری طرف سے آنٹی کا حال پوچھنا۔"

"آپ خود آنا۔ آپ پہلے ہی اتنے روز آئیں نہیں میں تو خود آ جاتی اگر آنٹی بیمار نہ ہوتیں۔"

"یہ بتاؤ ایرج اندر کیوں نہیں آیا۔" اس نے بات پلٹ دی۔ تو وہ بھی جھٹ اسے ایرج کی حماقتوں کی داستانیں سنانے لگی۔

درس کی مقدس محفل کے اختتام پر خواتین تو کمرے میں ہی بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ لڑکیاں برآمدے اور صحن میں لگے آم کے پیڑ تلے آ بیٹھیں۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ ناصیہ نے کھولا تو سامنے ضومران کو دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی۔

"نیلو کو بلا دو۔" کی رنگ انگلی میں گھماتا ہوا روکھے لہجے میں مخاطب تھا۔

"آپ اندر تو آئیں۔" وہ اخلاقیات نہیں بھولی تھی۔ راستہ چھوڑ کر وہ بیٹھک کی جانب بڑھی تو اسے بھی اندر آنا پڑا۔ کہ گرمی بلا کی تھی زیادہ دیر تپتے سورج تلے کھڑے رہنا ممکن نہ تھا۔ صحن میں کھڑی لڑکیوں نے اسے دیکھ کر آپس میں کچھ کہا جسے وہ سن تو نہ سکا۔ البتہ یہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ اس کی آمد پر حیران ہیں۔ ناصیہ اسے بٹھا کر امی اور نیلو کو اطلاع دینے چلی گئی۔ ضومران نے پرانے سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کمرے پر نگاہ ڈالی پھر گرمی کا اثر ذرا کم کرنے کو شرٹ کے کھلے بٹنوں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا۔ ناصیہ پنکھا آن کر کے گئی تھی مگر پرانا پنکھا ہوا سے زیادہ آواز دے رہا تھا۔

خالہ نے اندر آتے ہی اس کی بلائیں لیں پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور حال احوال دریافت کرنے لگیں وہ بھی معقولیت سے جواب دیتا رہا جبکہ دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ جلدی سے نیلو آ جائے اور اس جہنم سے جان چھوٹے۔

"اچھا بیٹے میں ذرا اندر ہو آؤں۔ بہت سی خواتین ابھی بیٹھی ہیں۔"

"جی ضرور آنٹی......" وہ کون سا ان کی محبت میں فنا ہو رہا تھا۔ جھٹ کہہ دیا، اور نیلو کا انتظار کرنے لگا۔ مگر اس کے بجائے ناصیہ آ گئی ٹرے اٹھائے

ہوئے۔ گلاس اس کی جانب بڑھایا جسے اس نے منہ سے کچھ کہے بغیر تھام لیا۔

”اے ناصیہ یہ جو، ابھی ابھی اندر گیا ہے یہ اداکار ضومیران عابدی ہے نا۔“ کوئی بلند آواز میں پوچھ رہی تھی۔ (یوں بھی چھوٹے سے آنگن میں ہونے والی تمام گفتگو اس تک پہنچ رہی تھی۔

”ہوں وہی ہے۔“ اس نے ناصیہ کا نارمل لہجہ محسوس کیا۔

”یہاں کیا کرنے آیا ہے۔“

”تمہارا کیا لگتا ہے؟ پہلے تو یہاں کبھی نہیں آیا؟“ بڑھ چڑھ کر سوال ہو رہے تھے۔

”نیلو کا بھائی ہے۔ اسے لینے آیا ہے۔“ ناصیہ طیب کا یہ کہنا گرم موسم کو مزید تپا گیا یعنی اس لڑکی کو مجھ سے کوئی تعلق رکھنا بھی گوارا نہیں جبکہ شرمین وغیرہ میرا ذکر اپنی فرینڈز سے کرنا نہیں بھولتیں۔

مجھے ان سے ملواتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہیں۔

”نیلو کا بھائی ہے تو تمہارا ابھی رشتے دار ہوا کہ نہیں۔“

”ہاں ہوا مگر رشتے داریاں تو ملنے جلنے سے قائم رہتی ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں کوئی زیادہ آنا جانا نہیں ہے۔ البتہ نیلو اور اس کا چھوٹا بھائی ملنسار طبیعت کے ہیں۔“ ضومران نے گلاس میز پر پٹخ دیا۔

”تمہیں غرور کس بات کا ہے، کیا سمجھتی ہو خود کو جو اتنا اکڑتی ہو، مگر میں تم سے اپنا آپ منوا کر رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن تمہیں مجھے ماننا ہوگا، چاہے اس کے لیے مجھے اپنے دل اور ذہن کے خلاف ہی کیوں نہ چلنا پڑے۔“

ناصیہ کا اس کی جانب سے اتنا غیر جذباتی رویہ اسے جوش دلایا گیا کہ اس کے خیال کے مطابق یہ اس کی ہتک تھی۔ یہ سب سوچ کر اس نے میز پر دھرا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا کہ اب اسے بگڑا موڈ بحال کرنا تھا۔

جب تھوڑی دیر کے بعد نیلو کے ساتھ ساتھ خالہ بھی اندر آئیں تو وہ بڑے مطمئن انداز سے مسکرا دیا۔

”نیلو واپسی کا ارادہ بھی ہے یا خالہ کی محبت میں بھائی کو بھول چکی ہو۔“ لہجہ معمول سے کہیں زیادہ خوشگوار تھا۔

”چلیں بھیا میں تو انتظار کر رہی تھی آپ کا۔“ وہ جو گرم دوپہر میں اسے ڈسٹرب ... پریشان تھی کہ جانے بھائی کس موڈ میں تشریف لا ... گے۔ ہلکی پھلکی ہوگئی۔

”اچھا آنٹی اب اجازت دیں پھر کسی ... آئیں گے۔“

”ہاں بیٹا کیوں نہیں میں انتظار کروں گی ... لوگوں کا۔ وہ کہاں ہے تمہاری باجی انہیں بھی ... چلتے ہیں۔“ اور ابھی ضومران نے بات مکمل کی ... کہ ناصیہ آگئی۔

”جا رہی ہو نیلو پھر کب آؤ گی؟“

”اب آپ کی باری ہے۔“ ضومران کا ... اور اتنی اپنائیت سے کہنا اسے حیران کر گیا۔ مگر کہا ... نہیں اثبات میں سر ہلا دیا۔

”پھر کب تک آ رہی ہیں آپ باجی؟“ نیلو ... پوچھا۔

”میں جلد بھیجوں گی اسے۔“ ناصیہ کے کچھ کہنے سے پہلے اس کی امی نے کہہ دیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ دنوں تک ضومران عابدی کے اچانک بدل جانے والے رویے پر حیران ہوتی رہی۔

ضومران نے اپنا آپ منوانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ کسی طور بھی مثبت نہیں کہلا سکتا تھا۔ مگر خود پسندی اور جذباتیت کی رو میں بہہ کر وہ ایک لمحے کو بھی اپنی اس گھٹیا پلاننگ پر شرمندہ نہیں ... تھا بلکہ طبیعت اور بھی جولانی پر تھی۔ ایک معصوم لڑکی کے جھکے سر کو تصور کی آنکھ سے دیکھ وہ خود کو فاتح عالم محسوس کر رہا تھا۔ یہ سوچ ہی اس کی رگوں میں خون کی گردش کو تیز اور چہرے کو چمک دے جاتی کہ اب وہ دن دور نہیں جب ناصیہ نہ صرف دل بلکہ زبان سے بھی اس کی سحر انگیز شخصیت کا اعتراف کرے گی۔

☆☆☆

حسب وعدہ فرحت نے ناصیہ کو جلد ہی ان کے ہاں بھیج دیا۔ جب وہ آئی تو ایرج اور ضومران گھر پر نہیں تھے۔ نیلو سے باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد دونوں بھائی بھی آ پہنچے۔

ایرج تو خیر اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہی تھا۔ ضومران نے شاید پہلی مرتبہ اسے اپنے ہاں دیکھ کر کھلے دل سے سواگت کیا۔

”کیسی ہیں آپ!“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ وہ نارمل لہجے میں کہتی ہوئی یہی سوچ رہی تھی کہ شاید بہن بھائی نے سمجھایا ہے جو اس کا رویہ میرے ساتھ پہلے سے بہت بہتر ہے۔

”نیلو پلیز چائے کا انتظام کرو، میں کپڑے چینج کر کے آ رہا ہوں۔“ اس کے کہنے کی دیر تھی، نیلو اٹھ کھڑی ہوئی۔

جب وہ لباس تبدیل کر کے آیا تو یہاں چائے کے ساتھ ساتھ شرمین بھی موجود تھی، مگر ضومران نے اسے دیکھ کر کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ہی ہر بات پر اسے مخاطب کر کے کرتی رہی۔

”تمہاری امی کا کیا حال ہے؟“ اس کی بے تحاشا ہنسی سے گھبرا کر ضومران نے پوچھا۔

”ہونہہ یہاں بیٹھے مجھ سے پوچھ رہے ہو کبھی اتنا تو ہوا نہیں کہ دو گھڑی کے لیے ہی سہی مگر آ کر اپنی آنٹی کا حال ہی پوچھ لو۔“

”اور تمہیں تو جیسے بہت فکر ہے ان کی جو کبھی کوئٹہ چل پڑتی ہو، کبھی مری اور شہر میں ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس بیٹھنے کے بجائے ادھر ادھر گھومتی رہتی ہو۔“

”سارا ٹائم انہیں ہی تو دیتی ہوں کتنے دنوں سے کہیں گئی بھی نہیں......“

”اب جو یہاں آ کر جم گئی ہو اسے کیا نام دو گی۔“

”اگر تمہیں پسند نہیں، بور ہو رہے ہو میری موجودگی سے تو میں چلی جاتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ ضومران فوراً اٹھ کر روک لے گا، مگر وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا چائے پیتا رہا تو اپنی انا کا پاس رکھنے کو اسے جانا پڑا۔

”شاید ناراض ہوگئی ہے۔“ نیلو نے فکر مند ہو کر کہا۔

”یہ ایسی ہی ہیں ... ہوئی سر کھانے کو۔“ اس نے اتنی بے زاری سے کہا کہ نیلو جو شرمین کے پیچھے جانے لگی تھی۔ بھائی کا موڈ دیکھ کر واپس آ گئی۔

پنکی اور نمو کیسی ہیں؟“ ناصیہ نے پوچھا۔

”پنکی کے بال سفید ہو گئے اور نمو اونچا سننے لگی ہے۔“ ایرج نے کمال سنجیدگی سے بتایا۔

”کیا مطلب؟“ ناصیہ گھبرا گئی، جبکہ نیلو اور ضومران بے اختیار ہنس پڑے۔

”آپ کے خیال سے انہیں اب تک کچھ ہو جانا چاہیے تھا ٹھیک ٹھاک ہی ہیں دونوں......“

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ ناصیہ بھی ہنس دی۔

اس روز ناصیہ نے خاصا وقت ان کے ہاں گزارا مگر ضومران کی موجودگی میں زیادہ باتیں نہیں ہو سکیں، ایرج ہی بولتا رہا، یا پھر ضومران۔ ناصیہ اور نیلو نے آج صرف سننے پر اکتفا کیا۔ جب شام گہری ہونے لگی تو وہ گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلیں باجی میں چھوڑ آتا ہوں۔“ ایرج اس کے کہے بنا ہی تیار ہو گیا۔

”تم کبھی بھول کر پڑھ بھی لیا کرو ایرج۔ میں نے اسی طرف جانا ہے انہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔“ ضومران کے کہنے کی دیر تھی ایرج خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”آپ رہنے دیں میں چلی جاؤں گی۔“ ایرج کی بات دوسری تھی وہ ضومران کے ساتھ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

”مجھے اپنے کام سے ادھر جانا تو ہے ہی پھر اسی بہانے میں خالہ جان کو سلام کر لوں گا۔“ وہ اس کی سنے بغیر باہر نکل گیا، تو کوئی سبب نہ پا کر اسے بھی تقلید کرنا پڑی۔

”گفٹ پسند آیا تمہیں؟“ گاڑی مین روڈ پر ڈالتے ہی اس نے برابر میں بیٹھی ناصیہ سے پوچھا۔

”کون سا گفٹ؟“ وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

نیلو کے ہاتھ بھیجا تھا۔ میں نے نہیں وہ شاید دینا بھول گئی۔" وہ تحفہ جس کے لیے کبھی اس نے کہا تھا دیتے ہوئے میرا نام نہ لینا اب اس کی طرف سے ہو گیا تھا۔

"ہاں وہ مل گیا تھا ویسے نیلو نے نہیں بتایا۔ کہ آپ کی طرف سے ہے میں تو یہی سمجھی کہ نیلو دے رہی ہے۔ اس لیے رکھ لیا تھا۔" وہ کچھ الجھی الجھی سی کہنے لگی۔ تو ضومران عابدی نے محسوس کیا جملوں کی ترتیب تھوڑی غلط ہو گئی ہے یہ فقرہ تھوڑا وقت گزرنے کے بعد زبان پر لانا مناسب ہوتا۔

چلو خیر ہے اب بھی کچھ نہیں بگڑا اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ تھا اسے۔

"خالہ کو میں نے اس روز عرصے بعد دیکھا تھا۔ صحت پہلے سے بہت ڈاؤن محسوس ہوئی۔ خیال رکھا کرو ان کا، تم شاید سمجھ نہیں سکتیں، والدین کتنی بڑی نعمت ہیں۔ ہمیں دیکھو یہ نعمت کھو کر۔ بے قیمت پانی کی طرح ہو گئے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود ہماری تکلیف کی چبھن اپنے دل میں محسوس کرنے والے جا چکے ہیں۔ ہر سراب کو حقیقت جان کر اس کی جانب لپکتے ہیں۔ یہ آنٹی فرخندہ (پنکی کی مما) اور آنٹی نیر (شرمین کی مما) کو میں خوب سمجھتا ہوں اپنے مطلب کی ہیں۔ مگر پھر بھی ان سے تعلق جوڑے ہوئے ہوں۔" بات کرتے ہوئے ایک نظر ناصیہ پر ڈالی تو احساس ہوا پہلی ہی کوشش میں خاصا کامیاب ہو چکا ہے کہ وہ...... آنکھوں میں ہمدردی کے جذبات لیے اس کی بات غور سے سن رہی تھی۔

"ہاں نیلو بھی اس کمی کو شدت سے محسوس کرتی ہے مجھ سے گھنٹوں پرانی باتیں کرتی رہتی ہے میں بہلانے کی کوشش تو کرتی ہوں مگر میں خود بھی محسوس کرتی ہوں اس درد کی دوا تسلی دلاسے نہیں ہیں۔"

"اچھا نیلو اس حد تک محسوس کرتی ہے حالانکہ میں نے اپنی طرف سے انہیں ہر خوشی اور سکون مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔"

وہ بہن کی حالت پر رنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

"آپ سے بہت پیار کرتی ہے وہ، اور آپ نے بہن بھائی کے لیے خود کو جس طرح وقف کر رکھا ہے اس کا اسے پورا احساس ہے، قدر کرتے ہیں ایرج اور نیلو آپ کے اس جذبے کی۔" باقی کا فاصلہ اسی موضوع پر باتیں کرتے ہوئے کٹا۔ اسے صرف گھر کے دروازے کے آگے اتارا بلکہ خود بھی خالہ اور خالو کو سلام کرنے اندر آیا۔

رات بھیگتے پر جب وہ سوسائٹی کے مختلف لگائے نبھا کر گھر لوٹ رہا تھا تو ذہن میں اپنی اور ناصیہ کی گفتگو گونج رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا اس نے جو کچھ اپنے بارے میں ناصیہ سے کہا تھا وہ صرف لفاظی نہیں تھی۔ واقعی وہ والدین کی کمی محسوس کرتا تھا مگر دنیا کے بکھیڑوں میں الجھ کر یہ درد دل میں دبا رہا تھا۔ کبھی اظہار کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ لیکن آج اس نے جو کچھ کہا پہلے پہل تو بے شک ڈرامہ تھا مگر بعد میں اس میں جو الفاظ استعمال ہوئے وہ بنا کسی منصوبے کے دل کی۔ گہرائیوں سے نکل کر آواز میں ڈھلے تھے۔

☆☆☆

"یاد ہے تم دونوں نے میری وطن واپسی پہ پارٹی کا پروگرام بنا رکھا تھا۔"

"جی اچھی طرح یاد ہے۔ بھیا اور آپ نے کہا تھا پارٹی وارٹی چھوڑو ہم تینوں دن کا ایک حصہ کسی اچھے سے مقام پر گزاریں گے۔" نیلو کو سب یاد تھا۔

"پھر کیا خیال ہے آئندہ ویک اینڈ پر تمہیں لے نہ چلوں۔"

"ضرور بھائی ہم تو اس لیے چپ رہے تھے کہ آپ بزی ہیں شاید ٹائم نہ دے سکیں۔"

"نہیں ایرج تمہاری کسی بات سے میں نے کب انکار کیا ہے بس تم لوگ تیار رہنا اور یاد رکھو تم دونوں کے لیے میرے پاس بہت ٹائم ہے۔"

"تھینک یو بھیا۔" وہ دونوں بے اختیار بولے۔

"پلیز شرمین اور پنکی وغیرہ کو مت آفر کرنا ساتھ چلنے کی۔" اس نے تنبیہ کی۔

"ہمارا ایسا کوئی پروگرام نہیں ویسے بھی شرمین کی آنٹی لندن سے آ رہی ہیں۔ وہ ان کی موجودگی میں کہیں بھی جانے پر راضی نہ ہو گی۔ اور رہی پنکی تو وہ ادھر کم ہی آتی ہے ویسے میں نے کئی مرتبہ اسے توقیر کے ساتھ دیکھا ہے۔"

"توقیر وہی جو پنکی کے خالہ زاد ہیں۔" ایرج کی بات سن کر نیلو نے پوچھا۔

"ہاں وہی پہلے تو آنٹی فرخندہ اسے بالکل پسند نہیں کرتی تھیں مگر جب سے وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوا ہے ویلیو...... بڑھ گئی ہے اس کی۔" ایرج کی معلومات اچھی خاصی تھیں۔

ضومران نے خود بھی پنکی کو کئی مرتبہ ریسٹورنٹ اور شاپنگ سینٹرز میں توقیر کے ساتھ دیکھا تھا۔ اور ہر مرتبہ اسے پنکی پر غصہ آیا تھا جو اپنے اس لوز کیریکٹر کزن کو اتنی اہمیت دے رہی تھی۔ (شائد ضومران کے رد عمل سے مایوس ہو کر اس نے یہ راہ اپنائی تھی جو سراسر گھاٹے کی تھی) وہ اسے ٹوکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا مگر سوچ ضرور ذہن ابھرتی کہ انکل اور آنٹی بیٹی کے غلط انتخاب پر اسے سمجھاتے کیوں نہیں۔

☆☆☆

ناصیہ باورچی خانے میں بری طرح مصروف تھی جب تینوں نے دھاوا بول دیا۔

"سب کام چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلیں۔" ایرج نے آتے ہی آرڈر دیا۔

"مگر کہاں چلوں؟" وہ سل پر قیمہ پیستے ہوئے بولی۔

"ہم لوگ پکنک پر جا رہے ہیں سوچا تمہیں بھی ساتھ لے لیں۔" ضومران نے لب کھولے۔

"مگر میں تو بہت مصروف ہوں۔" اتنے خلوص سے دی گئی دعوت ٹھکراتے ہوئے وہ شرمندہ ہو کر کہہ رہی تھی۔

"کیا مصروفیت ہے آپ کی چھوڑیں اور چلیں ہمارے ساتھ۔" نیلو نے کچھ سننے سے انکار کر دیا۔

"آج تو واقعی نہ جا سکے گی بچو کہ اس کی پھپھو ابھی کچھ دیر بعد ہمارے ہاں آ رہی ہیں۔" ناصیہ کے والد نے بتایا۔ "ان کے بیٹے کی شادی ہوئی تھی نا کچھ عرصہ پہلے، تو اب ہم نے ان لوگوں کی دعوت کی ہے دوپہر کو آ رہے ہیں وہ لوگ۔" خالہ نے بھی وضاحت کی اور ضومران عابدی دل ہی دل میں اپنی ناکامی پر سلگ کر رہ گیا کہ جس کے لیے اتنا کھڑاگ کیا تھا۔ وہ ساتھ جا ہی نہیں رہی تھی اب تو دل یہی چاہ رہا تھا یہیں سے گھر کی راہ لے مگر بہن بھائی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

اسے نا صرف ان کے ساتھ جانا تھا بلکہ ان کی خاطر موڈ بھی خوش گوار رکھنا تھا جو اس جیسے بندے کے لیے کوئی آسان بات نہ تھی مگر اپنے پیاروں کے لیے تو بڑی سے بڑی قربانی ہنستے مسکراتے دی جا سکتی ہے یہ تو صرف موڈ خوش گوار رکھنے کی بات تھی۔ کوئی بات نہیں آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں' اس نے خود کو تسلی دی اور گاڑی کی اسپیڈ میں اضافہ کر دیا۔ ضومران کی یہ آج نہیں تو کل کل نہیں تو پرسوں کچھ زیادہ ہی لمبی ہوتی جا رہی تھی کہ ناصیہ طیب اس کے اندازے سے کہیں زیادہ بلکہ اندازے سے الٹ ثابت ہو رہی تھی۔

ان کے ہاں آتی تھی تو اس کی باتوں کا جواب اپنائیت سے دیتی اور جب وہ ان کے یہاں جاتا تب بھی اس کا لہجہ شگفتہ ہی ہوتا مگر ناصیہ کی جانب سے اپنے لیے جو توجہ اور محبت بھرا لہجہ وہ چاہ رہا تھا۔ اس کا نشان دور دور تک نہ تھا حالانکہ اپنی طرف سے شائستگی کی بگل مار کر جو کچھ کر سکتا تھا' کر رہا تھا' مگر لگتا تھا آج کی طرح کل بھی لڑکی لوہے کے چنے ثابت ہو گی۔ وہ نہیں چاہتا تھا اپنے منہ سے آئی لو یو کہہ کر اسے متوجہ کرے۔ اس کی تو بس اتنی خواہش تھی کہ ناصیہ کی نگاہوں میں اسے دیکھتے ہی چراغ جلنے لگیں۔ اس کیفیت کے آتے ہی ضومران کی شکست کو ایک جست میں فتح میں تبدیل ہو جانا تھا۔ مگر اس منزل کا نشان ابھی دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔

☆☆☆

اس شام وہ ناصیہ کے والد کے ساتھ ملکی سیاست پر تبصرہ کر رہا تھا۔ قریب ہی چارپائی پر فرحت بیٹھی بھانجے کی باتیں بڑے غور اور دلچسپی سے سن رہی تھیں جو قطعاً ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ تو صرف اس کی صورت دیکھنے آ بیٹھی تھیں جو برسوں بعد خالہ کے ہاں

آنے لگا تھا۔ ان سادہ دل لوگوں سے باتیں کرتے ہوئی مزے دار چائے اور دیگر لوازمات سے لطف اٹھاتے ہوئے۔ ضومران نے ایک لمحے کو بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی ذرا سی ضد کی خاطر ان بے چاروں کی آبرو اور زندگی کی واحد خوشی مٹی میں ملانے پر تل گیا ہے۔ جبکہ یہ سادہ دل اس کی بلائیں لیتے نہیں تھکتے۔

جس وقت وہ گھر آیا تو شام کافی گہری ہو چکی تھی۔ نیلو اور ایرج عام طور پر اس وقت لان ہی میں موجود ہوتے تھے، مگر آج یہاں کوئی نہ تھا۔ وہ وسیع لان عبور کر کے اندر آ گیا۔

"ہیلو ضومران صاحب! کہیے کیسے مزاج ہیں؟" سامنے صوفے میں دھنسے توقیر نے اٹھ کر سواگت کیا مگر اسے اور نیلو کو یہاں اکیلا دیکھ کر اس سے تو کچھ کہا ہی نہیں گیا۔

"بھیا کب سے انتظار کر رہی تھی میں آپ کا۔ ایرج بھی ابھی تک نہیں پلٹا، وہ تو اچھا ہوا جو پنکی اور توقیر بھائی آ گئے ورنہ......"

"اچھا پنکی بھی آئی ہے۔" وہ جو چلتے چلتے رک گیا تھا، یہ کہہ کر اس کے قریب آ گیا۔

"میرے بیڈروم میں ہے، میں نے نئی پینٹنگ خریدی تھی نا وہی دیکھنے گئی ہے۔"

"ہائے ضومران! کب آئے تم؟" پنکی پنک سوٹ میں واقعی پنکی بنی آ پہنچی۔

"ابھی ابھی آیا ہوں، تم بیٹھو۔"

"نہیں دراصل مجھے اور توقیر کو بازار جانا ہے کچھ شاپنگ کے لیے۔" پھر وہ دونوں رکے نہیں، بائے بائے کرتے چلتے بنے۔

"کیوں آئے تھے یہ دونوں یہاں؟" ان کے جاتے ہی اس نے بہن سے پوچھا۔

"اسی پینٹنگ کے سلسلے میں کہہ رہی تھی۔ تم نے نمو سے بہت تعریف کی تھی، سوچا میں بھی دیکھتی چلوں۔"

"چلو چھوڑو اس بات کو۔" توقیر کی یہاں موجودگی کی کڑواہٹ اب چونکہ کم ہو گئی تھی اس لیے وہ عام موضوعات کی طرف آ گیا۔

☆☆☆

دن ہفتوں کا سفر طے کر کے مہینے اور پھر سے مہینوں میں ڈھلنے کا سفر طے کر رہے تھے۔ ابھی اب بھی اسی مقام پر تھی جہاں پر ضومران نے اسے پہلے پہل دیکھا تھا مگر وہ یہ محسوس نہ کر سکا یا شاید شدت سے نہ جان سکا کہ وہ دھیرے دھیرے محسوس طور پر اپنی جگہ سے سرک رہا تھا۔ کام نمٹا کے اسے ناصیہ کے ہاں جانے کی بے چینی ہوتی ہے اور بظاہر اسے اپنا اسیر بنانے چل پڑتا ہے اور وہاں اس چھوٹے سے نیچی چھتوں والے مکان میں بیٹھ کر جہان کے موضوعات پر تبصرہ کرتا ہے۔

کبھی ناصیہ بھی کام سے فارغ ہو کر اس کے قریب بیٹھ جاتی ہے تو اس کی جیسے مراد بر آتی ہے اس نے یہ حقیقت خود پر کسی نہ کسی حد تک آشکار ہو کے باوجود اگنور کی ہوئی تھی۔ خود سے یہی کہا تھا۔

"میں صرف اور صرف اس لڑکی کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ ناصیہ طیب تم ہرگز وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتی اندر سے تم بھی نازک سا جذبوں بھرا دل رکھنے والی عام سی لڑکی ہو اور جس دن وہ یہ بات مان لے گی میرے قدم اس گھر کے راستے پر اٹھنا بھول جائیں گے۔"

"ناصیہ تمہارے نزدیک محبت کیا مفہوم رکھتی ہے۔" ایک روز...... جب دل نے زیادہ شور مچایا تو کچن میں اس کے قریب آ کھڑا ہوا اور پوچھ بیٹھا۔

"محبت تو میراث ہے بندگان خدا کی اور کے لیے یہ غیر مرئی شے احساس کی حیثیت رکھتی آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" ناصیہ کا جوں کا توں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے ضومران کی مسحور کر دینے والی آنکھوں کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ پشت کیے اپنے کام میں مصروف تھی۔

ان آنکھوں میں جلنے والی روشنیاں فریب کے ایندھن سے فروزاں تھیں مگر اس سے انکار نہیں کہ اس کے خیالات جاننے کا وہ دل سے تھا۔ اسے کوئی اہمیت نہ دینے کے باوجود اس بار

انکار نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بہت حسین اور پر اثر شخصیت کی مالک ہے۔ اگر فرحت بیگم باورچی خانے سے نہ آ جاتیں تو شاید انتظار کی کیفیت سے بور ہو کر وہ اپنی آئی لو یو نہ کہنے والی شرط بے ساختہ توڑ چکا ہوتا مگر اب اسے واپس کمرے میں آ کر بیٹھنا پڑا۔

"ضومران بیٹا! نیلو اور ایرج کو بھی لے آیا کرو۔ بہت دن ہو گئے ان سے ملے ہوئے۔" فرحت بیگم پلنگ پر بیٹھتی ہوئی کہنے لگیں۔

"جی ضرور، وہ تو بہت یاد کرتے ہیں آپ لوگوں کو بس ذرا پڑھائی میں مصروف ہیں۔"

"بہت اچھے بچے ہیں دونوں، نیلو تو بالکل ماں پہ ہے نا صرف شکل و صورت بلکہ ملنسار طبیعت بھی اپنی ماں پر ہے۔"

"جی ہاں، بہت مشابہت ہے مما سے جوں جوں بڑی ہو رہی ہے بالکل ان ہی کی طرح لگنے لگی ہے۔"

"ہاں ماشاء اللہ خاصی سمجھ دار ہے خدا کے فضل سے نیک اور سادہ فطرت بچی ہے مگر پھر بھی ضومران بیٹا! مجھے تم سے یہ بات کہنا تھی کہ اب تم شادی کر لو۔ کیوں کہ اس عمر میں نیلو کو کسی اچھے دوست اور راہنما کی بہت ضرورت ہے، اس میں شک نہیں کہ تم اس کا بہت خیال رکھتے ہو، بہت پیار ہے تمہیں بہن بھائی سے، مگر بیٹا گھر میں کسی ایسی عورت کا ہونا بہت ضروری ہے جو اسے وہ سب کچھ سمجھا سکے جو تم ایک مرد ہونے کے باعث نہیں بتا سکتے۔" وہ ان کی باتوں پر ہوں ہاں ہی کرتا رہا کہ اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ کرنا ممکن نہ تھا اور اس کا ارادہ تو ابھی شادی کا سرے سے تھا ہی نہیں۔

"کہیں یہ ناصیہ کے لیے تو راستہ ہموار نہیں کر رہیں۔" اسے فوراً ہی شک گزرا تو بول اٹھا۔

"آنٹی کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسی لڑکی ہے جو مجھے اور میرے گھر کو یکساں چاہ سکے۔"

"یہ بات تو میں دنوں سے کرنا چاہ رہی تھی مگر تم لڑکیوں کے بارے میں بھی مجھ سے ہی مشورہ لو گے، یہ خیال نہیں تھا اور یوں بھی بیٹا میرے اور تمہارے ماحول میں بہت فرق ہے۔ میری جان پہچان کی لڑکیاں تو متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ تمہارے معیار پر پوری کہاں اتریں گی، ہاں وہ ناصیہ تمہارے چچا اور پھپھو کی بیٹیوں کا بہت ذکر کرتی ہے، میں خود تو کبھی کبھار ہی ملی ہوں۔ اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

اپنی سوچ پر وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا کہ خالہ نے یہ بات واقعی خلوص سے کہی تھی، ان کا اپنا کوئی مفاد نہیں تھا۔

ان کی باتوں کی درستی کا اندازہ اسے اس روز ہوا جب ایک روز لابی میں آتے ہی نیلو کو ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے دیکھ کر فون کرنے والے کے متعلق پوچھا۔

"توقیر بھائی کا تھا، کہہ رہے تھے پنکی وغیرہ کے ہاں کوئی فون اٹینڈ نہیں کر رہا تو میں نے سوچا آپ لوگوں سے خیریت معلوم کر لوں۔" نیلو تو شاید یہ بات عام سے لہجے میں کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی مگر اسے اچانک ہی غصہ آ گیا۔

"نیلو!" ضومران کی آواز پر وہ رک گئی اور مڑ کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"آئندہ اگر اس شخص کا فون آئے تو صاف کہہ دینا کہ پنکی کے بارے میں جو کچھ معلوم کرنا ہے اس کے گھر جا کر معلوم کرلے، یہاں فون کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر بھیا وہ کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں۔" وہ اس کی بات پر جز بز ہو کر کہنے لگی۔

"جو بھی سوچے، تمہیں فکر کیوں ہے۔" نیلو اس کی بات پر خاموشی سے پلٹ تو گئی مگر چہرے سے صاف لگتا تھا بات کچھ اچھی نہیں لگی۔

ضومران شکی طبیعت کا مالک نہیں تھا پھر نیلو جیسی معصوم، نیک فطرت بہن پر شک کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر خطرہ توقیر کی طرف سے تھا کہ اس کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ کھٹکا تھا تو اس کی جانب سے مگر وہ بہن کو سامنے بٹھا کر توقیر کی غلیظ فطرت کے بارے میں بتا نہیں سکتا تھا۔ اسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ معصومیت کے لیے زہر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی خباثت کے فسانے بے حد مشہور تھے۔

☆☆☆

اس روز ایرج کے ساتھ ناصیہ چلی آئی تو اس نے

سوچا کہ وہ ساری بات ناصیہ کو کہہ کر اسے کہے گا' وہ نیلو کو اونچ نیچ سمجھائے' یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن بھی ہوگیا کہ یہ یقین دل میں اتر گیا کہ...... سمجھا دے گی بلکہ ایسا مشورہ دے گی کہ یہ الجھن ہی مٹ جائے گی۔

وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کب نیلو اور اریج ادھر ادھر ہوں اور وہ بات کر سکے۔ بہت دیر صبر کے بعد یہ موقع اس کے ہاتھ آیا جب نیلو ملازمہ کو ہدایات دینے اور اریج فون اٹینڈ کرنے اٹھا۔

"ناصیہ!" اس نے اریج کی نئی تصویروں کا البم دیکھتی ناصیہ کو پکارا۔

"جی۔" وہ یوں ہی تصویروں میں گم بولی۔ اس نے بات کرنے کے لیے مضمون ترتیب دیے مگر اچانک وہ یہ سب کہتے کہتے رک گیا۔ ضمیر کی چبھن جو وہ کئی روز سے محسوس کرنے لگا تھا شدید ہوگئی۔

"تم خود کیا کر رہے ضومران عابدی! کیا تم بھی توقیر والا رول ادا نہیں کر رہے؟ کیا فرق ہے تم میں اور توقیر میں۔ ناصیہ کو کھلونا تو تم بھی سمجھ بیٹھے ہو۔" یہ آوازیں اس کے آس پاس کچھ اس طرح بلند ہونے لگی تھیں کہ وہ شرمندگی کے احساس سے گڑا جا رہا تھا اس نے ناصیہ کے ہاتھ سے البم لے کر تصویروں میں خود کو مصروف کرنا چاہا۔

"آپ کچھ کہنا چاہ رہے تھے مجھ سے؟" ناصیہ نے ذرا توقف کے بعد پوچھا۔

"ہوں' شاید...... مگر اب بھول گیا ہوں۔"

اس میں شک نہیں کہ وہ جس سوسائٹی سے تعلق رکھتا تھا وہاں مرد عورت ان پابندیوں کے جکڑے ہوئے نہیں تھے' جن کی مڈل کلاس اسیر تھی اور پھر ضومران عابدی تو صنف مخالف کے لیے بے پناہ کشش رکھتا تھا' اس نے اپنی جانب اٹھنے والی نگاہوں کو مذہب کا لبادہ اوڑھ کر مایوس نہیں تھا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ کبھی پہل نہیں کرتا تھا۔ دوستی کا ہاتھ اگر اس کی جانب بڑھے تو پھر تھامنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔

مگر یہ اور بات کہ لڑکیاں اس کے رویے سے چند ہی دنوں میں مایوس ہو کر اس کا نام دلوں میں بسا کر کسی اور کے نام کی ہو جاتی تھیں اور یہ سب وہ جان بوجھ کر کرتا تھا کیوں کہ وہ اس سچویشن سے گھبراتا تھا جب یہ دوستیاں بدنامی میں بدل جاتی ہیں۔ مگر ناصیہ طیب سے دوستی یا دشمنی کرنے میں اس نے پہل کی تھی' خود کو منوانے کے لیے بظاہر اس کی جانب دوستی اور خلوص کا تحفہ لے کر آیا تھا۔ مگر اس میدان کا عادی نہیں تھا' ضمیر ابھی زندہ تھا اور رفتہ رفتہ کچوکے لگانے لگا تھا اور اب تو دل کی آواز بھی اس آواز میں شامل ہوگئی تھی۔

اس دن جو شرمندگی کا احساس جاگا تو کئی دن وہ اپ سیٹ رہا اور دل کی آواز دبا کر ناصیہ کے ہاں بھی نہ گیا۔ گھر میں بھی کم ہی ہوتا' باہر کی مصروفیات میں اور بھی اضافہ کر لیا تھا۔ نیلو بھائی کی کیفیت پر حیران تھی مگر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پاتی کہ وہ بہت الجھا الجھا سا لگتا تھا۔ رات گئے پلٹتا آتے ہی سو جاتا' کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ ملتا۔

اس روز جانے کیسے جلدی آ گیا مگر آج نیلو اور اریج غائب تھے۔ سوچا شاید ناصیہ کے ہاں گئے ہوں سو خود بھی وہاں جانے کی ٹھان لی کہ اب دل کی آواز کو دبانا کچھ مشکل ہو رہا تھا مگر جانے کیوں وہ یہ حقیقت اب بھی تسلیم کرنے سے ہچکچا رہا تھا کہ وہ اس کے لیے اچانک بہت اہم ہوگئی ہے۔ اسے کچھ شاپنگ کرنا تھی اس لیے شاپنگ سینٹر آ گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ خریدتا آنکھ نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ نیلو اور توقیر کی گاڑی میں یہ کیونکر ممکن ہے اطراف کا ماحول جلنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیلو سے باز پرس کرتا' سامنے کے اسٹور سے پنکی برآمد ہوئی۔ توقیر نے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا پھر اس کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ شاید وہ ان کا پیچھا کرتا مگر جانے کہاں سے ناصیہ نکل کر چھم سے اس کے سامنے آ گئی۔

"پلیز مجھے غلط نہ سمجھو' میں وہ نہیں جو تم مجھے سمجھ بیٹھی ہو۔" اس کی وضاحت پر وہ ہنس پڑی پھر ہنستی چلی گئی۔ اتنی بلند آواز میں کہ مارکیٹ کا شور اس کی ہنسی میں دب گیا۔

یہ کیفیت اس پر کتنی دیر کے لیے طاری ہوئی' کچھ اندازہ نہ تھا۔ جب حواس قابو میں آئے تو وہ گھر کی جانب رواں تھا اور گاڑی کی اسپیڈ خطرناک حد تک پہنچ رہی تھی۔

"ہم لوگ اس ویک اینڈ پر پکنک کا پروگرام بنا رہے ہیں' پلیز آپ بھی چلیے گا۔" ٹی وی لاؤنج سے ابھرنے والی آواز بلاشبہ توقیر کی تھی۔

"سوری توقیر صاحب! میں نہ جا سکوں گی۔ پنکی نے آج بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ بھی ساتھ ہیں ورنہ میں نہ جاتی۔" نیلو کا لہجہ بے حد کھر دار تھا۔

"نیلو تم میرے کزن کی انسلٹ کر رہی ہو۔" پنکی یہ برداشت نہ کر سکی۔

"یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے پنکی!" ضومران نے یہ کہہ کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"اوہ اب میں ایک سیکنڈ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتی' چلو توقیر!" پنکی یہ کہہ کر باہر نکل گئی اور توقیر نے بھی تقلید کی۔

"بھیا یہ پنکی تو بہت خراب ہے۔ آج مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی' یہ نہیں بتایا کہ توقیر بھی ساتھ ہے اور یہ توقیر تو......"

"میں جانتا ہوں نیلو!" ضومران نے بہن کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر آج وہ بروقت آ کر نیلو کی بات نہ سن لیتا تو جانے اس کی جلد بازی کیا رنگ دکھاتی۔

"نیلو کیا سازش ہو رہی ہی میرے خلاف؟" اریج نے آتے ہی حسب معمول بلند آواز میں کہا۔

"نیلو بہت خلاف ہو رہی ہے' میں سمجھا رہا تھا اسے۔" ضومران نے بھی اسی کے لہجے میں کہا کہ وہ ماحول پر چھایا غبار ہٹانا چاہ رہا تھا۔

"نیلو کا کیا ہے یہ تو ہمیشہ کسی نہ کسی سازش میں ملوث رہی ہے۔" اریج نے شانے اچکا کر بہن کو دیکھا۔

"بہن تو تمہاری ہوں مگر یہ عادت مجھ میں نہیں۔"

"اب تم مانو گی تھوڑا ہی۔ چھوڑو بھئی یہ بتاؤ خالہ کے ہاں کون کون جائے گا؟"

"یعنی ناصیہ باجی کے ہاں' دونوں جائیں گے۔"

"تو پھر ایک منٹ میں تیار ہو کر آ جاؤ' میں پورچ میں کھڑا ہوں۔" وہ تو آج وہاں پہنچنے کے لیے بہت بے چین تھا کہ آج اس نے ناصیہ طیب کے سامنے بہت سے اعتراف کرنے تھے اور اسے ان تمام بے چینیوں سے بھی آگاہ کرنا تھا جنہوں نے ناصیہ سے ملنے کے بعد ہر ہر پل اس کے دل میں ہلچل مچائی تھی مگر جن سے اس نے ہمیشہ انکار کیا تھا۔

نیلو کی بات اک بہانہ بن گئی ورنہ جذبے تو اتنے منہ زور ہو ہی چکے تھے کہ مضبوط سے مضبوط بند توڑ کر اچانک اس کے ساتھ ساتھ ناصیہ کے پاکیزہ دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔

"مجھے اعتراف ہے ناصیہ کہ عورت کا کردار ہی اس کا حسن ہے۔ دولت اور نمود و نمائش نہیں۔ عورت اڑتی تتلی کی مانند ہے جسے چھونے کے لیے ہم راستوں کی پیچیدگی دیکھے بغیر اونچی نیچی گھاٹیوں پر دوڑ پڑتے ہیں اگر ہاتھ آ جائے تو خوشی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ کتاب میں اس کے پر سجائیں تو بھی اس کے پیچھے دوڑنے والی مشقت ہمیں اس کی ادا اور حسن کی یاد دلاتی رہتی ہے اور وہ پر ہمارے لیے ہمیشہ خوب صورت رہتے ہیں......

لیکن اگر یہی تتلی یوں ہی اچانک آ کر ہمارے ہاتھ پر بیٹھ جائے تو ہم مٹھی میں دبا لیتے ہیں پھر کسی کتاب میں اس کے پر سجا کر بھول جاتے ہیں۔

مجھے یقین ہے ناصیہ کہ تم میرے دل میں ابھرنے والے پاکیزہ جذبوں کی تائید کرو گی۔ تمہارا وسیع دل میری لغزش کو بھی معاف کر دے گا اور تمہارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں آ کر اس رشتے کی تائید کر دے گا جو دل والوں کی میراث ہے۔" ضومران کو پورا یقین تھا اور سچے جذبے پتھروں میں زندگی دوڑا دیتے ہیں' یہاں تو ناصیہ طیب کا دل تھا۔

☆☆

شازیہ الطاف ہاشمی

کالا پتھر

حسب معمول زینت کے سر میں شدید درد تھا اس کی کنپٹیاں درد سے سلگ رہی تھیں۔

وہ خاموش محنتی لڑکی تھی اللہ نے اوپر تلے دو رحمتیں عطا فرمائیں۔ اس بھری پُری دنیا میں جب اس کی زندگی میں نیا موڑ آیا۔ اور اس کی شادی ہوئی تو اس کو پتا چلا کہ یہاں محبت، خدمت کے بدلے طعنے اور برا بھلا ہی سننے کو ملتا ہے۔ یہ دنیا کا نیا مگر بدترین چہرہ تھا اِس کے گھر کا بجٹ ہمیشہ سے آؤٹ رہتا قدم آگے کے بجائے پیچھے سفر کرتے رہتے اسے لگتا کہ سفر دن بہ دن اسے بدحالی کی طرف دھکیل رہا ہے مگر جن پر خرچ کیا جاتا۔ جس کی دل جوئی کے لیے اس کا اور اس کی بچیوں تک کا حق لٹا دیا تھا وہاں سے سوائے برائی کے کچھ ہاتھ نہ آتا تھا نندوں کی تربیت بھی اسی گھر میں ہوئی تھی۔ باتیں بنانا ان کی زندگی کا واحد مقصد رہ گیا تھا باتیں جن سے حاصل کبھی کچھ نہیں ہوتا ناکام لوگوں کی نشانیوں میں پختہ نشانی۔ جس جیٹھانی کو دوادارو جواد لالا کے دیا کرتا تھا اس کی آنکھوں میں سردمہری کے سوا کبھی کچھ نہ ملا تھا۔

"بھابھی، دو منٹ کے لیے اپنا پائپ دے دیں۔ مجھے فرش دھونا ہے۔"

کیا پڑی ہے روز فرش دھونے کی تجھے۔ ہر طرف جل تھل کا سماں۔

"یہ وہی پائپ تھا جو جواد لے کر آیا تھا۔ لیکن اس وقت انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ہر چیز پر قبضہ ان کی فطرت تھی اور اس کے لیے چاہے جتنی ذلت ہوتی وہ پروا نہ کرتیں۔

ساتھ والی ثریا خالہ کا بھی یہی حال تھا وہ بھی چھوٹی بہو کی چیزیں کبھی مانگ کر تو کبھی چرا کر مختلف حربے آزما کر بڑے بیٹے کا گھر بھرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں مگر ان کے گھر خوش حالی کا کوئی عمل دخل کبھی نہیں نظر آیا تھا۔ سارے کے سارے گھر والے مختلف امراض کا شکار تھے۔ چھینا، لوٹا ہوا سارا میڈیکل اسٹورز میں بخوبی ادا ہو جایا کرتا۔ یہی حال اسے بے حال کر رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پیسوں کو اس نے بڑی رقموں میں تبدیل کیا گیا مگر وہ خرچ کہاں ہوئیں۔ وہ جانتی تھی۔

وہ اپنے آپ کو آخر مارتی کس لیے ہے؟ ایک سوال۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ قریبی چھوٹے دوا خانے اس سخت گرمی کے باعث بند پڑے تھے۔ وہ بچیوں کے پاؤں میں جوتے پہنا کر رکشے میں بیٹھ گئی۔ رکشے کا شور، دھول مٹی اور سخت گرمی اسے بتا رہے تھے کہ زندگی گزارنا کتنا مشکل ہے۔

جواد لاہور واپس اپنی ڈیوٹی پر جا چکا تھا اسے یاد تھا کہ شروع شروع میں وہ چیخ چلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کرتی تھی مگر اس کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کیا فرق پڑ سکتا تھا اگر کسی کو نہ بھی ہوتی اس کے شوہر کو ہی اس کی پرواہ ہوتی تو وہ کم از کم اس جہنم سے اسے نجات ضرور دلاتا۔

"امی جان اکیلی ہیں۔" ابا جان بوڑھے ہیں۔

امی اور ابا جان کا جہاں بڑے بیٹے سے شروع اور ان ہی پر ختم تھا اور اس کا دل جل جل رہا تھا۔

یہ جلنا اس کا مقدر ہے مقدر سے کون لڑ سکتا ہے۔"

کی نصیب ہے، زینت آہستہ آہستہ زندگی سے بیزار ہو رہی تھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ بقا کو جاتا ہوا ہر راستہ فنا کی طرف کھینچ رہا ہے تو کیوں نہ وہ بھی مر ہی جائے اس کے مر جانے سے کیا بدل جاتا کچھ نہیں ذرہ برابر بھی نہیں۔

اسپتال کی ٹائمنگ سے پہلے وہ یہاں آئی تھی عملے کی آمد و رفت سے اسے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر آنے والا ہے۔ دوسرا نمبر اس کا آیا تھا۔ دواؤں کا پرچہ لے کر میڈیکل اسٹور سے گولیاں لینے کے فوراً بعد اس نے پانی کی بوتل لبوں سے لگا لی۔

"اسٹریس کم سے کم لیں محترمہ اور آپ کا بی پی بہت زیادہ ہی لو ہے۔ یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

"امی بسکٹ!" وریشہ اور عانیہ نے بسکٹ کے پیکٹ ہاتھ میں لیے اور کچر کچر کھانے لگیں۔

"انہیں تو اپنی اولادوں کی بھی فکر نہیں۔ اپنی اگلی نسل سے کیا لینا دینا۔" وہ دیر تک کڑھتی رہی پھر نجانے کب آنکھ لگ گئی۔

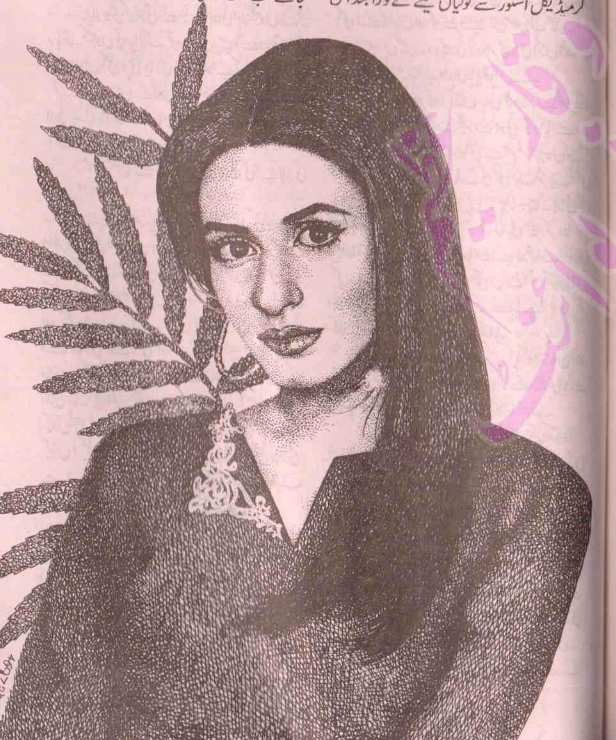

وریشہ اور عانیہ بیڈ کے ساتھ صاف چمکتے فرش پر کھلونے لیے کھیل رہی تھیں۔ وہ باہر نہیں نکلی تھیں باہر نکلنے کی صورت میں ہمیشہ بڑی بھابی کے بچے جو اپنی اہمیت سے خوب واقف تھے وہ دونوں بچیوں کو بے دردی اور نفرت سے مارا کرتے تھے۔ ان کا بچپن جواد کی ہٹ دھرمی اور میری بدبختی نے چھین لیا۔ اسے افسوس ہوا کتنی دیر تک وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

"کاش وہ کھیل سکتیں۔"

جواد بڑی گرمجوشی سے بڑے بھائی اور بھتیجوں سے مل رہا تھا۔ بھتیجوں کی چالاک مٹھیوں میں پیسے دے رہا تھا۔ امی اور ابا جان بھی اپنی بیماری اور بڑھاپے کو خوب استعمال کر رہے تھے۔ ان کے لہجوں میں شفقت کے بجائے ہمیشہ لالچ چھپا رہتا تھا مگر جو جان کر بھی انجان نہیں اور اپنوں کو آگ میں جھونک کر تماشا دیکھیں۔

"اس شخص سے میں نے کتنی محبت کی' بے کار کی محبت۔"

زینت نے سوچا اور کھڑکی سے ہٹ گئی جب ہر منظر ان کے بغیر مکمل ہو جاتا ہے تو وہ کیوں خود کو بے وقعت کرے۔ سب کی بے رحمی کی داستانیں اس نے کئی بار اسے سنانا چاہیں مگر وہ سن کر کروٹ بدل لیتا اور صبح وہی آمد و رفت۔ کاش وہ ایسا بے رحم نہ ہوتا اسے ہماری تنگ دستی اور تنہائی کا بھی احساس کرنا چاہیے۔ کبھی کبھی اسے شک ہونے لگتا اور یہ شک بے وجہ نہیں تھا۔ کبھی اس کے لیے اس کا بڑا بھائی (جیٹھ) آخر کیوں نہیں اٹھتا وہ اتنی معتبر اور قریب کیوں نہیں۔ وہ کیوں اکیلی بازاروں کی گلیوں میں دھکے کھاتی پھرتی ہے۔ اسے اتنی ہنسی کیوں نہیں آتی کیوں اس کی تکلیف پر کوئی تڑپتا نہیں سوچ سچ ہے خیال الجھے ہیں۔

جواد کا موڈ بڑا ہی خوش گوار۔۔ تھا۔ وہ رفتہ رفتہ مر رہی تھی محبت کیے جا رہی تھی محبت کا جواب کسی بھی طرف سے نہ ملا تھا۔ جواد نے ہمیشہ ایک طرف رکھا تھا۔ اس کے اتنے احتجاج کے باوجود اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ کروٹ بدل کر پیار بھری پکار کا محتاج ہو جاتا تھا پھر موڈ بحال ہو جاتا۔ گرم سلگتا ہوا دن اپنے اختتام کی طرف گامزن تھا ایک کمرے دونوں بچیوں کے ساتھ گرم آگ برساتے میں مصروف تھی۔ سکھ کا کوئی لمحہ نہ تھا۔

کس نے کھینچی حیات کی
ہاتھ میں جام، پاؤں میں

صبح ہی صبح بھابی کی بکواس نے اس کا کر دیا تھا بڑی دیر تک وہ بھی دوبدو مقابلہ کرنے کی کرتی رہی مگر وہ اکیلی نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ ساس بھی اسے گالیاں اور کوسنے دینے میں مصروف تھیں دونوں بہویں تھیں۔ وہ چھوٹی تو دوسری بڑی انہیں کے بجائے ہمیشہ جانب دار ہی پایا تھا اس نے۔

"بدبخت مر کیوں نہیں جاتی تو سارے لیے عذاب بنی ہوئی ہے غیرت ہوتی تو دنیا موڑ لیتی مگر ہر صبح کمینی زندہ ملتی ہے ہم کم نصیبوں کو

ساس اماں اپنے زمانے کی کتنی نیک شریف زبان والی ہوں گی اسے ہر پل پتا چلتا رہتا۔ بھابی جوان بیٹیوں تک نے اس کا تماشا جی لگا کر دیکھا تھا آج اس کے دل کی حالت بے حد خراب تھی۔ اسے متلی ہو رہی تھی۔ صبح بچیوں نے افراتفری دودھ کے ساتھ جیسے تیسے سوکھے سے پاپے ڈبو ڈبو کر کھا لیے تھے خود اس نے کچھ نہیں کھایا۔

بہت سارا رونے کے بعد کسی کی بھی زبان نہ ہوتی دیکھ کر اس نے جواد کو کال کر کے ساری بتانا چاہی تھی۔ وہی اس کا شوہر اس کا محافظ تھا۔

"دیکھو زینت! میں اپنی ماں کو منع نہیں کر سکتا۔"

دوسرے لفظوں میں زینت کے لیے نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اسے بھی اس جلتی ہوئی قبر میں اور انہیں رہنا اولاد اپنا بوجھ خود سنبھالے۔

وہ تیزی سے پچھلے صحن کی طرف بھاگتی گئی جہاں اماں جی کا تخت اور کرسیاں بچھی تھیں۔ انار اور امرود کے چھوٹے درخت اور جامن کے گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تھی اسے وہاں کی کھلی ہوا کبھی میسر نہیں آ سکی تھی۔ وہیں بیٹھ کر بڑی بھابی خود کو جوان رکھنے کے

کرتی تھیں کبھی انڈوں کے ماسک لگ رہے لیے منہ پر تھوپے جا رہے ہیں حسب توقع کالے پتھر والی پیالی بھی وہیں پڑی تھی۔ یہ اور بچیوں کی زندگی کی آخری شام ہو گی۔

پیالی چھپا کر وہ اپنے کمرے میں لے آئی تھی الماری رکھ کر وہ کتنی دیر تک بے آواز بچیوں کو گلے لگائے کسی کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ دونوں اب طنز بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

عانیہ شدید بخار کی وجہ سے سرخ منہ لیے فرش پر

"مما! مما! دیکھیں عانیہ کو کیا ہوا ہے" وہ جلدی دونوں بچیوں کو لے کر اسپتال پہنچ گئی۔

عانیہ کا بہت گرم وجود اسے ہولا رہا تھا۔ ایک کمرے میں بہت سارے ڈاکٹر اور نرسیں جمع تھیں کوئی بہت سیریس مریض لایا گیا تھا یقیناً۔ اچانک سارا ہجوم چھٹ گیا تھا وہ اس کے سامنے تھی۔

کالا پتھر پی کر آئی ہے۔ بدبخت شوہر دبئی میں ہوتا اس کا۔ ساس نندوں سے جھگڑ کر۔" دو عورتوں نے پیچھے سے سہارا دے کر اٹھا رکھا تھا۔

"ساری زبان باہر لٹک کر کچھ باہر نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرخ چہرہ جس پر موت کا خوف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھٹی آنکھوں میں موجود تکلیف اس کے شدید کرب کا پتا دیتی تھی۔

"یہاں تو تکلیف اٹھائی ہی ہے اب قیامت تک زہر لبوں سے لگائی رہے گی دوزخن۔"

کوئی عورت غصے سے بولی تھی۔ کہیں کوئی ہمدردی کا بول نہیں تھا۔ جب اسے خود سے ہمدردی تھی ہی نہیں تو کوئی اور کیوں کرتا پھرے۔ زینت نے عورتوں کو کس کر اس کا منہ باندھتے دیکھا' وہ سک سک کر مر چکی تھی۔

چھوٹی سی تو زندگی ہے اور وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔

"تم لوگ باہر صحن میں کھیلو گی آج؟" اس نے دونوں بچیوں کو فٹ بال تھما کر کہا۔

"مگر مما!" وہ جھجکیں۔

"تم جاؤ میں کھانا بنا رہی ہوں۔" حسب معمول تھوڑی ہی دیر کے بعد وریشہ روتی ہوئی لوٹ آئی تھی۔

"مما! تانیہ آپی نے مارا ہے۔"

"پراٹھا چولہے سے اتار کر وہ تانیہ کے پاس آئی جس نے فٹ بال کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا تھا۔

"تانیہ بیٹا! یہ وریشہ اور عانیہ کے بھی پاپا کا گھر ہے اور آج سے یہ بھی یہیں کھیلیں گی۔ بہتر ہو گا آپ آج ہی سے عادت ڈال لو۔"

بدتمیز عورت ہمارے منہ نہ لگ صبح صبح۔" وہ سنی ان سنی کر چکی تھی۔ اب ان ہی کے گلے چیخ چیخ کر بیٹھنے والے تھے۔

"اتنی غیرت والی ہوتی تو؟" ساس دور سے اسے مر جانے کا مشورہ دینے لگیں۔

"آنٹی اگر آپ غیرت والی ہوتیں تو یہ بھی آپ کی ہی پوتیاں ہیں۔"

"بدبخت' بدنصیب۔" اماں جی چلانے لگیں۔ اس نے کسی کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بچیاں کھلے ماحول میں خوش تھیں جب انہوں نے باہر صحن میں ٹیبل پر ناشتہ کیا تھا۔ جوس' انڈے' پراٹھے ٹھنڈا پانی ماحول کشیدہ تھا یا خوش گوار زینت کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

"یہ تم زیادہ تو خوش نہیں دکھائی دے رہیں آج؟" جواد حیران ہوا۔

"ہاں ہوں تو سہی۔ آپ کی محبت کی وجہ سے ہی تو خوش رہنے لگی ہوں۔ سنیں یہ لسٹ میں نے بنا دی ہے۔ فریج خالی پڑا ہے۔ یہ سارا سامان یاد سے لا دیں۔ پلیز! سارا مہینہ بچیاں چکن کے بغیر کیسے رہیں گی اور جوس وغیرہ بھی لازمی لے آئیں۔"

"ارے بیگم جی!" وہ پھر حیران ہو۔

ہلکی سی لپ اسٹک اور صاف کپڑوں میں وہ بہت نکھر سی گئی تھی۔ احتجاج کے بجائے ایک اور راہ کی کوشش کی بھی تھی۔ اسے کوئی اس کا حق نہیں دے گا تو وہ چھین لے گی۔ ان کے رویوں کا کالا پتھر وہ انہیں ہی پلائے گی۔ خود کبھی نہیں پیے گی کبھی بھی نہیں۔ ہنستی مسکراتی بچیوں کو دیکھتے وہ مسکرا دی۔ زندگی کا نیا راستہ اس نے ڈھونڈ نکالا تھا۔

☆☆

اس زخمِ جاں کے نام، جو اب تک نہیں بھرا
اس زندہ دل کے نام، جو اب تک نہیں مرا

ان اہلِ دل کے نام، جو راہوں کی دُھول ہیں
ان حوصلوں کے نام، جنہیں دُکھ قبول ہیں

اس زندگی کے نام، گزارا نہیں جسے
اس قرضِ فن کے نام، اُتارا نہیں جسے

ان دوستوں کے نام، جو گوشہ نشین ہیں
ان بے حسوں کے نام، جو بارِ زمین ہیں

ان بے دلوں کے نام، جو ہر دم ملول ہیں
ان بے بسوں کے نام، جو گملوں کے پھول ہیں

اس شعلہ رُخ کے نام، روشن ہے جس سے رات
ہے ضو فشاں اندھیرے میں، ہر نقطۂ کتاب

اس حسنِ باکمال کی رعنائیوں کے نام
اور اپنے ذہن و قلب کی تنہائیوں کے نام

اعتبار ساجد

ذرا پہلے بتا دینا

کہانی ختم ہونے سے ذرا پہلے بتا دینا
میں اپنے سارے جذبوں کو سمیٹوں، ختم کر ڈالوں
یا کوئی جوگ لے کر زندگی کو رائیگاں کر دوں
مجھے یہ بھی بتا دینا
وہ وعدے جو تم نے
میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے
کیے تھے
انہیں اب یاد رکھوں میں
یا
اک دھوکا سمجھ کر خاک میں پھینکوں
کہانی ختم ہونے سے ذرا پہلے بتا دینا
مجھے اور کتنا جینا ہے
میرے کردار کی مدت کتنی ہے کہانی میں
بتا دینا!!

سباس گل

کوئی پوچھے تو بتاؤں کیا، مرے دل سے کیوں وہ اُتر گیا
مرے سامنے کوئی بات کی، مرے سامنے ہی مُکر گیا

یوں نہ کارِ عشق تمام کر، یوں نہ صبحِ شوق کی شام کر
وہ جو واقعہ تھا وہ ہو گیا، وہ جو سانحہ تھا گزر گیا

کوئی آنکھ میری طرف نہ ہو، کسی کو ذرا بھی خبر نہ ہو
مجھے جب بکھرنا پڑا کبھی، کہیں دُور دل میں بکھر گیا

مرے روز و شب تھے بندھے ہوئے مرے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

مجھے یاد پھر سے دلا گیا مری بھولی بسری محبّتیں
یونہی دفعتاً کسی موڑ پر مجھے دیکھ کر وہ گزر گیا

مرے ساتھ بڑی دُور تک چلا جا رہا تھا وہ سیدھ میں
وہی راستہ ذرا گھوم کر کہیں وادیوں میں اُتر گیا

جاوید شاہین

کچھ نہیں بدلا دوانے تھے، دوانے ہی رہے
ہم نئے شہروں میں رہ کر بھی پرانے ہی رہے

دل کی بستی میں ہزاروں انقلاب آئے مگر
درد کے موسم سُہانے تھے، سہانے ہی رہے

ہم نے اپنی سی بہت کوشش کی، وہ نہیں پگھلا کبھی
اس کے ہونٹوں پر بہانے تھے، بہانے ہی رہے

اے پرندو ہجرتیں کرنے سے کیا حاصل
چونچ میں تھے چار دانے، چار دانے ہی رہے

گاؤں کی معصوم ندیوں نے بہت روکا مگر
شہر کے بادل سیانے تھے، سیانے ہی رہے

اقبال آشعر

انتخاب

اِس ماہ کی مسکراہٹ

غلطی

ٹی ٹوئنٹی کرکٹ میچ میں ایک بہت اچھا کھلاڑی پہلی گیند پر آؤٹ ہو گیا، وکٹ کیپر کو بہت افسوس ہوا، ازراہ ہمدردی بول اٹھا۔

"کوئی بات نہیں دوست! کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے اب دیکھو ناں، پچھلے میچ میں تم نے بالروں کی خوب ٹھکائی کر کے سنچری بنائی تھی۔"

"ہاں بھئی۔ میں پچھلے میچ میں خوب جم کے کھیلا تھا اور جب آؤٹ ہو کے واپس پویلین میں پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس اور صدمہ ہوا کہ کھانے پینے کی تمام اشیا اور مشروبات پوری ٹیم ختم کر چکی تھی اور مجھے بھوکا رہنا پڑا تھا۔"

حیرانی

ایک عورت نے نفسیاتی علاج کے ماہر ڈاکٹر سے کہا۔

"اللہ کے واسطے میرے شوہر کو سدھارنے کے لیے کچھ کیجیے۔ وہ سارا سارا دن ایک بہت بڑا ڈھول بجاتے ہوئے گھومتے پھرتے ہیں۔"

ڈاکٹر بولا۔ "اسے خبط تو نہیں کہا جا سکتا۔ بالکل نارمل سی عادت ہے یہ۔ میں خود بھی کبھی کبھی ایک بڑا ڈھول بجاتا ہوں۔"

عورت نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ڈھول کے اندر بیٹھ کر۔"

دام میں

ایک شخص نے ریڈ سگنل توڑا، اس کے پیچھے مزید پانچ لوگوں نے سگنل توڑ ڈالا۔ پولیس نے پہلے شخص کے علاوہ ان پانچوں کا چالان کاٹ دیا۔

لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے پہلے والے سوار کو کیوں چھوڑ دیا؟

انسپکٹر نے جواب دیا۔ "وہ ہمارا ہی آدمی ہے۔ ابھی خود واپس آ جائے گا اور پھر سگنل توڑے گا اور آپ کی طرح چار پانچ لوگوں کو پھنسوا دے گا۔ آخر ہمیں بھی تو ٹارگٹ پورے کرنے ہوتے ہیں۔"

مشورہ

پارک میں ایک شخص انتہائی غم زدہ شکل بنائے بیٹھا تھا۔ ایک صاحب بہت دیر سے اسے دیکھ رہے تھے، آخر ان سے رہا نہ گیا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آئے اور اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھی۔

اس شخص نے انتہائی دکھی انداز میں ان صاحب سے کہا۔

"غم سے نجات حاصل کرنے کا کوئی آسان طریقہ بتا دیں۔"

ان صاحب نے ہمدردی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"تم شادی کر لو۔"

اس شخص نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اسی غم سے تو نجات چاہیے۔"

ثبوت

شوہر بیوی سے کہتا ہے۔ "میں نے سنا ہے عورت روزانہ تین ہزار باتیں کرتی ہے، جب کہ مرد سارے دن میں ہزار باتیں کرتا ہے۔"

بیوی: "ہاں تم نے ٹھیک سنا ہے کیوں کہ عورت کی مجبوری ہے کہ وہ اپنی بات کو دو دو، تین تین بار دہرائے تاکہ احمق لوگ اسے سمجھ سکیں۔"

شوہر: "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

بیوی غصے سے: "دیکھا جب تک دوسری بار نہ بولوں، تمہیں میری بات سمجھ میں ہی نہیں آتی۔"

فوری حل

ایک عورت ماہر نفسیات کے پاس گئی اور کہنے لگی۔

"میں اپنے بیٹے کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ وہ مٹی کے لڈو بنا بنا کر کھاتا ہے۔"

ماہر نفسیات نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ ذرا بڑا ہو گا تو اس کی عادت خود بخود ختم ہو جائے گی۔"

اس عورت نے بے بسی سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! کوئی فوری علاج بتائیں ورنہ میرے بیٹے کی دونوں بیویاں رو رو کر پاگل ہو جائیں گی۔"

اطمینان

آدھی رات کو گلی میں شور سن کر شوہر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ باہر نکل کر محلے والوں سے پوچھنے لگا۔

"اتنا شور کیوں ہے؟"

ایک آدمی نے کہا۔ "خبردار رہنا، پانی میں زہر شامل ہو گیا ہے۔"

یہ سن کر شوہر گھر چلا آیا۔ بیوی نے پوچھا۔

"سنیں...... باہر کیا ہوا ہے؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔ سب خیریت ہے۔ تم پانی پیو اور سو جاؤ۔"

ترجیح

ایک صاحب کو کسی معمولی جرم میں ایک ہفتے کی قید یا ہزار روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ انہوں نے قید کو ترجیح دی تو ان کے دوست احباب حیران رہ گئے۔ ایک عزیز نے کہا۔

"ایک ہزار روپے جرمانہ ادا کر دیتے۔ ایسی بھی کیا کنجوسی؟"

ان صاحب نے وضاحت کی۔ "کنجوسی کی بات نہیں۔ دراصل آج ہی ہمارے باورچی نے دو ہفتے کی چھٹی لی ہے۔ گھر پر رہوں گا تو بیگم کے ہاتھوں کو پکا ہوا کھانا کھانا پڑے گا۔"

چھوٹ

ایک بھکاری کو سو روپے ملے۔ وہ فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھانے گیا اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کھانے کا بل پانچ ہزار روپے بنا۔ بھکاری نے منیجر سے کہا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ منیجر نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔

بھکاری نے پولیس کو سو روپے دیے اور چھوٹ گیا۔

طریقۂ واردات

ٹیچر نے بچے کی نوٹ بک پر ریمارکس لکھے۔

"پڑھائی میں اچھا ہے مگر لڑکیوں میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ میں ایک طریقہ استعمال کرنے والی ہوں، امید ہے ٹھیک ہو جائے گا۔"

ماں نے ریمارکس پڑھے تو ٹیچر کو لکھا۔ "شکر ہے اگر کام بن جائے تو مجھے بھی بتانا۔ میں وہ طریقہ اس کے پاپا پر استعمال کروں گی۔"

تعریف

ایک خاتون نے آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

"میں سچ مچ بدصورت ہوں، مجھ میں کون سی چیز ایسی ہے جس کی میرے شوہر تعریف کر سکتے ہیں؟"

اتفاق سے شوہر اس وقت کمرے میں داخل ہوا اور بیوی کی بات سن کر اس نے کہا۔

"بیگم تمہاری نظر بہت اچھی ہے۔"

فصل غم کا گوشوارہ

رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کوئی شخص اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔"

صحابہ نے کہا: "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کوئی شخص اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرتا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ ایسا کام ہوتا دیکھتا ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بولنا ضروری ہے۔ پھر وہ اس کے بارے میں بات نہیں کرتا (اور غلط کام کرنے سے منع نہیں کرتا۔"

اس سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

"تجھے فلاں مسئلے میں بات کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟"

وہ کہے گا: "لوگوں کا خوف تھا۔"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "تیرا زیادہ حق مجھ ہی سے ڈرنے کا تھا۔"

دُنیا سے رغبتی،

حضرت ابن مسعودؓ نے اپنے زمانے کے لوگوں سے کہا۔

"تم نماز روزہ میں اصحاب رسول سے زیادہ ہو۔ ان سے زیادہ ہو۔ ان سے زیادہ مجاہدے کرتے ہو۔ مگر وہ تم سے بہت بہتر تھے۔"

لوگوں نے پوچھا "کیوں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "وہ دُنیا سے بہت زیادہ بے رغبت تھے۔"

علاج،

ایک دن حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کی آنکھ میں کچھ ایسا زخم ہوا کہ طبیب نے معائنہ کرنے کے بعد کہہ دیا۔

"حضرت! اب اس کا علاج یہی ہے کہ آپ اس آنکھ کو پانی سے بچا کے رکھیں، ورنہ پانی پڑنے کی صورت میں بینائی زائل ہونے کا امکان ہے۔"

یہ سن کر آپ مسکرائے اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے۔

"ہم تو نذرانہ جان لیے کھڑے ہیں اور طبیب بینائی جانے سے ڈرا رہا ہے۔"

چنانچہ آپ نے اس غیر مسلم طبیب کی بات کا بالکل خیال نہ کیا اور وضو کر کے عشاء کی نماز پڑھنا شروع کر دی اور حسب معمول ساری رات عبادت میں گزاری۔

اگلے دن جب وہ طبیب معائنے کے لیے آیا تو اس نے حیرت سے آپ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"حضرت! یہ آنکھ ایک ہی رات میں کیسے درست ہو گئی؟"

"وضو کرنے سے۔" حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے اطمینان بھرے لہجے میں اسے جواب دیا۔ یہ سن کر طبیب بہت شرمندہ ہوا اور صدقِ دل سے ایمان لے آیا۔

اقراء۔ کراچی

انمول موتی،

- ساری دُنیا کے لوگ تجھے اپنے فائدے کے لیے چاہتے ہیں۔ صرف ایک تیرا رب ہی ہے جو تجھے تیرے فائدے کے لیے چاہتا ہے۔
- جب رب راضی ہونے لگتا ہے تو بندے کو اپنے عیبوں کا پتا چلنے لگتا ہے اور یہ اس کی رحمت کی پہلی نشانی ہے۔
- کائنات میں کوئی کسی کا اتنا انتظار نہیں کرتا جتنا رب کریم اپنے بندے کی توبہ کا انتظار کرتا ہے۔
- محبت چہروں سے نہیں دلوں سے، روحوں سے کی جاتی ہے۔ چہرے تو روپ بدل سکتے ہیں، چہرے ایک جیسے ہو سکتے ہیں، لیکن روحیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔
- خواب ضرور دیکھو، مگر اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کرو کیونکہ حقیقت کا رنگ صرف اللہ بھر سکتا ہے۔ اس سے مدد کی دُعا کرو۔
- خوش اخلاقی ایسی خوشبو ہے جو میلوں دُور سے محسوس کی جاتی ہے۔
- سچائی ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی، مگر تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔

ارم کمال۔ فیصل آباد

لفظ باتیں کریں،

- بُرائی ہمیشہ ایک چھوٹے سے نقطے سے سیاہ نقطے سے شروع ہوتی ہے اور پھر پوری کالی رات میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی لیے پہلے ایک فرعون تھا اور آج بہت سے فرعون ہیں۔ اپنے آس پاس دیکھ لیں۔
- کامیابی اور محبت کبھی آدھی اور پونی نہیں ہوتی، یہ تو مکمل ہوتی ہے۔ صرف اپنے لیے سوچنے اور جینے والوں سے دُور رہتی ہے۔ ہاں خدمت اور صلاحیت کا پانی پورے یقین سے ملے تو اللہ تعالیٰ پائیداری عطا کرتا ہے۔
- زندگی کے دوراہے پر چلتے چلتے بعض اوقات ایسے لمحات بھی آتے ہیں، جب اپنے جذبات کچل کر دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اپنی انسانیت کی تکمیل کریں، آپ کی زندگی خود بخود مکمل ہو جائے گی۔

باعزت،

ایک روز لقمان حکیم لوگوں کو اچھی اچھی باتیں بتا رہے تھے اور لوگ بڑے غور اور توجہ سے ان کی باتیں سُن رہے تھے۔ بہت بڑا مجمع لگا ہوا تھا۔ اچانک کہیں سے ان کا آقا اس طرف آنکلا۔ اس نے جو لوگوں کا ہجوم دیکھا تو وہ صورت حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف آیا۔ جب اس نے آگے بڑھ کر دیکھا تو ——

—— لقمان لوگوں سے خطاب کر رہے تھے اور ان کو دانائی اور حکمت کی باتیں بتا رہے تھے۔ لوگ نہایت خاموشی سے سُن رہے تھے۔ وہ بڑا حیران ہوا۔ اس نے حکیم کو پہچان لیا تھا پھر بھی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کا حبشی غلام ہے۔ آخر اس نے اپنا شک دُور کرنے کے لیے ان سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا تو وہی حبشی غلام نہیں ہے جو میری بکریاں چرایا کرتا تھا؟"

لقمان نے اقرار کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بے شک میں وہی ہوں۔"

"تو پھر اتنا معزز کیسے بن گیا کہ اتنے لوگ تیری باتیں سُننے کے لیے جمع ہو گئے اور سب تجھے اتنی توجہ اور خاموشی سے سُن رہے ہیں۔"

آقا نے حیرت سے لقمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا کی ہے۔"

لقمان نے عاجزی اور انکساری سے جواب دیا۔

"بھلا ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ تیرا وہ کون سا عمل ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنا باعزت کیا؟"

آقا نے اسی حیرت کے ساتھ دوسرا سوال کیا۔

"میری زندگی کے چند اصول ہیں۔ جن کے سبب اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عزت بخشی ہے۔ اوّل یہ کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

دوم یہ کہ میں نے کبھی فضول باتیں نہیں کیں۔
سوئم یہ کہ میں نے کبھی امانت میں خیانت نہیں کی، اگر کسی نے میرے پاس کوئی چیز رکھوائی تو اس کی بھی دل و جان سے حفاظت کی۔ اگر کسی نے کوئی راز کی بات بتائی ___ تو اپنے دل میں رکھی۔ کسی دوسرے کو نہ بتائی۔"

دانش کی بات،

- انتقام لینے والا اپنے ساتھ کی گئی زیادتی پر غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ وہ مسلسل سوچ سوچ کر تکلیف کو زندہ رکھتا ہے ورنہ وقت کے ساتھ ساتھ (اگر انتقام کا نہ سوچا جائے) تو زخم بھر جاتا ہے۔
- انسان بلند مقام اور طاقت حاصل کرنے کی کوشش میں اپنی آزادی کھو دیتا ہے۔ دوسروں پر اختیار حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات پر اختیار کھو دیتا ہے۔
- دوستی انسان کے ان پوشیدہ جذبات، احساسات اور خواہشات کو بانٹتی ہے جنہیں اگر دل ہی دل میں دبا دیا جائے تو انسان میں فرسٹریشن، ٹینشن اور ذہنی دباؤ کا موجب بنتی ہیں۔
- چالاک انسان مطالعے کو بے کار خیال کرتے ہیں اور حقارت سے دیکھتے ہیں۔ سادہ لوح انسان مطالعے کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ یہ صرف عقل مند انسان ہی ہوتے ہیں جو مطالعے کو عملی زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔

(فرانسس بیکن)

خزیمہ ریاض۔ سدوکی۔ گجرات

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناول

دستِ مسیحا
نگہت سیما
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

بدشگونی،

شرعی لحاظ سے کسی چیز سے برا شگون لینا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ صرف توہمات کا کرشمہ ہے۔
اس بدشگونی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کیوں مرث کے بیٹوں نے رات کے پہلے حصے میں مرغ کی اذان سنی اور اسی رات کیوں مرث کا انتقال ہو گیا جس سے انہیں یہ توہم ہوا کہ مرغ کا بے وقت اذان دینا کسی خبر کا پیش خیمہ ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے اس مرغ کو ذبح کر دیا اور بعد میں مختلف حادثوں کا مختلف چیزوں کا سے خصوصی تعلق قائم کر لیا گیا۔ البتہ فال نیک لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

فراست حضرت علیؓ،

- بھوکے شریف اور پیٹ بھرے کمینے کے حملے سے ڈرتے رہو۔
- جب سختی انتہا کو پہنچ جائے تو کشائش و فراخی ہو گی اور جب ابتلا و مصیبت کی کڑیاں تنگ ہو جائیں تو راحت و آسائش حاصل ہوتی ہے۔
- صدقہ کے ذریعے روزی طلب کرو۔
- صبر کرنے والا فتح و کامرانی سے محروم نہیں ہوتا، چاہے اس میں طویل زمانہ لگ جائے۔
- وہ عمر جس کے بعد اللہ تعالیٰ آدمی کے عذر کو قبول نہیں کرتا، ساٹھ برس کی ہے۔
- کسی کو اس کے حق سے زیادہ سراہنا چاپلوسی ہے اور حق میں کمی کرنا کوتاہ بیانی ہے یا حسد۔

اقصیٰ، عذرا ناصر۔ گلستان جوہر

کسی کی رسوائی کا تماشا دیکھنا،

حضرت علیؓ کے سامنے ایک مجرم لایا گیا جس کے ساتھ تماشائیوں کا ہجوم تھا تو آپؓ نے فرمایا۔
"ان چہروں پر پھٹکار ہے جو ہر رسوائی کے موقع پر ہی نظر آتے ہیں۔"

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

ارم کمال ___ فیصل آباد
ہجر موسم ہے، حالات کہہ نہیں سکتے
دو چار اشک کو برسات کہہ نہیں سکتے
دور سے دیکھ کے چپ چاپ لوٹ بھی جاتا
یوں تیرے آنے کو ملاقات کہہ نہیں سکتے

نوال افضل گھمن ___ کراچی
اب کون زخم و زہر سے رکھے گا سلسلے
جینے کی اب ہوس ہے، ہم تو مر گئے
ہم نے بھی زندگی کو تماشا بنا دیا
اس سے گزر گئے کبھی خود سے گزر گئے

سیدہ نسبت زہرا ___ کہروڑ پکا
ضبط بھی، صبر بھی امکان میں سب کچھ ہے
پہلے کم بخت دل تو مرا دل ہو جائے

ناہید اسماعیل ___ کراچی
بات چلی تو نیل گگن سے تارے توڑے لوگوں نے
وقت پڑا تو جان چھڑا لی جان سے پیارے لوگوں نے

صدف عمران ___ کراچی
تیرے جانے کے بعد بدلا ہے
پہلے بالوں کا رنگ کالا تھا

ماریہ نذیر ___ بھاگٹانوالہ
تم کو شاید یقین نہ آئے
میں نے سچ مچ بھلا دیا ہے تمہیں

فضہ نور ___ روہڑی
تھکا دیا اسے آندھیوں نے مل جل کے
وہ اک پرندہ جو اونچی اڑان رکھتا تھا

اقصیٰ ناصر ___ کراچی
اتنے بڑے جہاں میں جائے گا تو کہاں
اس اک خیال نے مجھے مرنے نہیں دیا

گڑیا شاہ ___ کہروڑ پکا
کرتی ہے سوالات مسلسل تیری نگاہ
یہ طرز تکلم مجھے اچھا نہیں لگتا
کہتے ہیں مجھے دیکھ کے اکثر میرے احباب
یہ شخص اکیلا ہے پر تنہا نہیں لگتا

مدیحہ، ایمان ___ مدینہ کالونی
رات گہری تھی، ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے، کر بھی سکتے تھے
تم جو بچھڑے تو یہ بھی نہ سوچا
کہ ہم تو پاگل تھے، مر بھی سکتے تھے

نمرہ، اقرا ___ کراچی
خاموش فضا تھی، کہیں سایہ بھی نہیں تھا
اس شہر میں ہم سا کوئی تنہا بھی نہیں تھا
کس جرم میں چھینی گئی مجھ سے میری ہنسی
میں نے تو کسی کا دل دکھایا بھی نہیں تھا

فضہ بلال ___ ڈیفنس گارڈن
کبھی غم کی آگ میں جل اٹھے
کبھی داغِ دل نے جلا دیا
اے جنونِ عشق بتا ذرا
مجھے کیوں تماشا بنا دیا

فوزیہ ثمر بٹ ___ گجرات
مجھے بھی پتا تھا کہ بدل جاتے ہیں لوگ
مگر تمہیں کبھی میں نے لوگوں میں گنا ہی نہیں

ثمرہ احمد بٹ ___ پتوکی
کچھ اس طرح سے دنیا کی مثال دیتا ہوں
سوال کرتا ہے کوئی تو ٹال دیتا ہوں
اسی سے کھاتا ہوں اکثر فریب منزل کا
میں جس کے پاؤں کا کانٹا نکال دیتا ہوں

ہیں۔ پہلی شعاع میں رضیہ آپا نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

حمد اور نعت رسولؐ میرے پسندیدہ ہیں اور پھر اس کے بعد پیارے نبی کی پیاری باتیں بہت ہی اچھا سلسلہ ہے رہنمائی کے لیے۔ سلسلہ وار ناول شام کی حویلی اور شہر تمنا دونوں ہی پسند ہیں۔

باقی ساری کہانیاں پسند آئیں۔ اور مکمل ناول میں احساس ثمینہ فرحان کا بڑا ہی پسند آیا۔ وہ نازنین بہت ہی اچھا جا رہا ہے پلیز اینڈ اچھا کیجیے گا۔

پیاری سیماں! شعاع کی محفل میں خوش آمدید، شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

کراچی سے شہلا عدنان نے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

خط لکھنے کے لیے قلم اٹھانے کا باعث بنا ناظمہ زیدی کا خط، دوسری شادی واقعی ایک شرعی کام ہے اور اگر ہم بیویاں اپنی ضروریات پر کنٹرول کریں اور شوہر کو اپنی رعایا سمجھنا چھوڑ دیں تو ہوسکتا ہے معاشرے میں بہتری لائی جاسکے میں اب بہنوں سے اپنی ذاتی زندگی کی کہانی شیئر کرنا چاہتی ہوں۔

میری نند کی شادی کو چار سال ہوئے تھے۔ وہ بیوہ ہوگئیں جوان نند، چھوٹے دو بچے بے سہارا۔ سسرال میں رہتی تھیں سب اچھے تھے مگر شوہر کی طرح کوئی خیال نہیں رکھ سکتا خود دار تھیں پڑھی لکھی۔ جاب کی مگر نوکری کے ساتھ بچوں کی دیکھ بھال مشکل۔ ہم کتنا ہی خیال کرتے، گھمانے پھرانے لے جاتے مگر دن رات کا ساتھی تو نہ تھا۔ اللہ نے ان کی مشکل کا حل دیا تھا مگر ہمارا معاشرہ مرد کی دوسری شادی کو ناانصافی کا نام دیتا ہے، خیر آٹھ سال بعد ہم نے ان کی شادی کروائی اور آج وہ اللہ کے فضل وکرم سے ایک خوش حال زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کے شوہر پہلے سے بھی شادی شدہ ہیں۔ بچوں والے ہیں اور اپنی دونوں بیویوں میں انصاف کے ساتھ رہتے ہیں دونوں سوتن بھی ایک دوسرے کی عزت کرتی ہیں اور اب بچوں کی ایک چھوٹی ''مما'' میری نند اور ایک بڑی ''مما'' (سوتن) ہیں سب آپس میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ سلام ہے اس عورت پر جس نے اپنے شوہر کو کسی کی سونی زندگی آباد کرنے کا وسیلہ بنایا۔

پیاری شہلا! دو بچوں کے ساتھ ایک بیوہ سے شادی جبکہ پہلی بیوی اور بچے بھی ہوں، آسان کام نہیں ہے بے شک یہ ایک جائز اور شرعی کام ہے۔ لیکن اس کے لیے مرد کو بہت ہمت اور حوصلہ کے ساتھ ساتھ وسائل بھی درکار ہیں جبکہ صورت حال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں دو گھر تو کیا ایک گھر کا خرچ چلانا مشکل ہوگیا ہے۔ بجلی اور گیس کے بل دیکھ کر دل بند ہونے لگتا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری میں سالوں اور مہینوں کے حساب سے نہیں دنوں کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک چیز کی قیمت صبح کچھ ہوتی ہے شام کچھ اور۔

یہ تو مادی وسائل کی بات ہے، ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ وسائل رکھتے ہوں لیکن بہت سے معاشرتی مسائل بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ سوچیں اگر موجودہ شوہر سے آپ کی نند کے بچے ہوئے تو یہ میرے بچے، تمہارے بچے اور ہمارے بچوں والی سچویشن ہوگی۔ ایک ماں باپ کی اولاد کی والدین سے شکایات ختم نہیں ہوتیں تو ان بچوں میں توازن رکھنا کتنا مشکل ہوگا۔

آپ کی نند کے شوہر کی پہلی بیوی کتنی خوش ہے۔ یہ آپ اس کے ظاہر سے اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ مجبوری کا نام صبر بھی ہوسکتا ہے اور دوسری شادی آپ کی نند کی ہوئی ہے۔ اس لیے آپ بہت خوش ہیں لیکن۔ آپ کے شوہر کسی بچوں والی بے سہارا بیوہ سے شادی کرکے گھر لے آئیں تو کیا تب بھی اسی طرح خوش ہوسکیں گی؟

''کسی بے سہارا کو سہارا مل گیا'' اس وقت بھی آپ کی یہی سوچ ہوگی۔

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل	عائشہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

واصفہ سہیل

بری عادت

سینئر اداکار نعمان اعجاز کسی تعارف کے محتاج نہیں، بے شمار ڈرامے ان کے کریڈٹ پہ ہیں۔ نعمان اعجاز کسی ڈرامے میں کام کرنے کے لیے اسکرپٹ کو کتنی اہمیت دیتے ہیں اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ''میری بری عادت ہے کہ میں اسکرپٹ پڑھتا ہی نہیں ہوں (ہائیں اسکرپٹ نہیں پڑھتے تو......؟) مجھے جب ڈائریکٹر کی جانب سے کردار کے بارے میں بتایا جاتا ہے تو میں اپنے ذہن میں اس کا عکس بنا لیتا ہوں۔ میں اسکرپٹ پر یقین نہیں رکھتا (اسکرپٹ نہ ہو تو اداکاری کیسے کریں گے؟) یہ ایک ریفرنس ہے کہ کیا گفتگو ہوتی ہے اور کیسے آگے چلنا ہے۔ (کس کس نے کہاں چلنا ہے؟) میں نے کبھی اسکرپٹ نہیں پڑھا (پھر اتنا اعلا معیار؟) میں حقیقی زندگی سے بہت سیکھتا ہوں اور کہیں بھی بیٹھتا ہوں تو کسی نہ کسی کردار کو ضرور ذہن نشین کر لیتا ہوں اور جب اس کی ضرورت پڑتی ہے تو اس کا درست استعمال کرتا ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ کو ایکٹنگ نہیں آتی تو یہ بہت آسان کام ہے اور اگر آتی ہے تو یہ بہت مشکل کام ہے اور شاید مجھے ایکٹنگ نہیں آتی، اس لیے میرے لیے آسان ہے۔''

ارادہ

اداکارہ سجل علی کو آپ آج کل دو تین چینل پر

دیکھ رہے ہیں اور وہ ہر جگہ اپنی منفرد اداکاری سے ناظرین کو محظوظ کررہی ہیں۔ بھارتی فلم سے متعلق سجل علی کا کہنا ہے کہ ''فلم ''مام'' میں کام کرکے بہت شہرت ملی (کہاں؟) تاہم آفر ملنے پر بھی دوسری بھارتی فلم میں کام نہیں کیا۔ جب تک کشمیریوں کے ساتھ بھارتی حکومت کے مظالم ختم نہیں ہوں گے، پاکستانی فنکار بھارتی فلموں میں کام نہیں کریں گے۔ (وہ لیں گے بھی نہیں اپنی فلموں میں)

سجل علی نے مزید کہا کہ ٹی وی فنکاروں نے بحران زدہ فلم انڈسٹری کو ایک نئی زندگی دینے کی کوشش کی ہے جس میں فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی کاوشیں بھی قابل قدر ہیں جن کی فلموں میں کام کرکے احساس ہوا کہ وہ پروفیشنلزم پر یقین رکھتے ہیں۔ (لیکن ٹی وی اداکاروں کی وجہ سے فلم، فلم نہیں ٹی وی ڈرامہ لگتی ہے)۔

حقیقت

محسن عباس حیدر اور ان کی اہلیہ کا قصہ تو آپ کو یاد ہوگا جب اداکار کی بیوی نے ان پر شدید الزامات لگا کے طلاق حاصل کی اور خود خبروں میں ان ہوگئی لیکن محسن عباس کے کیریر پر اس کا بہت برا اثر پڑا۔

محسن عباس نے ایک انٹرویو میں کہا کہ میری کردار کشی کے لیے سوشل میڈیا پر بلاگرز کو استعمال کیا گیا اور انہیں اس کام کے پیسے دیے گئے (یعنی آپ کے پیسے ہی آپ پر خرچ ہوئے) انہوں نے کہا کہ پولیس نے مجھ پر عائد ہونے والے الزامات، تشدد، غبن سمیت تین الزام کی تحقیقات کے بعد مجھے بے قصور قرار دیتے ہوئے مقدمے کو ختم کیا۔ پولیس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ میں نے شاید تلخ کلامی کی۔ (واقعی؟)

محسن عباس کا کہنا تھا کہ یہ حقیقت ہے کہ میں غصے میں ہوں تو بدزبانی کرتا ہوں۔ یہ فطری عمل ہے کیوں کہ کوئی بھی غصے میں محبت بھری باتیں نہیں کرسکتا۔ (لیکن بدزبانی پہ تو کوئی بیوی عدالت نہیں جاتی، نہ طلاق لیتی ہے)۔

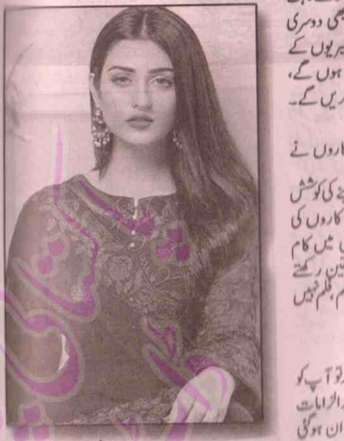

ترجیح

خوب صورت اداکارہ سارہ خان نے مختلف ڈراموں میں اپنی بہترین پرفارمنس سے اداکاری کا لوہا منوایا ہے۔ شادی کے متعلق سارہ خان کہتی ہیں کہ وہ محبت کی شادی پر یقین نہیں رکھتیں (اب...... ورنہ پہلے تو؟) وہ محبت کی شادی کرنے کے بجائے اپنے والدین کی پسند کو زیادہ ترجیح دیں گی۔

سارہ خان کا کہنا ہے کہ وہ ہمیشہ سے مانتی ہیں کہ خواتین مردوں کی نسبت زیادہ طاقت ور ہیں، اس لیے حقوق کی برابری کے لیے لڑنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ (آہاہ) میں نے اپنی زندگی میں آنے والی مشکلات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ (مثلاً؟)

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اپریل/مئی 2020

سالگرہ نمبر کی ایک جھلک

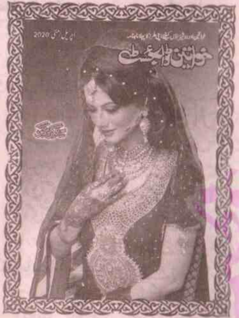

- ''سوال'' نگہت سیما کا مکمل ناول،
- ''تتلی جیسا پیار'' راحت حسین کا ناول،
- ''رنگ ریز میرے'' عفت سحر طاہر کا ناول،
- ''حالم'' نمرہ احمد کا ناول تکمیل کے مراحل میں،
- نگہت عبداللہ اور منشاء محسن کے ناولٹ،
- زارا منجرا، سدیعہ عمیر، عمارہ خان، نعیمہ ناز، جویریہ مریم اور عمارہ جہاں کے افسانے،
- پہلی باحجاب خاتون پائلٹ ''شہناز لغاری'' سے ملاقات،
- باتیں ''کنول خان'' سے،
- ''سالگرہ نمبر'' کا خصوصی سروے،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل/مئی 2020 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ہرے مسالے والے چنے

اجزاء:۔

پیاز	ایک عدد
سفید چنے	ڈیڑھ کپ (اُبلے ہوئے)
لیموں	دو چائے کے چمچے
املی کا گودا	حسب پسند
ٹماٹر	ایک عدد
دھنیا	آدھی گٹھی
پودینہ	آدھی گٹھی
ہری مرچ	چار عدد
تیل	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
کٹی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ پیس کر چٹنی بنالیں۔ کڑاہی یا کسی دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز کو سنہرا کرلیں۔ ٹماٹر، ہری چٹنی اور تمام مسالے ڈال کر بھونیں۔ املی کا پانی شامل کر کے مزید تھوڑی دیر پکالیں۔ چنے ڈال کر بھون لیں اور لیموں کا رس شامل کر کے گرما گرم پیش کریں۔ حسب پسند ابلے آلو بھی شامل کر سکتے ہیں۔

دال ماش قیمہ

اجزاء:۔

دال ماش	آدھا پاؤ
قیمہ	ایک پاؤ
گھی/تیل	آدھا کپ
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچیں	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

دال ماش صاف کر کے ایک گھنٹے کے لیے بھگودیں۔ ایک پتیلی میں گھی یا تیل ڈال کر پیاز کو سرخ کرلیں۔ اس میں ادرک لہسن، نمک، ہلدی، دھنیا، مرچیں اور قیمہ ڈال کر تھوڑا سا بھونیں اور ایک کپ پانی ڈال دیں تاکہ قیمہ گل جائے۔ جب پانی خشک ہوجائے تو دال ڈال کر بھونیں۔ ایک کپ پانی شامل کر کے ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ دال گل جائے تو پسا گرم مسالا اور کٹا ہوا ہرا دھنیا چھڑک کر پیش کریں۔

دہلی بریانی

اجزاء:۔

گائے کا گوشت	ایک کلو
چاول	ایک کلو
تیل/گھی	حسب ضرورت
پیاز	آدھا کلو
ادرک	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
لہسن	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
کالا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
لونگ	ایک چائے کا چمچہ
چھوٹی الائچی	چھ عدد
بڑی الائچی	دو عدد
کڑی پتا	دو عدد
زرد رنگ	حسب پسند

نمک	ایک چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کلو
ثابت کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں	ایک عدد
دار چینی	دو ٹکڑے
جائفل جاوتری	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

سب سے پہلے گھی میں پیاز کو سنہرا ہونے تک تل لیں۔ آدھی پیاز نکال لیں۔ اسی گھی میں سادہ ثابت گرم مسالا، ادرک، لہسن اور گوشت ڈال کر بھون لیں۔ پھر دو گلاس پانی ڈال کر گلنے کے لیے رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے تھوڑا تھوڑا دہی ڈال کر بھون لیں۔ آخر میں جائفل، جاوتری اور چھوٹی الائچی ڈال کر دم دے دیں۔ چاولوں کو لیموں کا رس اور نمک ڈال کر ابال لیں۔ جب چاول دو کنی ابل جائیں تو چھان لیں۔ ایک دیگچی میں پہلے چاول کی تہ پھر مسالے اور تلی ہوئی پیاز کی تہ لگائیں۔ آخر میں چاول کی ایک تہ اور لگائیں۔ لیموں اور رنگ ڈال کر پندرہ منٹ کا دم لگادیں۔ مزے دار بریانی تیار ہے۔

انڈے کا کٹا کٹ

اجزاء:۔

انڈے	چار عدد
ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
دہی	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچ	تین سے چار عدد
پیاز	ایک عدد
ہلدی	آدھا چائے کا چمچ
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
تیل/گھی	حسب ضرورت
ہرا دھنیا	سجاوٹ کے لیے

ترکیب:۔

ایک دیگچی میں گھی گرم کریں۔ اس میں باریک کٹی ہوئی پیاز ڈال کر گولڈن براؤن کرلیں۔ پھر اس میں پسا دھنیا، مرچ، لہسن، نمک ڈال کر ایک پیالی پانی شامل کر کے پکنے دیں۔ جب مسالا تیار ہوجائے تو دہی ڈال دیں، مزید پکائیں۔ اب اسی مسالے میں انڈے توڑ کر شامل کریں۔ خوب اچھی طرح بھون لیں۔ انڈے کا کٹا کٹ تیار ہے۔ ہری مرچ اور ہرا دھنیا اوپر سے شامل کر کے پیش کریں۔

سویوں کے لڈو

اجزاء:۔

سویاں	آدھا کلو
چینی	آدھا کلو
کھویا	ایک پاؤ
کیوڑہ	چار قطرے
بادام	حسب پسند
پسا کھوپرا	حسب پسند
چھوٹی الائچی	پانچ عدد
گھی	تین چوتھائی کپ
پانی	تین چوتھائی کپ
فریش کریم	آدھا کپ
پستہ	حسب پسند

ترکیب:۔

سب سے پہلے ایک گہری دیگچی میں گھی کو گرم کریں۔ سویوں کو چورا کر کے ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر دو سے تین منٹ تک پکائیں۔ اب دیگچی کو چولہے سے اتار لیں اور اس میں پستہ، بادام، کھویا، کھوپرا اور الائچی اچھی طرح ملالیں۔ تمام اجزاء کو اچھی طرح مکس کرلیں۔ ایک الگ دیگچی میں شیرہ بنالیں۔ جب شیرہ گاڑھا ہوجائے تو سویوں کے مکسچر کو شیرے میں ڈال کر اچھی طرح سے مکس کریں۔ جلدی جلدی اس کے لڈو بنالیں۔ اس سے پہلے کہ اجزاء ٹھنڈے ہوجائیں، اس کے اوپر فریش کریم لگا کر پیش کریں۔

☆☆

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

دنیا میں بت پرستی کا آغاز

آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن تھے، جو سب اسلام پر قائم تھے۔

قرن سے مراد نسل یا صدی ہے۔ ود سواع، یغوث، یعوق اور نسر نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگ تھے۔ جب وہ فوت ہوگئے تو شیطان نے ان کے قوم کے دل میں یہ بات ڈالی کہ جہاں وہ حضرات بیٹھا کرتے تھے، وہاں بت بنا کر رکھ دو اور ان کے وہی نام رکھ دو جو ان بزرگوں کے تھے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت تو بتوں کی پوجا نہیں ہوئی۔ جب وہ لوگ فوت ہوگئے اور علم مٹ گیا تب ان کی پوجا ہونے لگی۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے یہی بت بعد میں عرب میں پوجے گئے۔

محمد بن قیس رحمتہ اللہ نے فرمایا ہے ”یہ حضرات آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان کے زمانہ کے اولیائے کرام تھے۔ ان کے کچھ پیروکار بھی تھے جو ان کے طریقے پر چلتے تھے۔ جب وہ فوت ہوگئے تو ان کے عقیدت مند پیروکاروں نے کہا۔

”اگر ہم ان کی تصویریں بنالیں، تو ان کی یاد کی وجہ سے ہمیں عبادت کا شوق زیادہ ہوگا۔“

چنانچہ انہوں نے ان کی تصویریں بنائیں۔ جب یہ (تصویریں بنانے والے افراد) فوت ہوگئے اور ان کی جگہ دوسرے لوگ آگئے تو ابلیس نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا اور کہا۔

”تمہارے باپ دادا ان اولیائے کرام کی عبادت کیا کرتے تھے اور ان ہی کی وجہ سے انہیں بارش ملتی تھی۔“ چنانچہ ان لوگوں نے ان کی عبادت شروع کردی۔

ابوالمطہر سے روایت ہے کہ ابو جعفر محمد باقر نماز پڑھ رہے تھے کہ حاضرین نے یزید بن مہلب کا ذکر کیا۔ نماز سے فارغ ہوکر انہوں نے فرمایا۔

”تم نے یزید بن مہلب کا ذکر کیا ہے، وہ اس علاقے میں قتل ہوئے ہیں جہاں سب سے پہلے غیر اللہ کی پوجا ہوئی تھی۔ انہوں نے ود کے بارے میں فرمایا۔

”ود ایک نیک آدمی تھا، جو قوم میں ہر دل عزیز تھا۔ جب وہ فوت ہوگیا تو لوگ بابل میں اس کی قبر پر بیٹھ گئے اور بہت زیادہ غمگین ہوئے۔ جب ابلیس نے ان کا غم دیکھا تو انسانی صورت میں آکر کہنے لگا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ان صاحب کی وفات پر بہت دل گرفتہ ہو۔ تو کیا میں تمہیں اس جیسی ایک صورت نہ بنادوں، جو اس کی جگہ رکھی جائے اور وہ اس کی یادگار بن جائے؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہاں! بنادو۔“

اس نے ود کا ایک بت بنادیا۔ انہوں نے اسے چوپال میں رکھ لیا اور اسے یاد کرنے اور اس کی باتیں کرنے لگے۔ جب ابلیس نے دیکھا کہ لوگ ود کو بہت یاد کرتے ہیں تو کہا۔

”کیا میں تم میں سے ہر شخص کے گھر میں اس طرح کا ایک مجسمہ نہ بنادوں، جس کو دیکھ کر وہ اسے یاد کرے؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہاں (بنادو)۔“

اس نے ہر شخص کے گھر میں ایک بت بنادیا۔ وہ اس کو دیکھ کر اس (اللہ کے ولی ود) کو یاد کرتے تھے۔

جب ان کے بیٹے بڑے ہوئے تو انہوں نے اپنے بزرگوں کو ان (بتوں) کو اہمیت دیتے دیکھا (تو وہ بھی اسی طرح اہمیت دیتے رہے) حتی کہ اگلی نسلوں کے لوگ اس بات سے بے خبر ہوگئے کہ ان کے بزرگ انہیں کیوں یاد کرتے تھے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ ان کی عبادت شروع کردی۔ چنانچہ سب سے پہلے جس مخلوق کی عبادت کی گئی، وہ ود بزرگ کا بت تھا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بت کو پوجنے والی ایک الگ جماعت تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب طویل زمانہ گزر گیا تو انہوں نے تصویروں کی جگہ مجسم بت بنالیے تاکہ زیادہ دیر تک قائم رہ سکیں۔ (یعنی پہلے تصویریں بنائی گئی تھیں بعد میں تصویروں کے مٹ جانے کے خوف سے مجسمے بنائے گئے۔) بعد میں ان کی عبادت ہونے لگی۔ ان کے ہاں، ان کی عبادت کے بہت سے طریقے تھے۔

حضرت ام سلمہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہما نے حبشہ میں جو گرجا دیکھا تھا، اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ اس کا نام ”ماریہ“ تھا۔ انہوں نے اس کی خوب صورتی کا ذکر کیا اور اس میں جو تصویریں تھیں، ان کا ذکر کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہوجاتا تھا تو اس کی قبر پر مسجد (عبادت گاہ) تعمیر کرتے تھے اور اس میں یہ تصویریں بناتے تھے۔ اللہ کے ہاں یہ لوگ مخلوقات میں بدترین ہیں۔“ (صحیح بخاری)

اصحاب الرس

اصحاب الرس کا ذکر قرآن مجید میں دو مقامات پر آیا ہے۔ قرآن کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ملیا میٹ کردیا گیا تھا۔

عربی زبان میں ”الرس“ اس کنویں کو کہتے ہیں جس کی منڈیر پتھروں سے بنائی گئی ہو۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ ایک خاص کنواں تھا جس پر قوم ثمود کا ایک قبیلہ رہتا تھا۔ وہی لوگ اصحاب الرس کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت ابوبکر محمد بن حسن نقاش رحمتہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اصحاب الرس کا ایک کنواں تھا جس سے ان کے پینے کی اور آب پاشی کی ضروریات پوری ہوجاتی تھیں۔ ان کا بادشاہ بہت انصاف پرور اور نیک سیرت تھا۔ جب وہ فوت ہوا تو لوگوں کو بہت زیادہ غم ہوا۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ شیطان اس (مرحوم بادشاہ کی صورت ان کے پاس آیا اور کہا۔

”میں مرا نہیں تھا، میں تو غائب ہوگیا تھا تاکہ دیکھوں تم کیا کرتے ہو۔“

وہ انتہائی خوش ہوئے۔ اس نے کہا۔

”میرے لیے پردہ لگادو۔ میں کبھی نہیں مروں گا۔ (لیکن تمہاری نظروں سے اوجھل رہوں گا۔)“

بہت سے لوگوں نے شیطان کی بات کو سچ سمجھ لیا اور اس کے فریب میں آکر اس کی پوجا کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں ایک نبی مبعوث فرمایا، اس نے بتایا کہ......

”پردے کے پیچھے سے بات کرنے والا (بادشاہ نہیں، بلکہ) شیطان ہے۔ اس نبی نے انہیں اس کی عبادت سے منع کیا اور اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا۔

امام سبیلی رحمتہ اللہ کا بیان ہے کہ ان نبی پر نیند کی حالت میں وحی نازل ہوتی تھی اور ان کا نام حنظلہ بن صفوان علیہ السلام تھا۔ لوگوں نے آپ علیہ السلام پر حملہ کیا اور آپ علیہ السلام کو شہید کرکے کنویں میں ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کنویں کا پانی خشک ہوگیا۔ درخت سوکھ گئے، پھل ختم ہوگئے، انہیں پیاس نے آلیا چنانچہ ان کے گھر ویران ہوگئے اور وہ ادھر ادھر بکھر گئے اور آخرکار سب کے سب ہلاک ہوگئے۔

ہیکل سلیمانی اور تابوت سکینہ

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ سے دعا

مانگی تھی کہ مجھے ایسی حکومت ملے کہ میرے بعد آنے والوں کو ایسی حکومت نصیب نہ ہو۔ آپ کی دعا قبول ہوئی اور آپ انسانوں، جنوں، حیوانوں اور ہوا پر حکومت کرنے لگے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے باپ حضرت داؤد علیہ السلام کی خواہش کے مطابق فلسطین میں ایک عبادت خانہ تعمیر کیا۔ اس عبادت خانہ کا نام ہیکل سلیمانی پڑا۔ ہیکل سلیمانی کی تعمیر 1012ء قبل مسیح میں ہوئی۔ تعمیر کا کام سات سال تک جاری رہا۔ بعض روایات کے مطابق دو لاکھ مزدوروں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔

اسرائیلی روایات میں پایا جاتا ہے کہ تعمیر کے دوران جنوں نے بھی حصہ لیا۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس عبادت خانہ کی لمبائی 90 فٹ، چوڑائی 30 فٹ اور اونچائی 45 فٹ تھی۔ اس کے اندر ایک مخصوص جگہ بنائی گئی تھی۔ جہاں تابوت سکینہ رکھا گیا جو

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول
نیا ناول
شہر آشوب

امتل عزیز شہزاد
قیمت =/450 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

ایک صندوق کی شکل میں تھا۔ اس میں یہودیوں کے ہارون علیہ السلام کی نشانیاں تھیں۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ صندوق بہت متبرک مانا جاتا ہے۔ عصائے موسیٰ علیہ السلام بھی اسی صندوق میں تھا۔ ان میں پتھر کی وہ تختیاں بھی تھیں جو طور سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی تھیں۔

طالوت جب بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا تو اس نے لڑ کر یہ صندوق حاصل کیا تھا۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ فلسطین پر ہر زمانے میں حملے ہوتے رہے۔ کبھی بابل نے تباہی مچائی، (عراق کا قدیم نام بابل تھا) کبھی رومیوں نے حملہ کیا جس نے بھی حملہ کیا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کیے ہوئے عبادت خانے کو بھی نشانہ بناتا رہا۔

ایک مرتبہ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کیا اور ہیکل سلیمانی کو تاخت و تاراج کیا اور اسرائیلیوں کا قتل عام کیا۔ بخت نصر فلسطین سے دس لاکھ یہودیوں کو عراق لے گیا اور وہاں غلام بنا دیا۔ بخت نصر کے عہد کے بعد پھر یہ قوم فلسطین میں آ کر آباد ہو گئی۔ رومی بھی اکثر فلسطین پر حملہ کرتے رہے۔

ہیکل سلیمانی کے جو بھی نشانات تھے، حملوں کی زد میں آ کر مٹتے رہے۔ آخر میں روم کے ایک بادشاہ ٹائٹس نے ہیکل سلیمانی کو آگ لگا کر بالکل تباہ کر دیا۔ حتیٰ کہ اس کے وجود کی دھندلی سی نشانی بھی نیست و نابود ہو کر رہ گئی۔

یہودیوں کا دعوا ہے کہ ہیکل سلیمانی کی زمین پر مسجد اقصیٰ تعمیر کی گئی۔ اس لیے یہ یہودیوں کی ملکیت ہے۔ آج بھی یہ تنازعہ ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے بیت المقدس کی سرزمین پر آج تک جنگ جاری ہے۔ اسرائیلی مسجد اقصیٰ کو شہید کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

☆☆

ادارہ

خوب صورت بال

گھنے، لمبے اور چمک دار بال ہر عورت کا خواب ہوتے ہیں، تھوڑی سی توجہ سے آپ کے بال بھی خوب صورت ہو سکتے ہیں۔

زیتون کا تیل

خشک اور خستہ بالوں کے لیے اس سے بہتر کوئی تیل نہیں۔ اس کو مندرجہ ذیل طریقے سے استعمال کریں۔

☆ زیتون کے تیل کو ہلکا سا گرم کر لیں، بہت زیادہ گرم نہیں۔

☆ اپنے بالوں کو آدھے آدھے انچ کے فاصلے سے تقسیم کریں اور انگلیوں کی پوروں کی مدد سے بالوں کی جڑوں میں لگائیں۔

☆ چوڑے دندانوں کی ربڑ کی کنگھی کی مدد سے اپنے بالوں میں کنگھی کریں تاکہ تیل کھوپڑی کی جلد سے بالوں کے سروں تک برابر تقسیم ہو جائے۔

☆ تیل لگانے کے بعد اپنے بالوں کو پلاسٹک میں لپیٹ لیں اور اس کے گرد گرم پانی میں بھگو کر نچوڑا ہوا تولیہ لپیٹ لیں۔ گرمی سے تیل جذب ہونے میں مدد ملتی ہے۔

☆ پندرہ منٹ تک اسے یوں ہی رہنے دیں۔

☆ بالوں سے تیل نکالنے کے لیے اپنے سر میں شیمپو لگائیں۔ اس کا مساج کریں اور پھر پانی شامل کریں۔ (یاد رہے کہ تیل اور پانی مکس نہیں ہوتے)۔ دو مرتبہ جھاگ بنائیں اور شیمپو کو اچھی طرح سے بالوں میں لگائیں پھر بالوں کو پانی سے ایک بار، دو بار، تین بار دھو لیں۔

زیتون کے تیل کا متبادل

زیتون کے تیل کی جگہ آپ ناریل کا تیل یا تل کا تیل بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

بہت زیادہ خشک بالوں کے لیے

اگر آپ کے بال حد سے زیادہ خشک اور خستہ ہیں تو رات بھر کے لیے اپنے بالوں کو پلاسٹک میں لپیٹ کر اطمینان سے سو جائیں۔

کولیسٹرول ہیئر ٹریٹمنٹ

انڈے کی زردی آپ کے بالوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ دو انڈوں کی زردیوں کو یکجا کر لیں۔ اس میں آدھا چائے کا چمچہ شیمپو اور ایک کپ ہلکا سا گرم پانی ملا کر اسے پھینٹ لیں۔ اس کو اپنے گیلے بالوں میں لگائیں اور مساج کریں تاکہ یہ بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے۔ پانچ منٹ لگا رہنے کے بعد بالوں کو پانی سے دھو لیں۔

بالوں کی غذا کا خیال رکھیں

ذیل میں چند غذائی مشورے دیے جا رہے ہیں جو آپ کے بالوں کی نشوونما اور صحت کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

بالوں کو کس قسم کی غذا دینی چاہیے؟

بال پروٹین سے بنتے ہیں، اس لیے آپ کی غذا میں گردہ، کلیجی، مچھلی، انڈے، چکن، بچھڑے کا گوشت یا کم چکنائی والا دودھ اور پنیر ضرور شامل ہونے چاہئیں۔

بالوں کے لیے وٹامنز

☆ بی کمپلیکس وٹامنز نہ صرف بالوں کی لٹوں کو مضبوط بناتے ہیں بلکہ بالوں کی نشوونما میں بھی مدد دیتے ہیں۔ روزانہ بی کمپلیکس کا ایک کیپسول آپ کے لیے کافی ہوگا۔

☆ سر کے بالوں کی جلد میں دوران خون کو بڑھانے میں جو وٹامن اہم کردار ادا کرتا ہے وٹامن ای

ہے۔ روزانہ سو یونٹ سے آغاز کیجیے اور چار سو یونٹس تک پہنچ جائیے۔ مغزیات اور اناج میں وٹامن ای وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔

نوٹ: اگر آپ کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہے یا دوران خون کا کوئی مسئلہ درپیش ہے تو ڈاکٹر کی منظوری کے بغیر وٹامن ای مت لیں۔ بلکہ کوئی بھی وٹامن ڈاکٹر سے مشورے کے بغیر نہ لیں۔

☆ وٹامن سی بالوں کے لیے اہم ٹشوز کی تعمیر نو میں مدد دیتا ہے اور دوران خون کو اچھی حالت میں رکھنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے (دوران خون اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ خون میں آپ کے سر کی جلد کی غذائیت شامل ہوتی ہے۔) ذہنی دباؤ، تمباکو نوشی اور اسپرین، وٹامن سی کے دشمن ہیں۔ سو ملی گرام یومیہ وٹامن سی (نصف مقدار صبح اور نصف مقدار رات کو) بالوں کے لیے ایک اچھی خوراک تصور کی جاتی ہے۔

بالوں کے لیے معدنیات

بالوں کے لیے آئرن ضروری ہے لیکن اسے اپنے لیے خود سے تجویز نہ کریں۔ ڈاکٹر سے مشورہ ضرور لیں۔

☆ اگر آپ کے بال کمزور ہیں اور گرنے لگے ہیں تو آپ کو زنک (جست) مدد دے سکتا ہے۔ پالک، مچھلی اور سورج مکھی کے بیج میں ہوتا ہے۔

☆ کاپر (تانبا) گرتے بالوں سے جنگ کرتا ہے۔ یہ مغزیات اور کشمش میں پایا جاتا ہے۔

بالوں کی صحت کا ٹیسٹ

اپنی پیشانی کے اوپر سے کوئی بھی ایک بال توڑ لیں اور اسے دھیمے طریقے سے کھینچنا شروع کریں۔ اگر آپ کا بال صحت مند ہے تو اپنی نارمل لمبائی سے بیس تا پچیس فیصد کھنچنا چاہیے اور پھر اچھل کر اپنی اصل لمبائی میں آجانا چاہیے۔ خشک اور نقصان زدہ بال مطلوبہ لمبائی میں کھینچنے سے قبل ہی ٹوٹ جائے گا۔

ورزش

پسینہ اور بال

اگر آپ پسینہ بہانے کے لیے کوئی ورزش کر رہی ہیں جیسے دوڑنا یا ٹینس کھیلنا تو اپنے بالوں میں [illegible] مدد سے کنڈیشنر لگائیں۔ بالوں کو کسی ٹوپی وغیرہ سے ڈھانپ لیں، آپ کی کھوپڑی کی گرمی اور پسینہ [illegible] کنڈیشنر فعال ہو جائے گا اور آپ کو تیس سے ساٹھ منٹ کی گہری آر پار ہونے والی کنڈیشننگ فراہم کرے گا، ورزش مکمل ہوتے ہی شیمپو کر لیں۔

آپ کے سر کی جلد سے خارج ہونے والے پسینے میں نمک ہوتا ہے جو کہ خشکی کرتا ہے لہٰذا اگر آپ بالوں کو کنڈیشن نہ کریں تب بھی ورزش کے بعد شیمپو بے حد ضروری ہے۔

برش کس طرح کرنا چاہیے

☆ الجھے ہوئے خشک بالوں کو سلجھانے کے لیے پہلے کنگھا استعمال کیجیے۔

☆ یہ یقین دہانی کر لیجیے کہ آپ کے برش کے دندانے آپ کے سر کی جلد سے ٹکرائیں گے۔ برش کرنے کا مقصد آپ کے سر کی جلد پر موجود تیل کو بالوں کی لٹوں میں آخری سرے تک پہنچانا ہوتا ہے۔

☆ اگر آپ کے بال چکنے نہیں بلکہ خشک ہیں تو آپ کو اپنے بالوں میں بار بار برش کرنا چاہیے لیکن کسی بھی صورت میں پندرہ سے پچاس مرتبہ تک برش کرنا کافی ہوتا ہے۔

☆ جب آپ برش کریں تو کمر کو آگے کی سمت جھکالیں تاکہ بال آپ کی آنکھوں پر آگے کی جانب آجائیں۔ یہ میل نکالنے اور بالوں میں تیل تقسیم کرنے کے لیے سب سے زیادہ تسلی بخش پوزیشن ہے۔

☆ برش کے ذریعے بالوں کو بھرپور تاثر دینے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اوپر بتائی گئی جھکی ہوئی پوزیشن میں گردن کے پچھلے حصے سے آغاز کیجیے اور بالوں کی جڑوں سے آخری سرے تک برش کیجیے۔ پھر اپنے سر کو پیچھے جھٹک کر بالوں کو ان کی صحیح پوزیشن میں لے۔

☆☆